اسلام

شدت پسندی کے بغیر

مصطفیٰ اکیول

ترجمہ: پروفیسر مقبول الٰہی

MashalBooks.org

فہرست

فرہنگ الفاظ 9

تعارف۔ کوئی بھی چیز وہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے 29

اس بات کو سمجھنا کہ ''اسلام کس قدر سخت گیر ہے'' 34

اس بات کو سمجھنا کہ ''غیر اسلام'' کس قدر ظالم ہو سکتا ہے 37

حصہ اوّل

آغاز

باب1۔ قبائل کی طرف آنے والی روشنی 47

باب2۔ مشرق کی خرد افروزی 67

باب3۔ قرون وسطیٰ کی تصورات کی جنگ (I) 83

باب4۔ قرونِ وسطیٰ کی نظریات کی جنگ (II) 99

باب5۔ برفانی تودے کے نیچے صحرا 119

حصہ دوم

دور جدید

باب6۔ عثمانی نشاۃ ثانیہ 139

باب7۔ رومن، ہیروڈین، اور زیلٹس 173

باب8۔ اسلامی آزادی پسندی کی طرف ترکی پیش رفت 197

حصہ سوم

آزادی پسندی کے راستے پر نشاناتِ راہ

باب9۔ ریاست سے آزادی 239

باب10۔ گناہ کرنے کی آزادی 255

باب11۔ اسلام سے آزادی 267

اظہار تشکر 293

نوٹس 295

MashalBooks.org

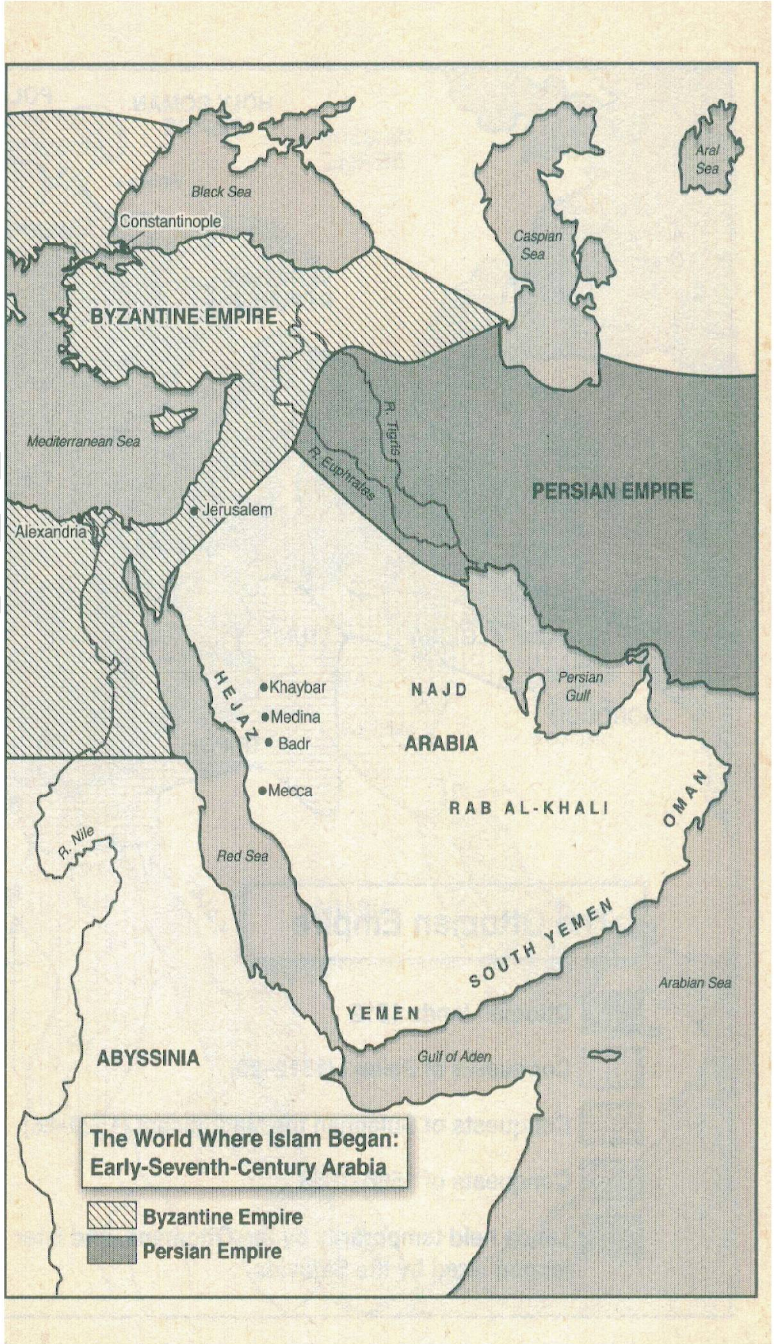
Black Sea
Constantinople
Aral Sea
Caspian Sea
BYZANTINE EMPIRE
Mediterranean Sea
R. Tigris
R. Euphrates
PERSIAN EMPIRE
Jerusalem
Alexandria
HEJAZ
Khaybar
Medina
Badr
Mecca
NAJD
ARABIA
Persian Gulf
RAB AL-KHALI
OMAN
R. Nile
Red Sea
SOUTH YEMEN
YEMEN
Arabian Sea
Gulf of Aden
ABYSSINIA
The World Where Islam Began: Early-Seventh-Century Arabia
Byzantine Empire
Persian Empire

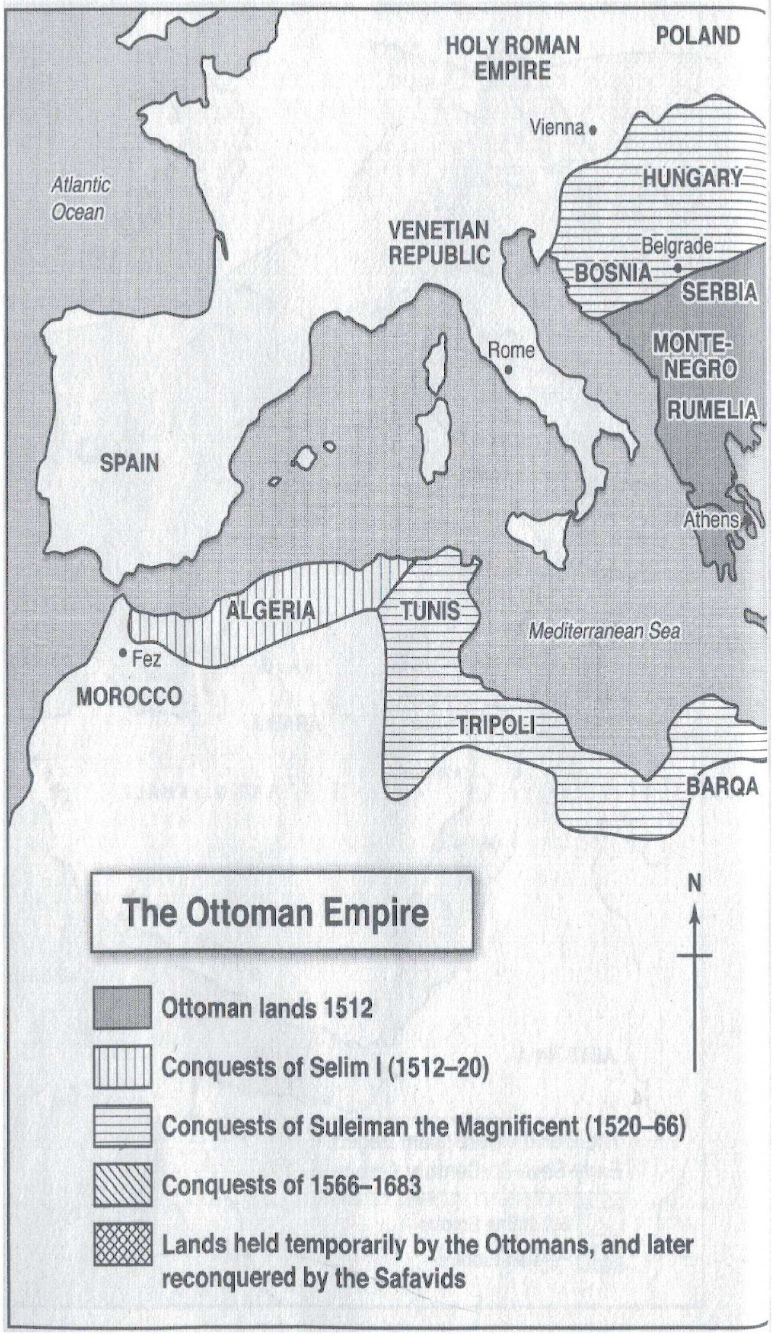
HOLY ROMAN EMPIRE
POLAND
Vienna
HUNGARY
Atlantic Ocean
VENETIAN REPUBLIC
Belgrade
BOSNIA
SERBIA
MONTE-NEGRO
Rome
RUMELIA
SPAIN
Athens
ALGERIA
TUNIS
Mediterranean Sea
Fez
MOROCCO
TRIPOLI
BARQA
The Ottoman Empire
N
Ottoman lands 1512
Conquests of Selim I (1512–20)
Conquests of Suleiman the Magnificent (1520–66)
Conquests of 1566–1683
Lands held temporarily by the Ottomans, and later reconquered by the Safavids

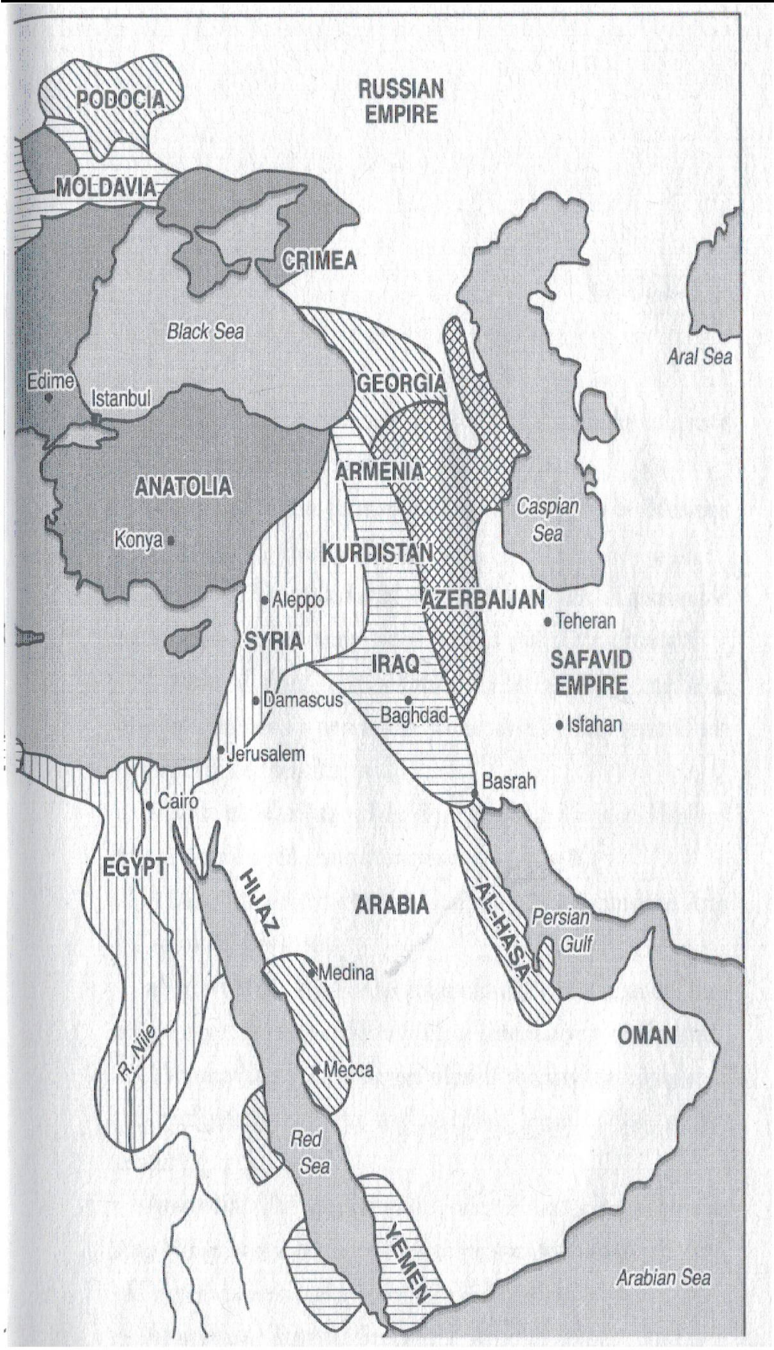

MashalBooks

فرہنگِ الفاظ

عباسی

اسلامی حکمران خاندان، جس کا تختِ خلافت پر قبضہ 750 سے لے کر 1258 تک رہا۔ اس کا دار الخلافہ بغداد تھا۔

دارالاسلام

وہ علاقے جہاں شریعت (اسلامی قانون) کی رو سے حکومت کی جاتی تھی۔

دارالعہد یا دارالصلح

وہ علاقے جو اُن غیر مسلموں کے ماتحت تھے جو کسی مسلم ریاست کے ساتھ معاہدے طے کرتے تھے۔

دارالابتلا

یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مسلمان علماء کی طرف سے دُنیا کو بیان کرنے کیلئے استعمال کی جاتی تھی۔ دنیا جو انسانوں کیلئے، اپنی آزادانہ مرضی استعمال کرنے کیلئے ایک آزمائشی میدان ہے۔

دارالحرب

وہ علاقے جن پر غیر مسلموں کی حکومت تھی، جنہیں دشمن کی سرزمینِ خیال کیا جاتا ہے۔

اللہ

خُدا کیلئے عربی لفظ، جو مسلمانوں کے علاوہ عربی بولنے والے عیسائیوں کی طرف سے بھی بولا جاتا ہے۔

الماتریدی

دسویں صدی کا، الٰہیات کے ایک مکتبِ فکر کا بانی، جو عقلیت اور آزادئ رائے کے بارے میں کھلا ذہن رکھتا تھا۔ یہ اشعریت کا ایک متبادل ہے۔

المہاودین

ایک متشدّد بربر مسلمانوں کا حکمران خاندان، جس نے بارھویں صدی میں، شمالی افریقہ اور جنوبی ہسپانیہ کے بہت بڑے حصے کو فتح کر لیا۔

اناطولیہ

ایشیا کا سب سے مغربی مقام، جسے ایشیائے کوچک بھی کہا جاتا ہے۔ اے تُرکی کے، استنبول جیسے بڑے شہروں کے مقابلے میں کم مراعات یافتہ حصوں کے حوالے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اناطولیائی شیر

وہ کامیاب اناطولیہ میں قائم کمپنیاں، جو ۱۹۸۰ کی دہائی سے اُبھری ہیں دیہ اُن دوسری اصطلاحات کے مماثل ہے جیسا کہ کیلٹیک ٹائیگرز، ایشین ٹائیگرز۔

اشعریت

الٰہیات کا ایک مکتبۂ فکر، جس کی بنیاد الاشعری نے رکھی، جو کہ عقلیت پسندی اور آزادیِ رائے کے بارے میں متشکک تھے۔

آیت اللہ

''خُدا کی نشانی'' شیعہ مذہبی پیشواؤں میں بلند ترین رُتبہ

MashalBooks.org

بنو قریظہ
ایک قدیم یہودی قبیلہ جو پیغمبر محمدؐ کے ساتھ اپنے تصادم ہونے تک عرب کے شمال میں رہتا رہا۔

باسج
اسلامی جمہوریہ ایران میں، ایک نیم فوجی رضا کار عسکری تنظیم، جو ''اخلاقیات'' نگرانی اور منحرفین کو دبانے کے سلسلے میں فعّال ہے۔

جنگِ بدر (624)
مدینہ کے مسلمانوں اور مکّہ کے کفار کے درمیان پہلا فوجی ٹکراؤ۔

جنگِ صفّین ۔(657)
اُس پہلی مسلم خانہ جنگی کا حصہ، جو دریائے فرات کے کنارے حضرت علی اور معاویہ کے حامیوں کے درمیان ہوئی۔

جنگِ خندق (627)
کفارِ مکہ کی طرف سے مدینہ کا ایک ناکام محاصرہ۔

جنگِ اُحد (625)
کفارِ مکہ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان دوسرا عسکری ٹکراؤ۔

بدّو
غالب طور پر صحرا میں رہنے والا، ایک خانہ بدوش عرب نسلی گروہ۔

بے
مردوں کیلئے ایک احترامی تُرکی خطاب

بِدعہ (بدعت)
''جدّت طرازی''۔ پیغمبر محمدؐ کی روایت سے مبینہ طور پر ایک ناقابلِ قبول انحراف۔

بُرقع
کچھ مسلم خواتین کی طرف سے اُوڑھا جانے والا ایک پوری طرح ڈھانپ لینے والا ملبوس۔

خلیفہ
سُنیوں کیلئے پیغمبر محمدؐ کا ایک ''جانشین'' اور لہٰذا مسلم اُمّہ کا قائد۔ پہلے چار خلفا، خلفائے راشدین تھے۔ خود اس ادارے کو خلافت کہا جاتا ہے۔

کمیٹی برائے اتحاد و ترقی (سی یو پی یا اتحات وے ترقی کمیٹی)
۱۸۸۹ میں نوجوان ترک تحریک (ینگ ٹرک موومنٹ) کی ایک شاخ کی طرف سے قائم کیا جانے والا ایک انقلابی گروہ: ۱۹۱۳ کے بعد اس نے سلطنتِ عثمانیہ کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

قبطی عیسائی
مصر میں ایک بڑا نسلی مذہبی گروہ۔

ذِمّی
غیر مسلم..... خصوصی طور پر، یہودی اور عیسائی ..... جنہیں اسلامی ممالک میں ''حفاظت یافتہ'' کا درجہ حاصل تھا۔

مذہبی امور کا ڈائریکٹوریٹ (دیانت اسلیری بسکان لیگی)
۱۹۲۴ء میں، عثمانی مذہبی اداروں کی جگہ لینے کیلئے جمہوریہ ترکیہ کی طرف سے قائم کیا جائے والا مذہبی ادارہ، جو کہ حنفی مکتبِ فکر پر مبنی ہے۔

عالمگیر عیسائی اتحاد کا سربراہ
قسطنطنیہ کا یونانی سربراہ، جو کہ مشرقی قدامت پسند اتحاد میں ہمہ لوگوں میں سے پہلا ہے۔

آفندی
سلطنتِ عثمانیہ میں مردوں کیلئے ایک احترامی خطاب۔

MashalBooks.org

فتویٰ
کسی مسلمان مذہبی عالم کی طرف سے جاری کی جانے والی قانونی رائے۔

فیض (ترکی ٹوپی)
تُرکی میں ۱۹۲۵ کی ''ہیٹ ریفارم'' سے پہلے عثمانی لوگوں کی طرف سے پہنی جانے والی ایک سُرخ توپی۔

فقہ
اسلامی فلسفۂ قانون جیسا کہ اسے قانون دانوں کی طرف سے پروان چڑھایا گیا۔شریعت ایک نصب العین ہے،فقہ (تُرکی میں فقیہ) اُس کا حقیقی عمل ہے۔

فرینکس (یا بعض اوقات فرانکس)
اسلامی شرق اوسط میں مغربی یورپی،جنہیں اکثر اوقات صلیبی افواج کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔(فرنگی)

گارپ سیلار
''مغرب نواز'' سابقہ سلطنت عثمانیہ کے نوجوان ترکوں کے اندر ایک خصوصی سیکولر گروپ

احادیث
''روایات،خبریں،اقوال''،اُس لٹریچر کا مجموعہ جو حضرت محمدؐ کی سنت (روایت) کے ابلاغ کا دعویٰ کرتا ہے۔

حلاخہ
یہودیت کا قانونی پہلو،جو جگادا،یا غیر قانونی مواد سے متمیز ہے۔

حنفی
اسلامی قانون کا بڑا سُنی مکتبِ فکر،جو زیادہ تر لچکدار اور نرم ہے۔

حنبلی
اسلامی قانون کا بڑا سُنی مکتبِ فکر جو زیادہ تر انتہائی متشدد ہے۔اس کی جدید شکل وہابیت ہے،جس

پر بنیادی طور پر سعودی عرب میں عمل ہوتا ہے۔

حجاز
جزیرہ نمائے عرب کا غربی۔وسطی علاقہ جس میں مکہ اور مدینہ واقع ہیں۔

ہیروڈڈیَن
ایک یہودی سیاسی فرقہ،جو ہیروڈ کے حامی تھے۔

ہجرہ
۶۲۲ میں پیغمبر محمدؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔

خوجہ (یا حوکہ)
''استاذ''،اہلِ علم کیلئے تُرکی اصطلاح،جو اکثر اوقات مذہبی لیکن بعض اوقات غیر مذہبی بھی ہوتے ہیں۔

حُرّیہ
''آزادی'' یا ''حُرّیت'' (ترکی میں حرّیت)

اجتہاد
''جدّ وجہد'' ''سچائی کی تلاش'' اسلامی قانون کی تعبیر میں آزادانہ دلائل دینا۔

امام
سُنی اسلام مین نماز کا قائد،جو عموماً ایک سرکاری یا رسمی منصب پر ہوتا ہے۔شیعیت میں وہ پیغمبر کے جانشین کے طور پر زیادہ نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

آزادی کے ٹریبونل
وہ ثالثی عدالتیں جو تُرکی کی مصطفیٰ کمال کی حکومت نے سیاسی مخالفوں کا قلع قمع کرنے کیلئے قائم کیں۔

MashalBooks.org

دانش پسندی (یا عقلیت پسندی)

الٰہیات میں، یہ تصوّر کہ خُدا عاقِل ہے اور یہ کہ اُس کے قوانین کو انسانی عقل سے (کم از کم جزوی طور پر) سمجھا جاسکتا ہے۔

اقطاع

کسی مصاحب کی طرف سے فوجی یا انتظامی خدمات کے صلے میں بادشاہ کی طرف سے عطا کی جائے والی اراضی۔

فرمانِ اصلاحات

۱۸۵۶ کا عثمانی ''اصلاح'' کا اعلامیہ، جس نے تمام مذاہب کے شہریوں کیلئے قانونی مساوات قائم کی۔

ملائشیا کی اسلامی جماعت (پی اے ایس)

ایک سیاسی جماعت جس کا ہدف ملائشیا کی تعمیر ایک اسلامی قانون پر مبنی ملک کے طور پر کرنا ہے۔

اسلام پسندی

ایک جدید سیاسی نظریہ جو ایک ''اسلامی ریاست'' کا نقشہ پیش کرتا ہے، جو بطور مذہب اسلام سے لیکن ساتھ ہی ساتھ سوشلزم اور نیشنلزم جیسے نظریات سے بھی استفادہ کرتا ہے۔

استحسان

عوامی بہبود کی خاطر ''قانونی ترجیح'' ایک طریقہ جو اسلامی فقہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جبریہ

''جبر کے حامی'': ایک اسلامی ابتدائی مکتب فکر جو آزاد مرضی سے انکار کرتا تھا اور قضائے الٰہی کا پرچار کرتا تھا۔

جدیدیت

لفظ جدید (نیا) سے مشتق، جو کہ روس میں اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل

میں تجدیدِ اسلام کی ایک تحریک تھی، جو کہ رجعت پسندانہ قدامت پرستی کے تقابل میں تھی۔

جاہلیہ

''جہالت'': مسلمانوں کی ایک اصطلاح، جو عرب میں قبل اسلام کے دور کو بیان کرتی ہے۔

جَہمیہ

ایک ابتدائی دور کا کم معروف اسلامی فرقہ جس کے نظریات معتزلہ کے ساتھ ملتے جُلتے تھے۔

جماعت اسلامی

پاکستان میں ایک اسلام پسند سیاسی جماعت جس کی بنیاد ۱۹۴۱ میں رکھی گئی۔

جہاد

خُدا کیلئے ''جدوجہد'': لازمی طور پر نہیں، لیکن اکثر اوقات، اسلام اور مسلم قومیت کو بڑھاوا دینے کیلئے یا اُس کے دفاع کیلئے عسکری جدّ وجہد۔

جہادیّت

وہ انتہاپسند اسلامی تحریک جو عسکری جہاد پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے، اکثر اوقات دہشت گردی کے ذریعے

کعبہ

لفظی معنیٰ ''مکعب'': مکہ میں مکعب شکل کی سب سے بڑی عبادت گاہ، جس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ ابراہیم (علیہ السلام) اور اس کے بیٹے اسماعیلؑ کے ہاتھوں دنیا کے سب سے پہلے توحیدی معبد کے طور پر تعمیر کیا گیا۔

قاضی

مسلم ممالک میں مذہبی مُنصف یا میونسپل کمشنر (ترکی میں کافی)

قانون

سلطنت عثمانیہ میں سُلطانی قانون جو اسلامی قانون کی تکمیل یا بعض اوقات اُس کی جگہ لینے کیلئے

MashalBooks.org

استعمال کیا جاتا تھا۔

کیرائیٹ

ایک یہودی فرقہ جوصرف تورات کومذہبی قانون کےطور پر مانتا ہےاورتالمودکومسترد کرتا ہے۔

کمال اِزم

ایک سیاسی نظریہ......جومصطفیٰ کمال اتاترک اور اُس کے پیروکاروں کی طرف سے وضع کیا گیا ......جوقوم پرستی، سیکولرازم اور''انتظامی مرکزیت''پرتوجہ مرکوز کرتا ہے۔

کمالی انقلاب

تُرکی میں ۱۹۲۵اور۱۹۵۰کے درمیان، مصطفیٰ کمال اتاتُرک اوراُس کے پیرکاروں کے زیرِحکومت سیاستی اورثقافتی انقلاب

خارجی

''منحرفین''،اوائلِ اسلام میں ایک عسکریت پسندفرقہ، جوباقی تمام مسلمانوں کی مذّمت کرتا تھااور اُن کے خلاف جنگ کرتا تھا۔آج تک اُن کی ایک معتدل شکل باقی ہے،اور یہ بہت معمولی تعداد میں ہے۔

تحریکِ خلافت

برطانوی حکومت کومتاثر کرنے،اور پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں عثمانی خلافت کو بچانے کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے ایک سیاسی مُہم۔

کُفر

''مذہب کی بےحُرمتی''یا''عدم اعتقاد''۔وہ شخص جوکفر میں ہو''کافر''یا غیرمومن کہلاتا ہے۔ اصطلاح کےلفظی معنی ہیں''ڈھانپ کرچھپادینا''لہٰذا کافر، وہ شخص ہوتا ہے جوحق کو چھپاتا ہے اگرچہ اس نے اسے دیکھ لیا ہوتا ہے۔

لیک لِک

جمہوریہ تُرکی کا خودساختہ سرکاری سیکولرازم جوفرانسیسی لفظLaicite سے ماخوذ ہے۔

مدرسہ

عربی میں''سکول''کامتبادل زیادہ عمومی طور پر، مسلمانوں کی تدریسی کی جگہ

مہدی

مسلمانوں کی مسیحائی شخصیت جس کے بارے میں''آخری وقتوں''میں واپسی کی اُمید کی جاتی ہے۔جوسُنی عقیدے کی نسبت شیعی اصولِ شریعت میں زیادہ اہم ہے۔

مالکی

سُنی اسلام میں چارفقہوں میں سے ایک

مکہ

اسلام کامقدس ترین شہر، جہاں کعبہ واقعہ ہے جوکہ مسلمانوں کی زیارت کامرکز ہے۔

مجلّہ (مجلّہ احکامِ عدلیہ)

اُنیسویں صدی کےاواخراوربیسویں صدی کےاوائل میں سلطنتِ عثمانیہ میں دیوانی ضابطہ۔ یہ حنفی فقہی روایت پرمبنی تھالیکن اس میں بہت سی تبدیلیاں بھی شامل تھیں۔

مدینہ

اسلام کادوسرامقدّس ترین شہر، جہاں پیغمبر محمدؐ کاروضہ مبارک واقع ہے۔

محِنہ

''آزمائش'': خصوصی طور پرنوویں صدی کےاوائل میں۔عباسی خلیفہ المامون کی طرف سے قائم کی گئی مذہبی عدالت۔

MashalBooks.org

مِلی گوروس

''قومی نقطۂ نظر''، ترکی کی سب سے بڑی سیاسی اسلام پسند تحریک، جس کی بنیاد ۱۹۶۰ کی دہائی کے اواخر میں رکھی گئی: اس کی شکلیں تبدیل ہو کر مختلف سیاسی جماعتوں میں منقسم ہوگئی ہیں۔

مُفتی

اسلامی قانون کا متخصص، جو فتویٰ یا قانونی رائے جاری کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

حضرت محمدؐ

پیغمبر اسلام جن پر قرآن کی وحی کا نزول ہوا۔ عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ ( ) سے منسوب مافوق البشر خصوصیات کے برعکس، قرآن کے مطابق حضرت محمدؐ سے کوئی مافوق البشر خصوصیات منسوب نہیں ہیں۔ البتہ بعد میں مسلم روایات نے آپ کے ساتھ کچھ مافوق البشر امور منسوب کر دیتے۔

مُجاہد

وہ شخص جو جہاد، یا اللہ کیلئے مقدّس جدّ وجہد میں شریک ہوتا ہے۔

مُلّا

ایک ایسا مسلم مذہبی پیشوا، جو اسلامی دینیات اور مقدّس قانون میں تربیت یافتہ ہوتا ہے۔

مُرجئین

''ملتوی کرنے والے'': اوائل اسلام میں الٰہیات کا ایک مکتبِ فکر جس نے یہ کہہ کر کثرتیت کو پروان چڑھایا کہ الٰہیاتی تنازعات کو اگلی زندگی پر ''ملتوی'' کر دینا چاہئے کہ اُن کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرے گا۔

مُوسیاد

ترکی کی آزاد صنعت کاروں اور کاروباری لوگوں کی انجمن، جس کی بنیاد ۱۹۹۰ میں قدامت پرست مسلمان کاروباری لوگوں نے رکھی۔

مسلم

''وہ جو سرِ تسلیم خم کرتا ہے'' اور اس بات کی شہادت دے کر اسلام سے منسلک ہوجاتا ہے، ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے پیغمبر ہیں''

مسلم اخوت (اخوان المسلمین)

دُنیا کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا اسلام پسند سیاسی گروہ، جس کی بنیاد مصر میں ۱۹۲۸ء میں ایک اسکول کے استاد حسن البنا کے ہاتھوں رکھی گئی۔

مطوّعین

''رضاکار'' (واحد مطوّع): سعودی عرب میں حکومت کی طرف سے منظور شدہ مذہبی پولیس کے لئے کبھی کبھی استعمال ہونے والی اصطلاح۔

مُعتزلہ

اوائلِ اسلام کے دینیات کے ایک ایسے مکتبِ فکر کے پیروکار، جو آزادیِ رائے کا دفاع کرتا تھا اور حقیقت کی تلاش میں عقل اور ساتھ ہی ساتھ وحی کے جائز کردار پر زور دیتا تھا۔ اسلام کی تیسری صدی کے بعد اُن کی رُکنیت زوال پذیر ہوگئی، لیکن اُن کے فلسفے کے آثار باقی رہ گئے، زیادہ نمایاں طور پر حنفی اور ماتریدی مکاتبِ فکر میں۔

نقشبندی

تصوّف میں ایک بڑے روحانی سلسلے (طریقت) کے ارکان۔

نیشنل ایکشن لیگ

شام میں قائم ایک بین العرب تحریک جو ۱۹۳۲ اور ۱۹۴۰ کے درمیان فعّال تھی۔

نظامِ جدید

''نیا نظام'': اٹھارویں صدی کے اواخر میں سلطان سلیم سوم کے تحت عثمانی اصلاحات کا ایک سلسلہ۔

MashalBooks.org

نظامیہ عدالتیں

سیکولر ''ضابطے'' کی عدالتیں، جن کا آغاز ۱۸۶۹ء میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے کیا گیا۔

نُور تحریک

بیسویں صدی کے ترکی میں سید نُورسی کی تحریروں سے اثر پذیر ہو کر شروع کی گئی ایک مقبول سماجی اسلامی تحریک۔ اس کے ارکان کو نور رُوس کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم (OIC)

۱۹۶۹ء میں قائم کی گئی دُنیا بھر کے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کیلئے ایک بین الاقوامی تنظیم ستاون مسلم اکثریتی ریاستیں اس کی رُکن ہیں۔

مستشرق

ایسا مغربی عالم جو مشرق کے معاشروں اور ثقافتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ یعنی مشرقِ ''قریب'' اور ''بعید'' کی۔

عثمانیت

ایک عثمانی تشخص، بلالحاظ مذہب یا نسل کے، پیدا کر کے، مساوات قائم کرنے کی، اُنیسویں صدی کی عثمانی پالیسی۔

بین الاسلامیّت

یہ تصوّر کہ پوری دُنیا کے مسلمانوں کو ایک سیاسی ڈھانچے میں متحد ہونا چاہیے۔

پاشا

سلطنت عثمانیہ میں ایک عسکری کمانڈر یا ایک ممتاز سیاسی دانشور۔

پیٹریارک

مشرقی عیسائی فرقوں میں روحانی اور سیاستی رہنما۔

وراثتیت

حکمرانی کی وہ شکل جس میں تمام اقتدار براہِ راست ایک مطلق العنان رہنما کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔

اصحاب دانش (اہل الرّائے)

ابتدائی اسلامی فقہی اور الہیاتی مکتبِ فکر، جو قرآن کے بعد دانش پر دوسرے ذریعے کے طور پر اعتماد کرتے تھے اور احادیث کے استناد پر تشکیک کا اظہار کرتے تھے۔ یہ اصحابِ روایت کی مخالفت کرتے تھے۔

اہل الکتاب

کسی منزّل من اللہ صحیفے کے حامل غیر مسلم مذہبی گروہوں کے لئے قرآن اصطلاح: خصوصی طور پر یہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اہل الحدیث

ابتدائی اسلامی فقہی مکتب فکر، جو پیغمبر ﷺ کی احادیث کو عقل کے متبادل کے طور پر مانتے تھے، وہ اصحاب الرائے سے اختلاف کرتے تھے۔

فریسی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں قدامت پرست یہودی، جو یہودی قانون کے ساتھ سختی سے تمسک اور یونانیّت کے ردّ کی تبلیغ کرتے تھے۔

پروگریسور پبلکن پارٹی (پی آر پی یا ترقی پرور جمہوریت فرکاسی)

ایک آزاد خیال سیاسی جماعت، جس کی بنیاد ی ۱۹۲۴ء میں جمہوریہ ترکی میں رکھی گئی اور چھ ماہ بعد ہی حکومت کی طرف سے بند کر دی گئی۔

قدریہ (یا قدری)

اسلام کی ابتدائی الہیّات کا ایک مکتب فکر، جس کے ارکان آزاد رائے کا دفاع، اور حکمران اُمیہ

MashalBooks.org

خاندان کے سیاسی جبر کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ معتزلہ کے پیشرو تھے۔

قدیمیّت

لفظ قدیم (پُرانا) سے مشتق، ایک تحریک جس نے اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں روس میں اسلامی روایت پسندی کو فروغ دیا، خاص طور پر اصلاح پسند جدیدیت کے بالمقابل۔

قیاس

''تمثیلی دلالت''، ایک طریقہ جو اسلامی فقہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن

لفظی معنی ''پڑھنا'': مسلمانوں کی مذہبی کتاب جو حضرت محمدؐ پر تیئیس سال کے عرصے میں جُزواً جُزواً نازل ہوئی۔

ربّانی

قرونِ وسطیٰ کی یہودی روایت جو زبانی قانون (تالمود) کی سند کو مانتے تھے، بخلاف کَرائیوں کے، جو صرف مقدّس کتاب (تورات) کو اہمیت دیتے تھے۔

رمضان

اسلامی قمری کیلنڈر کا مقدس مہینہ، جس کے دوران مسلمان سحر سے غروب آفتاب تک روزہ رکھتے ہیں۔

ریبلکن پیپلز پارٹی (آر پی پی یا سی ایچ پی، حالکِ فرکاسی)

وہ سیاسی جماعت، جس کی بنیاد ۱۹۲۳ میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے رکھی، جس نے تمام سیاسی ضربِ اختلاف کا خاتمہ کرتے ہوئے ''یک جماعتی حکومت'' قائم کی۔

ربوا

''زائد، اضافہ''، ایک مالیاتی عمل جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے۔ اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ یہ سود کی طرف اشارہ کرتا ہے: آیا یہ منافع وصول کرنے پر بھی لاگو ہوتا ہے یا نہیں، ابھی تک زیرِ بحث چلا آرہا ہے۔

خلفائے راشدین

ایک ایسی اصطلاح جو سُنی مسلمانوں کی طرف سے رسول پاکؐ کے پہلے چار جانشینوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔ شیعہ صرف چوتھے خلیفہ حضرت علی کا احترام کرتے ہیں۔

صدّوسی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ممتاز یہودیوں کی ایک جماعت، جو روم کے ساتھ تعاون کرنے اور یونانیت کو اپنی زندگیوں میں شامل کرنے پر آمادہ تھے۔

صحیح

لفظی معنی ''مضبوط'': وہ احادیث جنہیں پیغمبر محمدؐ کی طرف سے مستند خبریں سمجھا جاتا ہے۔

سلفی

ایک ایسا مسلم فرد یا تحریک، جو سلف کے طور طریقوں کی طرف واپسی کا خواہشمند ہو۔ سلف جو کہ خُدا پرست آباؤ اجداد تھے یا اسلام کی ابتدائی نسلیں تھیں۔ اگرچہ اُنیسویں صدی کے کچھ سلفی جدّت پسند تھے، لیکن یہ تحریک روز بروز بنیاد پرست بنتی چلی گئی۔

ساراسین (شرقیین)

صلیبی جنگوں کے دور میں استعمال ہونے والی یورپیوں کی اصطلاح، جو عربوں اور بلکہ تمام مسلمانوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔

سعودی

وسط اٹھارویں صدی سے ''سعود سے متعلق''، ایک حکمران خاندان جس نے وسطی عرب میں سلسلہ وار ریاستوں کی بنیاد رکھی اور اُن پر حکومت کی۔

شیخ الاسلام

سلطنتِ عثمانیہ میں سب سے بڑا مذہبی پیشوا جو انتظامیہ کی شریعت کے مطابق رہنمائی کرنے کا ذمہ دار تھا۔

MashalBooks.org

شافعی
ایک بڑا قانون کا سُنی مکتبِ فکر، جو اکثر اوقات حنفیوں سے زیادہ قدامت پسند ہوتا ہے۔

شریعہ
علما کی طرف سے پروان چڑھایا گیا اسلامی قانون: جو قرآن اور احادیث پر مبنی ہے۔

شریف
''معزز، بلند'': وہ اعزازی خطاب جو پیغمبر محمدؐ کی آل کو دیا جاتا ہے۔

شیعہ
حضرت علیؓ کے پیروکار، جو اُنہیں پیغمبر محمدؐ کا سچا جانشین سمجھتے ہیں، اور اُن کی نسبی سلسلے کے خُدا کی طرف سے القا کی گئی دانش پر یقین رکھتے ہیں۔ تمام مسلمانوں میں سے تقریباً پندرہ فیصد شیعہ ہیں۔

شوریٰ
باہمی مشاورت کا قرآنی اصول

سکاری
''خنجر بردار'': یہودی زیلٹس (ایک قدیم یہودی فرقہ کے ارکان جو دُنیا بھر میں یہودی مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے) کا ایک انتہا پسند دھڑا، جو رومی سرکاری اہلکاروں کو اور اُن کے معاونین کو، چھپے ہوئے خنجر جنہیں سکائی کہا جاتا تھا، استعمال کر کے قتل کرتا تھا۔

سولا سکرپچورا
''صرف مقدّس کتاب کے ذریعے'': یہ پروٹسٹنٹ عقیدہ کہ، نجات کیلئے ضروری تمام علم مقدّس کتاب میں موجود ہے۔

تصوّف
اسلام کا داخلی متصوفانہ رُخ، جس کا ہدف مسلم افراد کی خُدا شناسی کو پروان چڑھانا ہے۔

سُنّہ
مسلمانوں کیلئے پیغمبر محمدؐ کی مثال جیسا کہ یہ احادیث میں محفوظ کی گئی ہے۔

سُنی
اسلام کی سب سے بڑی شاخ، جو پیغمبر کی سنت (روایت) اور ساتھ ہی ساتھ قرآن پر بطور منبع اعتقا پر زور دیتی ہے تمام مسلمانوں کا تقریباً ۸۵ فیصد سنی ہے۔

طالبان
لفظی معنیٰ ''طلبہ'': ایک انقلابی سُنی اسلامی سیاسی تحریک جس نے ۱۹۹۶ء سے لے کر ۲۰۰۱ تک افغانستان پر حکومت کی۔

فرمانِ تنظیمات (گول ہانے ہٹ ای شریفی)
سلطنت عثمانیہ کا ۱۸۳۹ کا ''تنظیمِ نو'' کا اعلامیہ، جس نے ایک وسیع جدیدیت کے دور کا آغاز کیا۔

طریقت
لفظی معنیٰ ''راستہ، جادہ'': صوفی روایت کے اندر ایک اسلامی مذہبی سلسلہ۔

تاویل
قرآن اور دوسرے مذہبی متون کی تمثیلی تعبیر، بمقابلہ لفظی تعبیر کے۔

تُوسیاد
تُرک صنعت کاروں اور کاروباری افراد کی انجمن، جو کہ ترکی میں اعلیٰ ترین کاروباری انجمن ہے، جس کی بنیاد ۱۹۷۱ میں رکھی گئی۔ ریاستہائے متحدہ میں بزنس راونڈ ٹیبل کے مماثل۔

MashalBooks.org

عُلماء

''علما'': روایتی طور پر اسلامی قانون دانوں اور ماہرین دینیات (ترکی میں علما) کا حوالہ دینے کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

اُمیہ

پہلی موروثی اسلامی خلافت: وہ حکمران خاندان جو دمشق سے حکومت کرتا تھا، ۶۶۱ سے لے کر ۷۵۰ تک، جب اُس کا تختہ عباسیوں کی طرف سے اُلٹا گیا۔

اُمّہ

مسلمان اہلِ ایمان کی عالمی برادری۔

عُرف

کسی بھی دیئے ہوئے معاشرے میں، وہ مقامی رواجات، جنہیں قرآن اور اسلامی فقہ دونوں تسلیم کرتے ہیں۔

وزیر

سلطنتِ عثمانیہ میں اعلیٰ رُتبے کا سرکاری اہلکار (ترکی میں وزیر): مستری کے مترادف

ارادیت

الہیات میں یہ تصوّر کہ خدا تعالیٰ کو ایک ایسی مطلق قوت کے طور پر بیان کیا جانا چاہیے جس کے افعال کی توجیہہ عقل کے ذریعے نہیں ہوسکتی اور نہ ہونی چاہیے: یہ عقلیت پسندی کی ضد ہے۔

وہابی

محمد عبدالوہاب کی تعلیمات پر مبنی اسلام کی سخت اور لفظی تعبیر کا پیروکار: حنبلی مکتبِ فکر کی ایک احیا شدہ شکل

وقف

مسلمانوں کی وہ مذہبی تنظیم (ترکی میں وقف) جس کے منافع جات کو خیراتی مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

نوجوان عثمانی

عثمانی دانشوروں کا ایک گروہ جن کا ظہور ۱۸۶۰ کی دہائی میں ہوا، اور اُنہوں نے ایک آزاد خیال لائحہ عمل کی وکالت کی جو اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔

نوجوان ترک

یک علمی اور سیاسی تحریک جس کا ظہور اُنیسویں صدی کے اختتام کے قریب ہوا اور یہ بتدریج عثمانی سلطنت پر چھا گئی۔ یہ سیکولر پسند اور قوم پرست تھے (خاص طور پر جب ان کا موازنہ نوجوان عثمانیوں سے کیا جائے)

زکوٰۃ

''پاک کرنا'': ایک مسلمان کا اپنی دولت کا کچھ حصہ بطور خیرات کے دینا۔ اسلام کے پانچ ستونوں میں سے ایک۔

زَیلٹس

یہودیوت کی پہلی صدی میں ایک سیاسی تحریک جو یہودیوں کو سلطنتِ روما کے خلاف اُکسانے کی کوشش کرتی تھی۔

MashalBooks.org

تعارف

کوئی بھی چیز وہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے

الپچینو، دار یکروٹ (۲۰۰۳) میں

میں نے انقرہ، ترکی کے دارالخلافہ میں، (اُس وقت) ایک متوسط خاندان کے اکلوتے بچے کے طور پر پرورش پائی۔ میرے والد ایک اخبار کے کالم نگار تھے...... وہ پیشہ جو میں بھی اختیار کرنے والا تھا...... اور میری ماں ایک پرائمری سکول کی استاد تھیں۔ وہ دونوں عقیدت مند مسلمان تھے، لیکن وہ روزمرہ زندگی میں اتنے مصروف تھے کہ اُن کے پاس مجھے مذہب کی تعلیم دینے کیلئے وقت نہیں تھا۔ لہٰذا جب میرے دادا نے، جو ایک کٹڑ مسلمان تھے، یہ تجویز پیش کی کہ وہ خُدا سے بہتر شناسائی پیدا کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں تو میرے والدین نے بخوشی اس خیال کی تائید کی۔ اُس وقت میں تقریباً آٹھ سال کا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران، گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا تھا: میرے دادا، میری یکساں طور پر نیک اور فراخدل دادی کے ساتھ، ہمارے گھر سے چند بلاک کے فاصلے پر رہتے تھے۔ لہٰذا، ہم سب نے اتفاق کیا کہ میں ہر صبح کو اپنے دادا دادی کے پاس جایا کروں اور اُن کے لذیذ ناشتے سے لطف اندوز ہونے کے بعد، اسلام میں ایک ہنگامی نصاب کی تعلیم حاصل کروں۔

اگلے دو ہفتوں میں، میرے دادا، مسلمانوں کی نماز ادا کرنے کو عملی طور پر کر کے دکھانے

کیلئے روزانہ چند گھنٹے صرف کرتے، مجھے قریبی مسجد میں لے جاتے، اور مجھے رنگ برنگے منکوں سے عربی حروف اور الفاظ بنانا سکھاتے۔ میری پہلی بڑی کامیابی مسلم عقیدے کے ستون: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ: یا ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' کو لکھنا تھی۔ میرے دادا مجھے یوسفؑ اور موسیٰؑ جیسے پیغمبروں کی کہانیاں بھی سُناتے، جبکہ میں اُنہیں بچکانہ تجسس اور نو آموز مذہبیت کے ساتھ سُنتا۔ میں حقیقتاً خُدا اور اُس مذہب کے بارے میں، جو اُس نے نازل کیا سُن کر لطف اندوز ہوتا تھا۔

ایک دن، اپنے دادا جان کی لائبریری میں، میں نے اتفاق سے ایک عبادات کی کتاب دیکھی، جس کے گرد پوش کے پیچھے تین اقوال لکھے ہوئے تھے۔ پہلے دو اقوال قرآن میں سے تھے، اور وہ اس بارے میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اور کیوں انسان کو پیدا کیا۔ ان میں سے ایک یہ آیت تھی: ''یہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کئے: تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو'' میں اس پیغام سے بہت متاثر ہوا۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ میری سماعت، بینائی، اور احساسات مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''عطا کئے گئے ہیں'' میں نے اپنے آپ سے کہا ''یقیناً مجھے اُس کا مزید شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

کتاب کے گرد پوش پر تیسرا قول، جو ایک اور ذریعے جسے احادیث (اقوال) کہا جاتا ہے، سے تھا، متاثر کُن نہیں بلکہ پریشان کُن تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''اگر تمہارے بچے دس سال کی عمر تک نماز پڑھنا شروع نہ کریں تو پھر اُنہیں مارو۔''

میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دادا...... جو کہ ایک مہربان اور رحمدل انسان تھے...... میرے ساتھ کبھی سختی سے بھی نہیں بولیں گے، چہ جائیکہ مجھے ماریں۔ لیکن میں یہاں تھا، آٹھ سال کا لڑکا، جس پر یہ انکشاف ہوا کہ میرا مذہب...... جس کے بارے میں سیکھنے سے میں کافی لطف محسوس کر رہا تھا...... والدین اور بڑے والدین کو اپنے بچوں کو اذیت دینے کی ہدایت کر رہا تھا۔ میں ہل کر رہ گیا۔

جب میں نے اپنے دادا کو اس قول کی طرف توجہ دلائی، تو اُنہوں نے مجھے مسکرا کر تسلی دی اور یقین دہانی کروائی کہ ''مارنے'' کی تجویز بگڑے ہوئے بچوں کیلئے ہے نا کہ میرے جیسے اچھے بچوں کیلئے...... اور اُنہوں نے مزید کہا کہ ایسی سزا اُن کے اپنے فائدے کیلئے ہے۔

اگرچہ مجھے اپنے دادا کے الفاظ سے کچھ تسکین ملی، لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔

MashalBooks.org

میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ، والدین سے اپنے بچوں کو نماز پر مجبور کرنے کیلئے، مارنے کا حکم کیوں دیتا ہے؟

یہ چیز نہ صرف ظالمانہ، بلکہ نامعقول بھی معلوم ہوتی تھی۔ کسی بچے کو...... یا کسی بھی شخص کو...... مذہبی عمل پر مجبور کرنا کبھی پُر اخلاص مذہب پرستی پیدا نہیں کرسکتا۔ میں نے سوچا کہ اگر آپ نماز خُدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کیلئے نہیں، بلکہ اس لئے پڑھتے ہیں کہ آپ اپنے چہرے پر تھپڑ لگنے سے بچ سکیں، تو کیا ایسی نماز بے معنی نہیں ہوگی؟

غیر آزاد لوگوں کے ممالک

میرے دادا جان کے گھر میں، اُن گرمیوں کے دنوں کو گزرے ہوئے تین دہائیاں بیت گئیں، لیکن "اگر وہ نماز نہیں پڑھتے تو اُن کو پیٹو"، والی حکمت عملی کے بارے میں میرا کھا جانے والا شک میرے ساتھ ساتھ رہا۔ میں نے جتنا زیادہ اسلامی لٹریچر اور مسلم معاشروں کا مطالعہ کیا، اُتنی ہی زیادہ میں نے اس جابرانہ ذہنی رویے کی مثالیں دیکھیں۔ اور میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا: کیا واقعی اسلام اس کا حکم دیتا ہے؟

آج یہی سوال میرے لاکھوں ہم مذہبوں کے...... اور لاکھوں دوسروں کے...... ذہنوں میں گُلبلا رہا ہے۔ کیا اسلام جبر اور دباؤ کا مذہب ہے؟ یا کیا یہ آزادی کے تصور سے لگا کھاتا ہے...... یعنی یہ کہ افراد کو اپنی زندگیوں پر پورا اختیار حاصل ہے اور وہ مذہبی لامذہب اور یا جو کچھ بھی وہ بننا چاہیں، بننے کیلئے آزاد ہیں؟

ان سوالات کے پوچھنے کی بہت سی وجوہات ہیں ہم عصر دُنیا میں اسلامی معاشرے واقعی آزادی کی مشعلیں نہیں ہیں۔ انتہائی صورتوں میں جیسا کہ سعودی عرب میں، ایک نرالا مظہر ہے جسے مطوّعین، یعنی مذہبی پولیس کہا جاتا ہے، موجود ہے، جو گلیوں میں لوگوں کی نگرانی کرتے ہیں، اور اُن روّیوں کو ٹھیک کرتے ہیں جنہیں وہ "غیر اسلامی" سمجھتے ہیں۔ اگر نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور آپ نماز کیلئے تیار نہیں ہو رہے، تو مطوّعین ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر پہنچ سکتے ہیں یہ یقین دہانی حاصل کرسکتے ہیں کہ آپ جلدی سے مسجد میں پہنچیں۔ وہ سعودی خواتین کو اپنے پورے جسم ڈھانپنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور اُنہیں جنسِ مخالف کے ساتھ دوستانہ گپ شپ سے بھی روکتے ہیں۔ سعودی

بادشاہت بھی اپنی سرحدوں کی باریک بینی سے نگرانی کرتی ہے، اور غیر اسلامی اشیا اور مطبوعات پر پابندی لگا دیتی ہے۔ دوسرے مذاہب جیسا کہ عیسائیت والوں کو لوگوں کا مذہب تبدیل کروانے کی اجازت نہیں ہے...... بلکہ یہاں تک کہ اُنہیں سلطنت کی حدود میں رہنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران جبر کی قدرے نرم تر مثالیں پیش کرتا ہے۔ وہاں عورتوں کو سعودی عرب کی نسبت بہتر درجہ دیا جاتا ہے، آزاد بحث مباحثے کیلئے عوام کیلئے کچھ گنجائش ہے، اور وہاں چند نسبتاً جمہوری ادارے موجود ہیں، جیسا کہ پارلیمنٹ۔ لیکن ایرانی معاشرہ ابھی تک آزاد ہونے سے بہت دور ہے۔ عورتوں کو ابھی تک مزعوم اسلامی لباس کے ضابطے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ خاندانوں کو اپنی چھتوں سے سیٹلائٹ ڈشوں کو لازماً ہٹانا پڑتا ہے تا کہ وہ مغربی ٹیلیویژن کا سامنا نہ کریں۔ سیاسی مخالفین کو کچل دیا جاتا ہے۔ اور حکمرانی میں حرفِ آخر ملاؤں یا مذہبی پیشواؤں کے ایک گروہ کے پاس ہے، جنہیں مفروضہ طور پر خُدا کی رہنمائی حاصل ہے...... ایک ایسا دعویٰ جس پر بھروسہ کرنا تو غالباً ممکن ہے لیکن جس کی تصدیق ناممکن ہے۔

افغانستان، جو ۱۹۹۶ سے ۲۰۰۱ تک طالبان کے زیرِ اقتدار رہا، اسلامی دُنیا میں بدترین مثال تھی، کیونکہ اس نے معمولی سے معمولی آزادیوں کو بھی دبا دیا۔ عورتوں کو نہ صرف پورے جسم کو ڈھانپ لینے والا بُرقع پہننے پر مجبور کیا گیا، بلکہ اُنہیں ہر قسم کی عوامی زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ "غیر اسلامی مسرتوں" کی تمام اقسام...... جیسا کہ موسیقی سُننے، شطرنج کھیلنے یہاں تک کہ پتنگ اُڑانے...... پر طالبان حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ اور اُن لوگوں کو جو ان کرخت قوانین کو توڑتے تھے، سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں: طالبان نے دوسرے تمام مذاہب پر پابندی لگادی اور اُن کی قدیم عبادت گاہوں اور علامات کو تباہ کر دیا، جیسا کہ بامیان میں بُدھ کے ۱۵۰۰ سال پُرانے دو مجسموں کو۔

سعودی عرب، ایران اور افغانستان انتہا پسندی کی مثالیں ہیں: بہت سے اسلامی ممالک اتنے جبر پسند نہیں ہیں...... لیکن ہر مسلم ملک ابھی تک کسی نہ کسی درجے تک "آزادی کے فقدان کا شکار ہے۔ واشنگٹن میں قائم ادارے "فریڈم ہاؤس" کے "آزادی کے اشاریے" کے مطابق، کسی ایک مسلم اکثریت والے ملک کو "مکمل آزاد" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہت سی اقوام کے ہاں مذہبی پولیس نہیں ہے، لیکن اُن کے ہاں ابھی تک آزادی کے سلسلے میں بہت سی رُکاوٹیں۔ ارتداد......

MashalBooks.org

اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا.....شدید سماجی ردِعمل یا بلکہ قانونی سزا کا باعث بن سکتا ہے...... یہاں تک کہ مغرب میں بھی کچھ مسلمانوں نے اُن لوگوں کے خلاف جو اسلام کا مذاق اُڑائے یا محض اُس پر تنقید کرتے ہیں، شدید ردِعمل کا اظہار کر کے اپنے آپ کو جبر پسند ثابت کیا ہے ......جیسا کہ پہلے پہل، مسلمان رُشدی، فلمساز تھیووان گوہ، اور ڈنمارک کے اخبار جلینڈز پوسٹن Jyllands Posten، جس نے حضرت محمدؐ کے طنزیہ کارٹون شائع کئے، کے ساتھ ہوا۔

اس بظاہر مضبوط شہادت کے پیشِ نظر، مغرب میں بہت سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام بطور مذہب کے آزادی کے غیر موافق یا مخالف ہے۔ بہت سے مغربیوں کی نگاہوں میں یہ ایک برداشت سے عادی، جبر پسند اور یہاں تک کہ تشدد پسند مذہب ہے، ورنہ، یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اسلامی معاشرے اس قدر غیر آزاد کیوں ہیں؟

اس سے پہلے کہ کوئی شخص جلدی سے یہ نتیجہ نکالے، مجھے ایک کہانی بیان کرنے دیجئے۔

اس بات کو سمجھنا کہ ''اسلام کس قدر سخت گیر ہے''

نومبر ۲۰۰۶ میں، خالد ادم، جو کہ ایک مسلمان حبشی مہاجر تھا جو اٹلانٹا میں رہ رہا تھا، کے بارے میں ایک خوفناک خبر نے امریکیوں کو چونکا دیا۔ یہ شخص خود اپنی بیٹی کو ضرب شدید پہنچانے اور ظلم کرنے کا مجرم پایا گیا۔ رپورٹ کے مطابق، جو کچھ اُس نے کیا وہ یہ تھا، کہ اس نے، باورچی خانے والی قینچی استعمال کر کے، اپنی دو سال کی بچی کے بظر کو کاٹ دیا۔ ادم کے مقدمے میں اُس کی بیوی نے اپنے شوہر کی منطق کو افسردگی سے بیان کیا: ''اس نے کہا کہ وہ اس کی دوشیزگی کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ خُدا کی مرضی ہے''(۲)

تقریباً ایک سال بعد، وارنر ٹوڈ ہسٹن نے، جو کہ ایک امریکی مبلغ تھا، اس واقعے کے بارے میں ایک مشہور ویب سائٹ پر لکھا، اور ''چھوٹی لڑکی کے خفیہ حصوں کو کاٹنے کے اس عام مسلم رواج'' کی مذمت کی۔ اُس نے اس سے ایک وسیع تر نتیجہ بھی اخذ کیا۔ اُس نے اپنے قارئین کو بتایا ''ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے، اسلام اپنے سب سے کمزور ارکان، یعنی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ سلوک کرنے کے بارے میں کس قدر وحشی ہے''(۳)

یقیناً اس صورتِ حال کے بارے میں ناقابل معافی ظلم ہوا، اور مسلمان ادم اور غیر مسلم ہسٹن، دونوں یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ اسلام کا فیصلہ ہے۔ لیکن دونوں غلط تھے کیونکہ جو کچھ آدم نے اپنی بیٹی کے ساتھ کیا وہ ایک ایسا رواج ہے...... جسے ''صنفِ نازک کے جنسی اعضا کا مُثلہ کہا جاتا ہے...... جو اسلام کی مقدّس کتاب سے نہیں، بلکہ افریقہ میں ہزاروں سال پُرانی ایک روایت سے

MashalBooks.org

آیا ہے۔ یہ ایک قدیم مفروضے پر مبنی ہے کہ عورتیں اگر جنسی اختلاط سے محظوظ ہوں گی تو وہ ''اخلاق باختہ'' ہوسکتی ہیں۔ مصر سے ملنے والی بعض مصنوعات اشارہ کرتی ہیں کہ یہ رواج اسلام، عیسائیت بلکہ محفوظ شدہ تاریخ سے بھی پہلے کا ہے۔ (۴) بدقسمتی سے، اس پر ابھی تک مصر، سوڈان اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں بڑے پیمانے پر عمل ہوتا ہے...... محض مسلمانوں کے ہاں ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کی قومیتوں میں بھی۔ ایتھوپیا میں، جس کی ۶۳ فیصد آبادی عیسائی ہے، تقریباً پانچ میں سے چار عورتوں کا کچھ دہائیاں قبل تک جنسی اعضا کا مُثلہ ہوتا تھا (۵) فطرت کی پرستش کرنے والے مظاہر پرستوں کے علاوہ، شمالی افریقہ میں ایک یہودی قبیلہ بھی اس خوفناک رواج کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ (۶)

لہٰذا، باریکی سے جائزہ لینے پر، وہ چیز جو پہلی نگاہ میں اسلام کا ایک مسئلہ نظر آتا ہے، مقامی روایت کا ایک مسئلہ ثابت ہوتی ہے...... ایک ایسی چیز جو نسل درنسل بغیر کسی اعتراض کے آگے چلتی رہتی ہے۔

کیا ہمیں اس سے کوئی اشارہ حاصل کرنا چاہیے؟

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آج کے اسلامی معاشروں میں موجود مسائل کی جڑ مذہب نہ ہو بلکہ پہلے سے موجود رواجات، رویے اور ذہنی رُجحانات ہوں؟

اور کیا یہ ممکن ہے کہ خود کچھ مسلمان بھی...... خالد آدم کی طرح کے مسلمان، جو غلط طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُس کی چھوٹی بچی کے اعضا کی قطع و بُرید ''خدا کی مرضی تھی''...... اس تفاوت سے آگاہ نہ ہوں۔

انسانی تاریخ میں کلامِ خُداوندی

مذکورہ بالا سوال کے بارے میں میرا اپنا استعجاب کا لمحہ سترہ سال کی عمر میں آیا، جب میں نے پہلے پہل پورا قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھا...... ایک ایسا کام جو، میں جانتا ہوں، بہت کم مسلمان کبھی روزمرّہ زندگی کے بارے میں کرتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن انتہائی تفصیل سے بیان کردہ ضوابط اور پابندیوں میں سے، جو میں نے بعض انتہائی قدامت پسندانہ ''اسلامی کتب'' میں پڑھی تھیں، وہاں کوئی بھی نہیں تھی۔ قرآن قابلِ غور حد تک زانیوں کی سنگساری، شرابیوں

کی سزا، اور اُن لوگوں کو قتل کرنے جو اسلام کو ترک کردیتے یا اُس کی ''توہین'' کرتے ہیں کے موضوعات پر خاموش تھا۔ نہ ہی وہاں کسی ''اسلامی ریاست''، ایک ''عالمی خلافت'' یا ''مذہبی پولیس'' کا کوئی ذکر تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ بہت سی ایسی چیزیں جنہیں میں مسلم دُنیا میں دیکھتا ہوں اور جنہیں میں بہت زیادہ خوشگوار نہیں سمجھتا، اسلام کی مقدس کتاب میں بالکل نہیں ہیں۔

ایک لحاظ سے یہ چیز غیر معمولی نہیں ہے۔ ہر مذہب کا ایک ''مغز'' ہوتا ہے، جو اکثر اوقات ایک ایسا متن ہوتا ہے جس کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ الوہی اصل رکھتا ہے۔ پھر یہ مغز تاریخ میں کھلتا ہے...... تاکہ یہ انسانوں سے سمجھا جائے، اس کی تعبیر یا غلط تعبیر کی جائے۔ جب اسلام کا الوہی مغز، قرآن، انسانی معاشرے میں داخل ہوا، تو بہت سے اضافی کلیوں اصولوں اور اعمال اور رویّوں کا اضافہ کلامِ خداوندی میں ہوگیا۔ اسلامی تاریخ کے بعض فیصلہ کُن موڑوں پر (جن کا میں اس کتاب میں جائزہ لوں گا) قرآن کی کچھ خاص تعبیرات دوسروں پر غالب آگئیں...... لازمی طور پر اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ صحیح تھیں، بلکہ اس لئے کہ وہ سیاسی یا ثقافتی طور پر زیادہ باسہولت تھیں۔

لہٰذا آج کا اسلام چودہ صدیوں کی روایت کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ کہیں زیادہ خراب بات یہ ہے کہ یہ پچھلی دو صدیوں کے اُن سیاسی بحرانوں، اور صدمات کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہے جو مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑے۔

اچھی خبر یہ ہے کہ، اسلام کی جدید تر، اور تازہ تر، انداز سے تعبیرِ نو، نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ایسے آثار بھی ہیں کہ ایسی نئی تعبیرات کے پنپنے کا امکان ہے، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، ایک آگے بڑھتی ہوئی، خاموشی سے اسلامی تجدید جاری ہے۔

لیکن، میں ترکی کی طرف بڑھنے سے پہلے، ایک اور کہانی بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

MashalBooks.org

اس بات کو سمجھنا کہ ''غیر اسلام'' کس قدر ظالم ہوسکتا ہے

جنوری ۱۹۸۱ کی ایک بہت سرد اور برفانی صبح ......میرے دادا دادی کے گھر پر ''سمر سکول'' کے چند ہی ماہ بعد......میری ماں نے مجھے بہت جلدی جگا دیا۔ عام طور پر وہ مجھے اسکول کیلئے تیار کرتی تھیں، لیکن اس دن کیلئے میرے اور اُن کے دوسرے منصوبے تھے۔ جلدی سے ناشتہ کرنے کے بعد، ہم گھر سے روانہ ہوئے اور ہم نے مامک جانے کیلئے، جو کہ انقرہ کے مضافات میں ایک مفلس آبادی تھی دو علیحدہ علیحدہ بسیں پکڑیں۔ ہماری منزل نہ تو کوئی پارک تھا نہ ہی کاروباری مرکز، بلکہ ایک خوفناک جگہ تھی: فوجی قید خانہ۔

یہ بہت سی بیرکوں کے ساتھ ایک بہت بڑی سہولت تھی، جو ساری کی ساری برقیاتی ہوئی خاردار تار سے گھری ہوئی تھی۔ بہت سے سپاہی تھے جنہوں نے مشین گنیں اُٹھائی ہوئی تھیں، جن میں سے کچھ نگرانی کے بھدّے میناروں سے منحوس انداز سے نیچے دیکھ رہے تھے۔ دیانتداری کی بات یہ ہے کہ یہ پورا منظر کسی سیاسی مخالفین کے قید خانے سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ اس قید خانے کے داخلے پر کھڑا رہنے کے بعد سپاہی، ہمیں درجن بھر دوسری ماؤں اور کچھ بچوں کے ساتھ ساتھ ایک صحن میں لے گئے، جو اس صحن کی لمبائی کی خاردار تار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم شدہ تھا، ''جنگلے کے پیچھے قطار بنائیے'' ایک سپاہی چلایا۔ ''آپ کے پاس صرف دس منٹ ہیں''

پھر میں نے مکینوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو ہماری طرف فوجی انداز سے مارچ کرتے

ہوئے آرہے تھے۔ سپاہی اُن پر بھی چلا رہے تھے: ''مارچ! بائیں، دائیں، بائیں!'' چند ثانیوں کے بعد، اس گروہ کو ایک نعرہ گنگنانے کا حکم بھی دیا گیا ''وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو کہتا ہے میں تُرک ہوں'' جو ترکی کے سیکولر بانی مصطفٰی کمال اتاترک کا ایک مشہور مقولہ تھا۔ اور پھر جب ان لوگوں نے اُس خاردار تاروالے جنگلے کے دوسری طرف قطار بنائی تو میں اُن کے سامنے آگیا......اپنے باپ کے۔

وہ چار ماہ پہلے کی نسبت، جب میں پچھلی مرتبہ اُن سے ملا تھا۔ لیکن اُن کے چہرے پر وہی کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی اور اُنہوں نے ہمیں بہت خوشی سے خوش آمدید کہا جیسا کہ مجھے دُھندلا دُھندلا یاد ہے، اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ جیل میں بہت آرام سے ہیں اور یہ کہ وہ بہت جلد گھر آجائیں گے۔ لیکن وہ اور میری ماں مجھ سے کچھ تلخ حقائق چھپا رہے تھے۔ مامک کی جیل میں بہت منظّم تشدد کیا جاتا تھا، اور زیادہ تر قیدیوں پر بشمول میرے والد کے، سزائے موت کے مستوجب جرائم، کیلئے مقدمات چلائے جارہے تھے۔

کس لئے؟ جی کسی چیز کیلئے نہیں، سوائے عوامی دانشور ہونے کے جیسا کہ میں نے کہا، میرا والد ایک کالم نگار تھا، ایک مخصوص سیاسی راہِ عمل رکھنے والا ایک کالم نگار: وہ نیشنلسٹ ایکشن پارٹی (ایم ایچ پی) اور اس سے منسلک ''نیشنلسٹ'' تحریک کا ایک رُکن تھا، بنیادی طور پر جو کہ ترکی میں کمیونزم کی بڑھتی ہوئی لہر کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا۔ لہٰذا میرے والد نے مارکسِٹ لینیسٹ نظریے کو رد کرنے ''سوویٹ سامراج'' پر تنقید کرنے کیلئے کتابیں لکھیں۔ Violence in Politics (سیاست میں تشدد) میں اُس نے تمام مستبد حکومتوں کی مذّمت کی، اور فرانسیسی، بولشویک، اور ایرانی انقلاب اور اُن کی مشابہتوں پر توجہ مرکوز کی۔ اپنے سیاسی کیمپ میں بھی اُس نے عسکریت پسندانہ رُجحانات کی مخالفت کی۔ لہٰذا بائیں بازو کے کچھ لوگ بھی، دائیں بازو میں معقولیت کی آواز کے طور پر، اُن کا احترام کرتے تھے۔

لیکن ۱۲ استمبر، ۱۹۸۰، کو ترکی فوج کی طرف سے برپا کیا جانے والا فوجی انقلاب ایسی باریکیوں سے ناآشنا تھا۔ جرنیلوں نے تمام کیمپوں سے تمام سیاستدانوں اور تمام انقلابیوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا، جن کی تعداد، اگلے تین سال میں سناٹے میں ڈال دینے والی چھ لاکھ تک پہنچنے والی تھی۔ ان قیدیوں میں سے کچھ کو کئی ماہ تک بغیر علامتی کاروائی کے بند رکھا گیا، اور چند ماہ

MashalBooks.org

بعد بغیر کسی فردِ جُرم کے رہا کر دیا گیا۔ (میرے والد کا حصہ قید میں چودہ ماہ کا تھا)۔ ہزاروں لوگوں کو ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا، جس کے دوران ۱۷۵ لوگ مر گئے اور بہت سے دوسرے اپاہج ہو گئے۔ پچاس لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ سارا عمل ایک تُرک آزاد خیال شخص کے الفاظ میں ''تشدّد کا ایک خونی کھیل تھا''(۷)

جرنیلوں نے یہ استدلال کیا کہ اُنہوں نے یہ فوجی انقلاب ''دہشت اور لاقانونیت کے اُس دور کو ختم کرنے کیلئے، برپا کیا تھا، جو ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں مارکسسٹ اور نیشنلسٹ عسکریت پسندوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ کے نتیجے میں ترکی میں پیش آیا تھا۔ یہ بات غلط نہیں تھی، لیکن وہ دہشت جو فوجی حکومت نے پھیلائی اس سے کہیں زیادہ ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں، اس نے مستقبل کی دہشت گردی کے بیج بو دیئے۔ وہ قیدی جنہوں نے دیار باقر کے بدنام فوجی قید خانے میں بدترین قسم کا تشدّد جھیلا تھا اپنی رہائی کے بعد انتقام کیلئے بے چین تھے اور اُن میں سے کچھ نے کُردستان ورکرز پارٹی (پی کے کے) کے جھنڈے تلے ایک ایسی دہشت گردانہ مبہم شروع کی جو آنے والی کئی دہائیوں تک ترکی کو نشانہ بنانے والی تھی۔

قابلِ غور بات یہ ہے، کہ یہ سارا ظلم تُرکی میں واقع ہوا، جو کہ ایک مسلم اکثریتی ملک ہے، لیکن اس کا اسلام سے تقریباً کوئی تعلق نہیں تھا۔ مارکسی اسلام کے خلاف تھے۔ اور نیشنلسٹ اگرچہ اس کا احترام کرتے تھے، لیکن اُن کا بنیادی جذبۂ محرکہ حب الوطنی تھا۔ (یہ دونوں مخالف کیمپ اسلامی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کو، جو امن پسند رہے، زنخے سمجھتے تھے) اور تمام کیمپوں میں سے سب سے زیادہ وحشی کیمپ، فوج، کسی اور کے نہیں بلکہ اتاترک کے فلسفے پر عمل کرتے تھے...... وہ سب سے بڑا سیکولرسٹ رہنما جسے آج تک مسلم دُنیا نے دیکھا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، اُس سخت سردی والے دن، جیل میں، میں نے بطور ایک مسلمان بچے کے، ظلم کا مشاہدہ اسلام کے نام پر نہیں...... جیسا کہ آج کل کچھ اہلِ مغرب فوری طور پر اندازہ لگا لیتے...... بلکہ سیکولر ریاست کے نام پر کیا۔ جب میں بڑا ہوا، تو میں نے اسی اذیت کی اور بھی مثالیں دیکھیں۔ مثلاً میں نے ''مذہبی پولیس'' کو عورتوں کو اپنے سر ڈھانپنے پر مجبور کرنے کی بجائے ''سیکولرازم کی پولیس'' کو عورتوں کو اپنے سروں کو ننگا کرنے پر مجبور کرتے ہوئے دیکھا۔

یہی وجہ ہے کہ، میں سمجھتا ہوں، جب میں نے دوسرے ملکوں میں اسلامی آمریتیں دیکھیں

......جیسا کہ ایران، سوڈان، اور افغانستان میں......تو میں نے اسلام اور آمریت میں کسی اندرونی تعلق کا گمان نہیں کیا بلکہ، میں نے یہ ادراک کیا کہ شرق اوسط کے آمریت پسند مسلمانوں اور ترکی کے سیکولرسٹ آمریت پسندوں کے ذہنی طرزِ عمل مشترک تھے، اور یہ کہ مذہب یا لامذہبیت کی بجائے یہ ذہنی طرزِ عمل ہی اصل مسئلہ ہے۔ میں نے اس بات کو بھی بہت واضح پایا کہ ایشیا میں روس اور چین جیسے غیر مسلم مما لک کو بھی اسی مسئلے نے متاثر کیا تھا۔

لہٰذا، میں نے اپنے آپ سے پوچھا، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ مسلم دُنیا کی آمرانہ ریاستیں اپنی جڑیں اسلام میں نہ رکھتی ہوں، بلکہ دُنیا کے اس حصے میں گہرائی میں گئے ہوئے سیاسی کلچروں اور سماجی ڈھانچوں میں رکھتی ہوں، جن پر اسلام صرف اوپر رکھی ہوئی ایک چیز ہے؟

دوسرے لفظوں میں، کیا ایسا ہے کہ آمریت پسند مسلمان صرف وہی آمریت پسند ہوں جو اتفاق سے مسلمان ہوں؟

مکہ سے استنبول تک

یہ وہ چند سوالات ہیں، جن کا کھوج میں اس کتاب میں لگاؤں گا، جبکہ میں اسلام کی ایک زیادہ آزاد خیال تفہیم بھی پیش کروں گا......ایک طویل استدلال میں جو تین بڑے حصوں میں تقسیم ہوگا۔

حصہ اوّل میں، میں اس مذہب کی تکوین میں جاؤں گا، اور یہ دکھاؤں گا کہ اس کے توحید کے مرکزی پیغام نے کس طرح ......اس کے ایسے مفاہیم کے ساتھ جیسا کہ فرد کی خُدا کے سامنے جوابدہی ...... نے عربوں اور پھر پورے شرقِ اوسط کی اہم طریقوں سے کایا پلٹ دی۔ ہم دیکھیں گے اسلام کی اُن اوّلین صدیوں میں کس طرح عقلیت پسند اور بلکہ آزاد خیال تصوّرات اُبھرے، اور پھر طویل مدّت میں محقق کیوں پیدا نہ ہو سکے۔ ہم قرآن کے ابدی پیغام اور اس کی زمانی تعبیرات کے مابین امتیاز کا بھی جائزہ لیں گے، اور اس میں حضرت محمدؐ کے بعد سیاسی اور عسکری اقدامات کو بھی شامل کریں گے۔

حصہ دوم زیادہ جدید تاریخ کے جائزے کے ساتھ متعلق ہے۔ سب سے پہلے ایک باب سلطنت عثمانیہ پر ہے جو کہ سولھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک مسلمانوں کی اعلیٰ ترین قوت تھی۔ میں اس بات پر خصوصی طور پر توجہ مرکوز کروں گا کہ ممتاز عثمانی طبقے نے کس طرح مغرب

MashalBooks.org

سے آزادانہ خیالات اور ادارے مستعار لئے، اور اہم ترین بات یہ کہ، اُنہیں اسلام کے ساتھ ہم آہنگ گیا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے، جو مغرب اور مشرق دونوں میں بھلا دی گئی ہے، لیکن یہ دونوں کیلئے بہت اہم ہے۔

پھر ہم بیسویں صدی کی بے قاعدگی کا جائزہ لیں گے، جس نے ہمیں یہاں تک کہ اسلام کے نام پر جبر، عسکریت پسندی اور دہشت گردی بھی دی جسے اسلام پسندی کا نام دیا گیا جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ جدید نظریہ، جو چودہ صدی قبل کے اُس مذہب سے مختلف ہے جس سے یہ منسوب ہے نا صرف یہ کہ اپنے آپ میں بالکل گمراہ شدہ ہے، بلکہ اسے اپنے دشمنوں، بشمول مغرب کے ہاتھوں بھی بہت زیادہ غلط استعمال کیا گیا ہے۔

حصہ دوم کا آخری باب جدید دور کے تُرکی پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ میں اس کہانی کا حصہ ہوں، اور اس طرح اس سے اچھی طرح سے واقف ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ ترکی کی استثنائی کہانی، جس پر مغرب میں بڑے پیمانے پر توجہ نہیں دی گئی، اسلام اور آزادی پسندی کے بڑھتے ہوئے امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ عثمانی وراثت بھی یہاں یقیناً ایک کردار ادا کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اسباق بھی، جو مسلمانوں نے ملک کی سیکولر قوتوں کے ساتھ اپنے تعامل سے حاصل کئے ہیں۔ علاوہ ازیں، ترکی حال میں ایک ایسے تجربے کی سٹیج بنا ہے جو ''اسلامی دُنیا'' کی تاریخ میں بے مثال ہے: اُس مسلم طبقہ متوسط کا عروج، جس نے مذہب کی زیادہ جدید ذہنی رُجحان کے ساتھ تعبیرِ نو کرنا شروع کر دی ہے۔ صدیوں سے اسلام بنیادی طور پر کسانوں، زمینداروں، سپاہیوں اور افسر شاہی کے لوگوں کا مذہب رہا ہے، لیکن تُرکی میں ۱۹۸۰ کی دہائی کے ''آزاد مارکیٹ کے انقلاب'' سے لے کر یہ شہری کاروباری اور پیشہ ور لوگوں کا مذہب بھی بن گیا ہے۔ اسلام کے یہ اُبھرتے ہوئے ''کالوینی'' جیسا کہ ایک مغربی تھنک ٹینک نے اُن کے ساتھ یہ لفظ منسوب کیا...... ماہرِ عمرانیات میکس ویبر (Max Weber) کے ''سرمایہ داری کی رُوح'' پر مشہور مقالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ......جمہوریت اور آزاد معیشت کی شدّت سے حمایت کرتے ہیں۔ (۹) مزید برآں وہ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت کہیں زیادہ انفرادیت پسند ہیں۔ نتیجۃً، جیسا کہ ایک ترک مبصر نے حال ہی میں لکھا، کہ وہ ''قرآن اور آزادی'' کے بارے میں سننا پسند کرتے ہیں، بجائے ''قرآن اور اطاعت کے''۔ (۱۰)

لیکن ان زیادہ جدّت پسند مسلمانوں، اور دُنیا بھر میں اُن کے لاکھوں ہم مذہبوں جو اپنی روایت کے اندر آمرانہ عناصر کے بارے میں فکر مند ہیں، کو ابھی تک اُن آزادانہ خیالات جنہیں وہ دلکش پاتے ہیں اور اُس مذہب جس کے وہ حامل ہیں، کے مابین ایک قابلِ انسانی امتزاج کی ضرورت ہے...... جو باوجود اس کے کہ ظاہری حالات اس کے مخالف محسوس ہوں، حقیقتاً قابلِ ہم آہنگی ہو۔

دوسرے لفظوں میں، اُنہیں آزادی کیلئے ایک حقیقی مسلم مقدمے کی ضرورت ہے...... کچھ ایسی چیز جو حصہ سوم، مذہبی دلائل کے ساتھ ریاست سے آزادی، ''گناہ کرنے کی آزادی'' اور ''اسلام سے آزادی'' کیلئے مہیا کرتا ہے۔

یہ اس بارے میں ایک مختصر کہانی ہے کہ یہ کتاب کیسے اور کیوں وجود میں آئی۔ یہ اُس ذہنی اور روحانی سفر کا نتیجہ ہے، جو تیس سال پہلے میرے دادا کے گھر میں شروع ہوا اور آج تک بلا رُکاوٹ جاری ہے۔ میں جدید انگریزی زبان کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جنہوں نے مجھے مغرب کی آزاد خیال روایت کے بارے میں خاصی تعلیم دی، لیکن اس دوران میں، میں نے اپنے مذہب کے بارے میں سیکھنے، دریافت کرنے اور زیادہ تجربہ کرنے کے اپنے جذبے کو قائم رکھا۔ لہٰذا، ۱۹۹۰ کی دہائی کے اوائل سے، میں مختلف اسلامی گروپوں کے ساتھ وابستہ رہا ہوں، اور میں نے اُن کی خوبیوں اور خامیوں کا براہِ راست مشاہدہ کیا۔ آخر میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ان گروپوں میں سے کسی کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں گا، لیکن میں نے اُن میں سے ہر ایک کے طور طریقوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ ان برسوں کے دوران میں نے ایک خصوصیت کو پروان چڑھایا ہے اور وہ ہے استبداد سے جبلی نفرت۔ میں نے پہلی بار اس کا شاہد آٹھ سالہ بچے کے طور پر، خاردار تار کے پیچھے سیکولر بندوقوں کی نالی کے نیچے سے دیکھتے ہوئے کیا تھا لیکن جب میں نے پہلے کالج میں اور پھر بطور صحافی اپنے کام میں شرقِ اوسط کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلامی بندوقوں کی نالیاں بھی کوئی اس سے بہتر نہیں ہیں۔ ''قوم'' یا ''ریاست'' کے نام پر کام کرنے والے جابر یقیناً خوفناک تھے...... اور اسی طرح ہی خدا کے نام پر کام کرنے والے جابر بھی تھے۔

آخر کار، میں اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ ہمعصر مسلمان دُنیا کیلئے بنیادی ضرورت آزادی کو گلے لگانا ہے...... افراد کی آزادی، وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، مومنین اور منکرین، عورتیں اور مرد، تصورات اور آرا، مارکیٹیں اور کاروباری لوگ۔ فقط ایسا کرنے سے ہی مسلم

MashalBooks.org

معاشرے خود اپنی جدیدیت پیدا کر سکتے اور اُسے آگے بڑھا سکتے ہیں، جبکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ خُدا۔مرتکز مذہب پسندی کو پروان چڑھانے کیلئے بنیادی کام کرنے سے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کرنے کیلئے کہ یہ کام اتنا ناممکن نہیں ہے، جتنا یہ بعض لوگوں کو نظر آئے گا، پہلے مجھے چودہ صدیاں پیچھے جانا ہوگا، یہ کھوج لگانے کیلئے کہ اسلام کا ظہور تاریخ میں بتدریج کیسے ہوا......اور اس دوران میں آزادی کا کیا بنا۔

MashalBooks.org

حصہ اوّل

شروعات

وہ عرصہ جس میں اسلام میں تشکیلی پیش رفتیں واقع ہوئیں، اور جس کے اختتام پر مُسلم رجعت پسندی ٹھوس شکل اختیار کر کے ظہور پذیر ہوئی، لگ بھگ ڈھائی صدیوں پر محیط تھا۔

......ڈاکٹر فضل الرحمٰن (۱۹۱۱۔۱۹۸۸) مسلم دانشور

MashalBooks.org

باب 1

قبائل کی طرف آنے والی روشنی

اگر یہ سچ ہے کہ ہر فرد کا ایسا ہی مقدر ہے [معاشرے سے آگے]، تو پھر اُسے محض ایک مقصد کے ذریعے کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے آپ میں ایک مقصد کے طور پر لیا جانا چاہیے۔

......رابرٹ اے سیریکو، رومن کیتھولک پادری (۱)

۶۱۰ء عیسوی میں، مکہ کے چھوٹے سے قصبے سے ایک عرب شخص نے، ایک غار میں ایک غیر معمولی آواز سُنی۔ ''پڑھ'' اُس آواز نے اُسے حکم دیا۔ ''اپنے مالک کے نام پر پڑھ جس نے انسان کو پیدا کیا۔''

اور دُنیا ہمیشہ کیلئے تبدیل ہوگئی۔

وہ شخص محمدؐ تھے، بنو ہاشم کے ایک فرد، جو کہ مکہ میں ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ اگرچہ اُن کی پرورش ایک یتیم کے طور پر ہوئی، لیکن ان کے ممتاز رشتہ داروں کی بدولت اُنہوں نے ایک آسودہ زندگی بسر کی۔ جبکہ ابھی آپ اپنی بلوغت کے سالوں میں تھے۔ آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ تجارتی مہمات پر شام جانا شروع کر دیا، لہٰذا آپ تجارت میں تجربہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکے۔ جلد ہی آپ ایک کامیاب اور قابلِ احترام تاجر بن گئے۔ پچیس سال کی عمر میں آپ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، جو کہ چالیس سال کی ایک مالدار بیوہ تھیں اور کاروبار میں اور بھی

زیادہ ماہر تھیں۔

تجارت، مکہ کے دو معاشی ستونوں میں سے ایک تھی۔ دوسرا ستون جو کہ پہلے سے منسلک تھا، شرک تھا۔ مکعب شکل کی عمارت، کعبہ جو کہ شہر کے قلب میں واقع تھی، کوئی تین سو بتوں کی ایک عبادت گاہِ عام تھی۔ دوسرے عرب ہر سال ان بتوں کے احترام میں مکہ کی زیارت کرتے تھے۔ جس سے اس شہر کو نہ صرف احترام حاصل ہوتا تھا بلکہ مفادات بھی۔

سال گزرتے گئے اور حضرت محمدؐ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ آپ کی شادی ہر حوالے سے ایک پُر مسرت شادی تھی۔ وہ معاشرے کے انتہائی قابلِ احترام فرد تھے اور بہت ہی عمدہ اخلاق کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ لوگ آپ کو ''امین'' کہتے تھے اور آپ سے اپنے تنازعات حل کرواتے تھے۔ وہ ایک اچھی زندگی جاری رکھ سکتے تھے دولت اکٹھی کر سکتے تھے اور پُر سکون طور پر دُنیا کو خیر باد کہہ سکتے تھے، لیکن حضرت محمدؐ کی منزل اس سے آگے تھی۔ اپنی پوری زندگی میں آپ کو اپنے معاشرے کی اخلاقیات کے بارے میں فکرمندی رہی۔ مکہ کے کچلے ہوئے لوگوں......غریبوں، غلاموں اور زیادہ تر عورتوں ...... کے ساتھ بے رحمانہ سلوک آپ کو گہری اذیت پہنچاتا تھا...... آپ اپنی ثقافت کے مغز...... بُت پرستی...... سے بھی کافی پریشان تھے...... آپ سوچتے تھے کہ یہ کتنی بے تکی بات ہے کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی اشیاء کی پرستش کریں۔

مسلم روایت ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت محمدؐ اَن پڑھ تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ بطور ایک تاجر کے آپ دستاویزات سے واقف ہوں گے، لیکن بہر حال وہ ایسے عالم فاضل شخص نہیں تھے جنہوں نے باقاعدہ ادب کی تعلیم حاصل کی ہو۔ لیکن آپ ایک مفکر تھے، اور وہ اکثر اوقات مکہ سے قریبی پہاڑ کی ایک غار میں چلے جاتے تھے، جہاں وہ ذہنی سکون حاصل کرتے تھے۔ آپ اس غار میں گھنٹوں بیٹھے رہتے اور فطرت، معاشرے اور زندگی کے مفہوم پر غور کرتے۔

گوشہ نشینی کے ان مراقبوں میں سے ایک کے دوران آپ نے یہ حکم سُنا ''پڑھ''...... اس وحی جو آپ پر نازل ہوئی کا سب سے پہلا لفظ ہی...... عربی میں اِقرا...... اُس کتاب کے نام کی طرف اشارہ کرتا تھا جو آخر کار یہ وحی کی شکل اختیار کرنے والی تھی: القرآن، جس کا مطلب ہے ''پڑھنا''۔

MashalBooks.org

حضرت محمدؐ نے اُس تاریک غار میں آنے والی عجیب وغریب آواز کو نہ صرف غیر متوقع پایا بلکہ اس قدر خوفناک کہ آپ پہاڑ پر سے نیچے اُترے اور دوڑے دوڑے گھر آئے...... کانپتے ہوئے، آپ نے اپنی بیوی سے کہا: ''مجھے اُرھاؤ، مجھے اُڑھاؤ'' آپ کو خوف ہوا کہ شاید بدروح نے آپ پر غلبہ پالیا ہے۔ لیکن خدیجہؓ زیادہ پُراعتماد ثابت ہوئیں۔ اپنے شوہر کو بازوؤں میں لیتے ہوئے آپ نے کہا'' جیسا کہ بعد کے مسلم ذرائع کی طرف سے رپورٹ کیا گیا:۔

''آپ مہربان اور اپنے قرابت داروں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ آپ غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہو اور اُن کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ آپ اُن اعلیٰ اخلاقی خوبیوں کو بحال کرنے کی کوشش کررہے ہیں جنہیں آپ کے لوگ کھو چکے ہیں۔ آپ مہمانوں کی عزت کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی مدد کو پہنچتے ہیں جو مصیبت میں ہوں۔ ایسا نہیں ہوسکتا، میرے حبیب'' (۲)

پھر خدیجہؓ نے نے یہ تجویز دی کہ وہ اس عجیب تجربے پر اُن کے چچازاد بھائی ورقہ سے بات چیت کرتے ہیں۔ موخر الذکر جو الہیات اور صحائف میں خاصا ملکہ رکھتے تھے، نے بلا جھک یہ نتیجہ نکالا کہ وہ روح جس نے حضرت محمدؐ کے ساتھ مَس کیا تھا، یقیناً ایک اچھی روح تھی۔ غار میں آواز اور پیغام حضرت موسیٰؑ اور عبرانی پیغمبروں کے تجربات کی یاد دلاتے تھے۔ ورقہ بھرپور انداز سے حضرت خدیجہؓ کے سامنے چلائے: ''مقدس: مقدّس! آپ کے شوہر اپنے لوگوں کے پیغمبر ہیں!''

اس یقین نے حضرت محمدؐ کی بقیہ زندگی کو تشکیل دیا۔ کچھ دیر کیلئے آپ شک کا شکار رہے، لیکن جلد ہی یہ ماننے پر آمادہ ہوگئے کہ آپ اپنے لوگوں کو شرک اور اخلاقی برائیوں سے بچانے کیلئے واقعتاً خدائے واحد کی طرف سے منتخب کئے گئے ہیں۔ آپ نے اعلان کیا'' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' یہ عربی لفظ الالہ سے مشتق ایک لفظ تھا۔ جس کا مطلب'' اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (۳)

یہ وحی مسلسل تئیس سال تک حضرت محمدؐ کی وفات ۴ جون ۶۳۱ تک جاری رہی، قرآنِ کریم کی یہ آیات، جب وہ معروف ہوگئیں، آپ کے پیروکاروں کے بتدریج بڑھتے ہوئے ہجوم کیلئے آپ کے حیران کُن اشارے سفر کے دوران سامانِ رُشد و ہدایت بنتی رہیں۔

بعض وحی حضرت محمدؐ کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرتیں: بعض دوسری آپؐ کو تنبیہ بلکہ ملامت بھی کرتیں۔ اور آخرِ کار وہ آپ کو ساتویں صدی کے ایک عرب تاجر سے اپنے اربوں لوگوں کیلئے ابدی رہنما میں تبدیل کرتیں۔

ایک نصب العین رکھنے والا آدمی

اُس وحی کا منبع جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی، کیا تھا؟ آیا ایک آواز کا آنا آپ کا تخیل تھا یا کیا واقعی ایک الوہی ذریعہ تھا جس نے آپ کے ذہن کے ساتھ کلام کیا؟ دوسرے لفظوں میں کیا پیغمبرؑ نے قرآن کو تخلیق کیا یا قرآن نے پیغمبرؑ کو تخلیق کیا؟

(مجھ سمیت) تمام مسلمان موخر الذّکر پر یقین رکھتے ہیں۔ محض یہ یقین ہی وہ چیز ہے جو کسی شخص کو مسلمان بناتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایمان کی ایک شق ہے، جو ایمان کی ایک زقند کا تقاضا کرتی ہے، لیکن منطقی طور پر یہ بھی ایک قابلِ یقین شق ہے۔ سب سے پہلے، خود قرآن اپنے الوہی الاصل ہونے کے دعوے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ اللہ اور صرف اللہ کے تناظر سے لکھا گیا ہے۔ آیت کے بعد آیت اور سورۃ کے بعد سورۃ میں یہ قاری کو اپنے انتہائی بنیادی کردار سے ہدف بناتا ہے: خُدا مرکزیت۔ پس عہدنامۂ جدید (New Testament) کے برعکس، قرآنِ (کریم) (حضرت) محمدؐ کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ بلکہ یہ اُن سے بات کرتا ہے۔ لہٰذا یہ آپ کی زندگی کی کہانی کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں کہتا جو، محض ڈیڑھ صدی بعد مسلمان سوانح نگاروں کی طرف سے لکھی گئی۔

صدیوں سے اس موضوع پر بحث چل رہی ہے کہ آیا محمدؐ یا اُن کے سماجی پس منظر کا کوئی فرد، ممکنہ طور پر قرآن لکھ سکتا تھا، مسلمان یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ ایک ادبی شاہکار ہے، یہ اُن سائنسی حقائق کی بات کرتا ہے، جن کا اُس دور کے لوگوں کو علم نہیں ہوسکتا تھا، اور یہاں تک کہ یہ ایسی پیشنگوئیاں کرتا ہے جن کی تصدیق تاریخ سے ہوچکی ہے (۴) یہ تمام دعوے قابل مباحثہ ہیں اور ان پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مباحثہ ہورہا ہے لیکن اسلام کے کچھ غیر مسلم طلباء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ محمدؐ اپنے عقیدے میں مخلص تھے اور یہ کہ آپ واقعتاً خدا کے پیغمبر تھے۔ ''ہم قرآن میں بالکل حقیقی خُدا پرستی، ایک متاثر کُن دینداری، اور بالکل مخصوص قسم کی مذہبی شاعری پاتے ہیں، جرمن کیتھولک مذہبی رہنما آدم موہلر نے ۱۸۳۰ میں لکھا'' یہ ناممکن ہے کہ یہ کوئی مصنوعی یا گھڑی ہوئی کوئی چیز ہو (اور) محمد محض ایک دھوکہ باز ہوں'' (۵)

محمدؐ کے اخلاص کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ اگر آپ ایک مکار ہوتے جو شہرت اور کامیابی کی

MashalBooks.org

تلاش میں ہوتے، تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ آپ ایک ایسی مہم پر چلتے جو اس قدر غیر اُمید افزا ہوتی۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہوئے اوائل اسلام کی تاریخ حیرت انگیز کامیابی کی حامل ثابت ہوئی، لیکن ایسا نتیجہ ابتدا میں قابل پیش بینی نہیں تھا۔ درحقیقت نبوت کے اوّلین سالوں میں ایک عام مکی محمدؐ کی کامیابی پر کبھی شرط نہ لگاتا، جو اُس وقت ایک نا اُمید مجنوں کی طرح نظر آتے تھے (معاذ اللہ) جو نسلوں کی قائم شدہ ثقافت کو للکار رہے تھے،

''آپ کے بھتیجے نے ہمارے بتوں پر لعنت بھیجی ہے، ہمارے مذہب کی توہین کی ہے، ہمارے طرزِ زندگی کا مذاق اُڑایا ہے، اور ہمارے آباؤ اجداد کو غلط ہونے کا الزام دیا ہے'' مکہ کے طاقتور ترین لوگوں نے محمدؐ کے چچا کے آگے احتجاج کیا۔ (۶) بظاہر وہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کیلئے ہر کام کر رہے ہیں۔

پس، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ محمدؐ کے نصب العین نے اُنہیں اُن کی زندگی کے آخری سالوں تک ذہنی سکون نہ لینے دیا۔ درحقیقت مکہ میں آپ کے پہلے تیرہ سال توہین، دھمکیوں اور دُشنام طرازی سے بھرپور تھے۔ ایک موقع پر، شہر کے بڑوں نے آپ سے درخواست کی کہ وہ بُت پرستی کی مذمت سے باز رہ کر اپنی بے لچک توحید پر مصالحت کر لیں۔ بظاہر آپ نے اس پر تھوڑا سا غور کیا لیکن صرف اس وقت تک جب آپ کو ایک وحی میں شدید سرزنش کی گئی۔ (۷) جہنم کی آگ کی تہدید ہو جانے کے بعد، محمدؐ نے نادم ہو کر، اپنے آباؤ اجداد کے دیوتاؤں کے باطل ہونے کا اعلان جاری رکھا، جس سے آپ اور آپ کے ساتھی اہل ایمان پر اور زیادہ عداوت اور جبر کا اضافہ ہو گیا۔

آپ کے نبوی نصب العین کا اگلا مرحلہ آپ کو مدینہ کے شہر لے گیا، جہاں آپ اور آپ کے پیروکار خاتمے کے خطرے کا مقابلہ کرتے رہے۔ تباہ کُن جنگِ اُحد میں آپ جسمانی طور پر زخمی ہو گئے۔ آنجہانی ولیم منٹگمری واٹ کے مطابق، جو کہ اسلامیات کے مشہور برطانوی پروفیسر تھے یہ ساری برداشت ایک حقیقی دینداری کی طرف اشارہ کرتی ہے ''اپنے آپ اور اپنے مقصد میں گہرا یقین'' اس نے استدلال کیا ''مکی دور کے دوران جب دُنیاوی نقطۂ نگاہ سے کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا، مشکلات اور اذیتوں کو برداشت کرنے پر محمدؐ کے تیار رہنے کی توجیہہ کرتا ہے۔'' (۸)

لیکن اُس نصب العین کے، جس میں محمدؐ اس قدر پُر جوش طریقے سے یقین رکھتے تھے،

بنیادی نظریات کیا تھے؟ اور اُنہوں نے معاشرے کو کس طرح سے تبدیل کیا؟

قبیلے میں سے فرد کی تخلیق

مسلم اصطلاح میں اسلام کے آغاز سے قبل کے عرب معاشرے کو جاہلیہ (جہالت کی حالت) کہا جاتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اُس معاشرے کی سب سے نمایاں خصوصیت بُت پرستی تھی۔ لیکن ایک ماہر عمرانیات ایک اور خصوصیت پر زور دے گا: قبائلیّت

بنجر عربی صحرا میں زندگی بہت سخت تھی، اور بقا پذیری کا واحد راستہ قریبی گٹھے ہوئے گروہوں میں رہنا تھا۔ لہٰذا عربوں نے بہت سے خاندان اور قبائل بنا لئے تھے، اور فرد کو ان اجتماعی رشتہ داریوں کی بہتری کیلئے آسانی سے قربان کر دیا جاتا تھا۔ قبیلوں کے درمیان مسلسل جنگ کی حالت میں ہونے اور بعد والی فرسودگی کی وجہ سے، مردوں کو زیادہ قدر و قیمت کا حامل سمجھا جاتا تھا، اور اُن کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ علاوہ ازیں غربت ایک بڑے خاندان کی پرورش میں رُکاوٹ بنتی تھی۔ لہٰذا خاندانوں کو اپنی کچھ نوزائید بچیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ جنہیں اُتنا مفید یا قابلِ عزت نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا کہ نرینہ افراد کو۔ جس چیز کی اہمیت تھی وہ قبیلے کا مفاد تھا نا کہ وہ بے نام افراد جو اس کا ایک حصہ واقع ہوتے تھے۔

اسی طرح عقوبتی نظام بھی ایک قبیلے کی شناخت کرتا تھا، نا کہ فرد کی، چونکہ ایک فرد کیلئے صحرا میں بغیر کسی نشان کے صفحہ ہستی سے غائب ہو جانا بہت آسان تھا، لہٰذا اس مجرم کو جو غائب کرنے کا ارتکاب کرتا تھا سزا دینے کا کوئی طریقہ نہیں تھا بلکہ اس کی بجائے جُرم اور اس کی سزا دونوں کو ایک اجتماعی انتقام سے قابو کیا جاتا تھا۔ اگر قبیلہ الف کا کوئی فرد قبیلہ ب کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تھا، تو اوّل الذکر سے یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے افراد میں سے کسی ایک کو بدلے کے لیے پیش کرے۔ یہ ایک کلاسیکی تصور تھا: آنکھ کے بدلے آنکھ ...... کوئی بھی آنکھ، اس اجتماعیت کی ضرورت یقینی طور پر جغرافیے سے، لیکن الہیات بھی ...... یا اُس کے فقدان سے ...... پیدا ہوئی تھی۔ عرب کثیر دیوتاؤں پر یقین رکھتے تھے، لیکن ان خُداؤں میں سے کسی ایک کو بھی ایک ایسے منصف کے طور پر تصور نہیں کیا جاتا تھا، جو انسانوں کو اُن کے اعمال کیلئے جوابدہ قرار دے سکے۔ اگلی زندگی پر کوئی یقین نہیں تھا، لہٰذا فرد کی کوئی منفرد ابدی منزل نہیں تھی۔ جیسا کہ ایک مورخ نے لکھا ہے ''وہ ابدیت جو ایک

MashalBooks.org

مرد یا عورت حاصل کر سکتے تھے، وہ صرف قبیلے ہی میں اور اس کی روح کے تسلسل میں تھی۔'' (۹)

لیکن قرآن ان تمام مفروضات کو للکارنے والا تھا پہلے پہل اس نے انسان کو ''زمین پر (خُدا کے) خلیفہ'' کے طور پر بیان کیا، ایسے باقی تمام مخلوقات پر برتری دی بشمول فرشتوں کے (۱۰) آغاز ہی سے قرآن نے فرد کی اپنے خالق کے آگے ذمہ داری پر بھی زور دیا۔ ابتدائی سورتوں میں سے ایک نے یہ شرط لگا دی کہ اس ذمہ داری کو، اللہ تعالیٰ، اُن اخلاقی انتخابات میں جو کوئی شخص کرتا ہے اس ذمہ واری کا آزمائے گا:

کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں۔
اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے ہیں،
اور اُسے دو راستے نہیں دکھائے ہیں؟
لیکن اس نے عمودی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کی
آپ کو کیا چیز سمجھائے گی کہ عمودی گھاٹی کیا ہے؟
یہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔
یا بھوک والے دن کھانا کھلانا ہے۔
ایک یتیم قرابت دار کو
یا مٹی میں غریب آدمی کو:

اور پھر اُن لوگوں میں سے بنتا ہے جو ایمان رکھتے اور ایک دوسرے کو استقامت کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کرتے ہیں۔ (۱۱)

دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ انسانوں سے دوسرے انسانوں کیلئے نیک کام کرنے کی توقع کر رہا تھا اور مستقبل کی دُنیا میں وہ ہر فرد کو اپنے اعمال کے مطابق جانچے گا۔ نیک لوگوں کو جنت میں صلہ دیا جائے گا، جبکہ بدکاروں کو جہنم میں سزا دی جائے گی۔ اور کسی گنہگار کو کوئی بھی...... نہ ہی اس کا خاندان نہ قبیلہ...... بچانے کے قابل ہوگا (۱۲) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو بتائے گا ''آج کے دن تم ہمارے پاس افراد کے طور پر آئے ہو، بالکل ایسے ہی جیسے ہم نے پہلے پہل تمہیں پیدا کیا تھا'' (۱۳)

قرآن کی یہ الٰہیات ''ایک ایسی مذہبی تحریک پیدا کرنے والی تھی، جس میں ''نیک طرزِ عمل

کے ذریعے ذاتی نجات حاصل کرنے کیلئے شدید فکرمندی پائی جاتی ہو'' (۱۴) اور ایک متنازعہ کیتھولک ماہر الہیّات ہانس کونگ کے مطابق، ذاتی نجات پر یہ ارتکاز توجہ، عرب قبیلے کے بندھن سے آزاد ہونے میں فرد کی مدد کرنے والا تھا۔

''اُس مستقیم توحید، کا ہدف، جس کا اعلان محمدؐ نے کیا، محض ایک نیا معاشرہ نہیں تھا، بلکہ ایک نئی انفرادی ذمہ داری بھی تھی...... اگر صرف ایک خُدا ہے اور یہ خُدا انسانوں کا خالق پالنے والا اور منصف ہے۔ تو پھر افراد کو ایک خصوصی وقار حاصل ہو جاتا ہے: وہ مختلف باہم مخالف دیوتاؤں کے ہاتھوں میں کھلونے نہیں رہتے، اور نہ ہی قبیلوں اور خاندانوں کے کُل فیصلہ کُن نظام میں محض اشیا کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ اس ایک خُدا کی مخلوقات بن جاتے ہیں، بلاشبہ اُس کے ''جانشین''، جو اسے جوابدہ ہوتے ہیں۔ (۱۵)''

یہ تبدیلی مقبولِ عام اصطلاحات میں بھی منعکس ہوتی تھی۔ جاہلیہ کے قبل از اسلام کے دور میں، نسب (خاندانی سلسلہ) اور حسب (موروثی خوبی) معاشرے میں فرد کی حیثیت کا فیصلہ کرتے تھے۔ موخر الذکر فرد کی ذاتی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتا تھا جو اس کے آباؤاجداد سے منسوب کی جاتی تھی: جس کے ذریعے اُس کی قدر و قیمت کو ناپا جاتا تھا۔ قرآن نے اس بات پر زور دیا کہ جس کی حقیقی اہمیت ہے وہ آدمی کا فضل (خوبی) ہے، جسے کوئی فرد اپنے ذاتی اعمال کے نتیجے میں حاصل کر سکتا ہے۔ (۱۶)

جلد ہی قرآن خونی جھگڑوں سے ممانعت کرنے والا تھا، قانونی طور پر متعین سزائیں متعارف کروانے والا تھا، اور غریبوں کی مدد کرنے کیلئے خیرات دینے کا حکم دینے والا تھا۔ (۱۷) اسلامی تہذیب کے ایک مورخ، مارشل جی ایس ہاجسن کے مطابق ان تمام احکامات نے ''فرد کو خاندانی تعلقات سے آزاد ایک درجہ دینے میں مدد کی، اور اس طرح انفرادی ثقافت کی خصوصیات کو پر ان چڑھایا'' (۱۸)

اس کے باوجود کہ عربوں کیلئے یہ نظریات نئے تھے، لیکن یہ پُرانے نظریات تھے...... وہ نظریات جن کا دعویٰ پہلے یہودیت اور بعد میں عیسائیت نے کیا...... اور انہوں نے بھی فرد کو تقویت دینے کیلئے زمین ہموار کی تھی۔ (۱۹) اور یہ توحیدی تسلسل ٹھیک ٹھیک وہی تھا جس کی قرآن فخریہ انداز سے تصدیق کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں محمدؐ سے کہا ''ہم نے یہ کتاب آپ

MashalBooks.org

کی طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے، جو سابقہ کتب کی تصدیق اور اُن کی حفاظت کرتی ہے۔''

(۲۰) وہ ''سابقہ کتب'' یہودی اور عیسائی صحائف تھے، اور قرآن محض اسی ابراہیمی روایت کے تسلسل کا دعویٰ کر رہا تھا...... ایک ایسا بیان جو کہ حقائق کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ اس سے قطع نظر کہ آیا کوئی شخص قرآن کی اصل کو الوہی وحی میں دیکھتا ہے، جیسا کہ ایک مسلمان کرے گا، یا انسانی تصنیف، میں، جیسا کہ غالباً دوسرے ترجیحاً کریں گے۔

عقلیّت پسندی کی طرف بُلاوا

اگر قرآن نے قبیلے میں سے فرد کو تراشا، تو اس نے اُسے کیا کرنے کو کہا؟ محض عقیدہ رکھنے کا؟ ایک اندھا، بلا تنقید، اور کٹر عقیدہ؟

حقیقتاً نہیں۔ اس کی بجائے قرآن اپنے قاریوں کے ذہنوں میں یقین کو بلند کرنے کو اپنا ہدف بناتا ہے، عقلی دلائل پیش کر کے۔ عَقَلَ کا فعل مسلم مذہبی کتاب میں کوئی پچاس مرتبہ آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے ''خیالات کو باہم مربوط کرنا، دلائل دینا یا ایک عقلی دلیل کو سمجھنا'' اپنے صفحات میں جگہ جگہ قرآن اپنے قارئین سے بار بار ان صلاحیتوں کو کائنات کی تخلیق اور خود انسان کی ذات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے، خدا تعالیٰ کو پانے کی ''علامات'' کے طور پر۔ تخلیق کے تمام معجزے، جیسا کہ آسمانی کُروں کی حرکت، ماحولیاتی مظاہر، انسانی جسم کی صلاحیتیں، حیوانی اور نباتاتی زندگی کا تنوع...... سب کے سب، قرآن کے مطابق ''اُن لوگوں کیلئے جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں، نشانیوں'' میں تبدیل ہو جاتے ہیں'' (۲۱)

قرآن کے استدلال کا رُخ، یقینی طور پر مذہبی فرمودات سے متعین ہوتا ہے، اور اس کی آیات خالص یقین کی بہت سی شقوں جیسا کہ اگلی زندگی کا وجود، فرشتے اور معجزات کو متعارف کرواتی ہیں۔ لیکن، اگر ایسے تصوّرات پر یقین کرنے کیلئے آدمی کو تجربی دلیل سے آگے جانے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اُسے ان کے ساتھ ٹکرا لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ درحقیقت، قرآن کے مطابق، جو عقل کے ساتھ ٹکراتے ہیں، وہ کافر ہیں۔ ایک آیت بہت واضح طور پر یہ حکم سناتی ہے ''وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتے'' (۲۲) بلجیم نژاد دانش ور ہنری لیمنز کی رائے میں ''محمدؐ کفر کو انسانی ذہن کی کمزوری سمجھنے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔'' (۲۳)

بعد والے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ عقل پر اس طرح قرآن کی طرف سے زور دینے سے کس طرح اسلام میں ایک عقلیت پسند مکتب فکر پیدا ہو گیا، جس نے جوابی طور پر انفرادی آزادی کیلئے فلسفیانہ بنیاد مہیا کی۔

وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو عطا کئے

قرآن نے عرب معاشرے میں اس تصوّر کو بھی متعارف کروایا کہ افراد کے بنیادی حقوق ہوتے ہیں۔ انصاف محمدؐ کے سماجی پیغام میں مرکزی حیثیت رکھتا، اور انصاف سے مراد محض اُن لوگوں کیلئے سزا نہیں جو جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، بلکہ اُن لوگوں سے حفاظت بھی تھی جو دوسروں کے حقوق کو پامال کر سکتے تھے۔

یہ چیز، طاقتور لوگوں کے مقابلے میں کمزوروں کی حفاظت کرنے کے قرآنی پیغام کی بنیاد میں تھی۔ محمدؐ نے فرمایا ''خدا کی قسم، ایک حبشی غلام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، اس قریشی سردار سے بہتر ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے'' (۲۴) مکہ کے سب سے معزز قبیلے قریش کیلئے یہ جرأت مندانہ مساوات بالکل چونکا دینے والی چیز تھی۔

قرآن میں متعارف کروائی گئی ایک اور اصلاح نے جوہری خاندان...... شوہر، بیوی اور بچے...... کو تقویت دی۔ اب وراثت بنیادی طور پر قریبی خاندان تک محدود ہو گی، اور پورے قبیلے میں تقسیم نہیں ہو گی۔ رابطے بالا جز ابنائے گئے'' لیکن رُجحان مستقلاً، خدا کے سامنے برابری کی بنیاد پر انفرادی حقوق پر زور دینے کی طرف تھا۔'' (۲۵)

اگرچہ یہ جدید قاری کیلئے ایک خبر ہو گی، لیکن قرآن کی انقلابی بدعات میں سے ایک اور بدعت یہ تھی کہ اس نے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا۔ قبل از اسلام کے دور میں سوائے شاذ مثالوں کے، جیسا کہ محمدؐ کی زوجہ خدیجہؓ کے، ایک عورت عمومی طور پر مَردوں کی غلام تھی۔ اس کا جائیداد کی مالک بننے کا کوئی حق نہیں تھا: وہ خود ہی ایک جائیداد تھی۔ آدمی لڑکی کے باپ کو دُلہن کی قیمت ادا کرتا تھا اور جب وہ مرتا تھا تو اس کی وراثت صرف اُس کے بیٹوں کو منتقل ہوتی تھی...... بیوی اور بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔

اسلام کے آنے کے ساتھ یہ سب کچھ تبدیل ہو گیا اوّل، قرآن نے یہ حکم دیا کہ دُلھن کی

MashalBooks.org

رقم خود دُلھن کو دی جائے اور یہ کہ وہ اسے اُس وقت تک اپنے پاس رکھے جب تک وہ چاہے، ایک مالی تحفظ کے جال کے طور پر۔ دوم قرآن نے یہ بھی حکم دیا کہ اناث بھی وراثت، کا حصہ حاصل کریں۔ یہ اس کا نصف تھا جو کچھ کہ ان کے بھائی حاصل کریں گے، لیکن ایک ایسے معاشرے میں، جہاں مردوں کو پورے گھر کی دیکھ بھال کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہو، یہ ایک فیاضانہ رقم تھی۔ قرآن نے عورتوں کو شادی کی پیشکش کو قبول کرنے یا ردّ کرنے کا حق بھی دیا اور اس چیز نے ازدواجی تعلق کو ''محبت'' اور ''رحم'' کی بنیاد پر قائم کیا۔ (۲۶)

جو کچھ قرآن نے عطا کیا وہ اصناف کے درمیان مکمل مساوات نہ تھی۔ لیکن جب اسے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بہت زیادہ بہتری تھی۔ برطانوی مورخ کیرن آرمسٹرانگ کہتی ہیں '' ''ایسے قدامت پسندانہ ماحول میں محمدؐ نے عورتوں کے لیے جو کامیابی حاصل کی، وہ غیر معمولی تھی۔ یہ تصوّر رہی حیرت انگیز تھا کہ ایک عورت گواہ بن سکتی ہے یا اپنے حق کے طور پر کوئی بھی وراثت میں حاصل کرسکتی ہے۔'' (۲۷) یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون شریعت ...... میں عورت کے حقوق اس جدید دور میں بھی مغرب سے آگے رہیں گے۔ قرون وسطیٰ میں، کچھ عیسائی علما نے اسلام پر اس بنا پر بھی تنقید کی کہ اس نے غلاموں اور عورتوں کی طرح کے کمینوں کو بہت زیادہ طاقت دے دی۔ (۲۸) یہاں تک کہ جب برطانیہ عظمیٰ نے مسلمانوں پر، شریعت کی جگہ پر اپنے قانونی نظام کا اطلاق کیا، جیسا کہ اس نے اپنی بعض نوآبادیات میں کیا، تو عورتوں کو جائیداد سے محروم کر دیا گیا جو اسلامی قانون نے ہمیشہ اُنہیں دی تھی۔ (۲۹)

المیہ یہ ہے کہ جب عورتوں کے حقوق، بیسویں صدی کے مغرب میں اپنے عروج کو پہنچے، تو اسلامی دُنیا میں، یہ صدیوں سے جامد ہو چکے تھے، بلکہ اپنی موجودہ قابلِ مذمت حالت تک زوال پذیر ہو چکے ہیں۔ آنے والے ابواب میں ہم اس کے اسباب کا جائزہ لیں گے۔

بہتری اور ارتقا، نا کہ مکمل ''انقلاب'' اکثر اوقات قرآن کا طریق کار تھا۔ مثال کے طور پر، غلامی کو ختم نہیں کیا گیا، لیکن غلام آزاد کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی اور غلاموں کی حیثیت کو بہت زیادہ بہتر بنایا گیا۔ ''اب، عرب غلام محض ذاتی سامان نہیں تھا، بلکہ ایک انسان بھی تھا، جس کا کچھ مذہبی اور لہٰذا سماجی مرتبہ بھی تھا، اور بعض نیم قانونی حقوق بھی تھے'' (۳۰)

یہاں تک کہ جانوروں کے حقوق بھی متعارف کروائے گئے۔ کفارِ عرب اُن کے ساتھ

خاصا ظالمانہ سلوک کرتے تھے۔ اس حد تک کہ وہ اُن کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کھانے کیلئے کاٹ لیتے تھے، جبکہ یہ بیچاری مخلوق ابھی زندہ ہوتی تھی۔ محمدؐ نے ایسے تمام رواجات پر اور ساتھ ہی ساتھ جانوروں کی اُن لڑائیوں پر جن کا اہتمام تفریح کیلئے کیا جاتا تھا، پابندی لگا دی۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو بتایا کہ وہ محض ایک پیاسے کُتے کو پانی پلانے سے جنت میں جاسکتا ہے۔ (۳۱)

لیکن پھر بھی ''حقوق'' کا تصوّر اسلامی قانون میں ایک بڑا موضوع نہ بن سکا۔ اسلامی قانون کے پروفیسر، محمد کمالی، اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں اور توجہ دلاتے ہیں کہ جہاں قرآن نے بہت سے انفرادی حقوق متعارف کروائے ...... جیسا کہ زندگی کا حق، جائیداد کا حق۔ تخلیئے کا حق، حرکت کا حق، انصاف، ذاتی احترام اور قانون کے سامنے برابری ...... وہیں قدیم اسلامی لٹریچر نے فرائض پر توجہ مرکوز کی۔ (۳۲)

دوسرے الفاظ میں، حقوق کا اسلامی نظریہ پروان چڑھایا جاسکتا تھا کیونکہ قرآن میں اس کی بنیاد موجود تھی، لیکن جیسا کہ عیسائیت کے ساتھ ہوا۔ مسلمانوں کو بھی جدید دور تک انتظار کرنا پڑا، تاکہ وہ اپنی مقدس کتاب پر (نگاہ ڈالیں) قدرے زیادہ انفرادی تناظر کے ساتھ، نگاہ ڈالیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ کی بعض نئی کتابوں میں ''فرد کے حقوق اور آزادیوں پر ابواب'' دیئے ہوئے ہیں، جو کہ ایک ایسی چیز ہے جو کلاسیکی تصانیف میں معدوم ہے۔ (۳۳)

پیغمبرؐ کی سیاست

اب تک ہم نے قرآن کے پیغام پر توجہ مرکوز کی ہے۔ لیکن اُن واقعات کے بارے میں کیا ہے جن کے تیزی سے وقوع کا یہ سبب بنا؟ مثال کے طور پر اُس سیاسی نظام کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو پیغمبر محمدؐ نے قائم کیا؟ کیا آپ نے ایک مذہبی ریاست قائم نہیں کی، جس نے جنگیں شروع کیں اور فتوحات کا تعاقب کیا؟ یہ اچھے سوالات ہیں اور ان کا جواب اتنا سادہ نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔

درحقیقت محمدؐ نے اپنے نصب العین کا آغاز بطور ایک سیاسی رہنما کے نہیں کیا۔ قرآن نے آپ کو بتایا کہ آپ ''ایک ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے ہیں'' (۳۴) جب آپ اس

MashalBooks.org

بارے میں فکر مند ہو رہے تھے کہ بہت سے کافر آپ کی باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے یہ کہا کہ وہ اسے جانے دیں ''ہم نے آپ کو اُن پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا'' ایک آیت میں یہ یاد دہانی کرائی گئی ''اور آپ کو اُن پر اُن کا نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا۔'' (۳۵)

قرآن نے مکیوں کے کفر کرنے کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ اس نے کفار کو جہنم کی آگ سے ڈرایا، لیکن اس نے اس بات پر بھی زور دیا، کہ اس دُنیا میں وہ اپنا راستہ خود منتخب کرنے کیلئے آزاد ہوں گے۔ ایک آیت میں یہ کہا گیا ''یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے۔ پس جو چاہیے وہ ایمان لائے اور جو چاہیے کفر اختیار کرے'' (۳۶)

پیغمبرؐ کی نبوت کی تئیس سالہ زندگی میں سے پہلے تیرہ سال یونہی گزر گئے ......کلیتاً غیر سیاسی اور تشدد سے پاک۔ یہ رویہ جزوی طور پر اُس کے بعد تبدیل ہوا جب آپ کو مکہ سے ہجرت کرنا پڑی ...... جہاں آپ اُن ممتاز کفار کے ہاتھوں شہید کئے جانے کے بالکل قریب تھے، جو آپ کی غیر مصلحت اندیشانہ توحید سے برہم ہو گئے تھے...... یثرب کی طرف، وہ قصبہ جے بعد میں مدینہ (شہر) کے نام سے جانا گیا۔ یہ ہجرت پیغمبرؐ کے نصب العین میں ایک فیصلہ کُن موڑ تھا اور اس نے مسلم کیلنڈر کے آغاز کو نشان زد کر دیا۔

مدینہ کے مسلمانوں نے، جو کہ حال ہی میں تشکیل پانے والی ایک قومیت تھی، پیغمبرؐ کا گیتوں سے استقبال کیا اور آپ کے مکی پیروکاروں کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ یہاں وہ سب عقیدے کے لحاظ سے بھائی تھے، ایک ایسے معاشرے میں جو جبر سے آزاد تھا۔ اور پیغمبر خداؐ آپ نہ صرف ایک روحانی بلکہ سیاسی رہنما بھی تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے مدینہ میں ایک مذہبی ریاست قائم نہیں کی۔ بجائے ایک ایسے سیاسی نظام کے جو کلی طور پر اسلام کی تعریف کے مطابق ہو، آپ نے ایک علاقائی سیاسی نظام قائم کیا، جو مذہبی تکثیریت پر مبنی تھا۔

یہ چیز ایک دستاویز سے، جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ واضح ہے، جس پر پیغمبرؐ نے، شہر میں دوسری قومیت ...... یہودیوں کے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ دستخط کئے۔ کچھ عرصے سے تین یہودی قبائل۔ یثرب میں رہ رہے تھے۔ حضرت محمدؐ کے ساتھ کچھ گفت وشنید کے بعد اُنہوں نے آپ کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے، جس میں آپ کو مدینہ کا سربراہ تسلیم کیا گیا، لیکن اس نے دونوں قومیتوں کو اپنے اپنے خود مختار طریقے سے رہنے کا حق دیا۔ ایک شق میں یہ کہا گیا

''مسلمانوں کیلئے اُن کا دین، اور یہودیوں کیلئے اُن کا دین۔ خیال یہ تھا کہ شہر ان دونوں گروہوں کی ملکیت ہے، اور کسی بیرونی خطرے کی صورت میں ہر ایک کو اس کے دفاع میں اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا۔ اس میثاق نے یہ اعلان کیا ''تمام قبائل ایک قوم ہیں، جو دوسرے لوگوں سے الگ ہیں۔'' (۳۷)

دلچسپ بات یہ ہے کہ قومیت کیلئے استعمال کیا گیا لفظ اُمہ تھا، جس نے بعد میں کُلیتاً ایک اسلامی مفہوم اختیار کر لیا۔ آج کل مسلمان اس اصطلاح کو صرف اپنے ساتھی مسلمانوں کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میثاقِ مدینہ میں اُمہ اُن لوگوں پر مشتمل تھی جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، جنہوں نے مشترکہ مفادات کی وجہ سے ایک سیاسی قومیت بنالی تھی۔ ایک مغربی دانش ور کے مطابق، اس کا مفہوم یہ ہے کہ، ''حضرت محمدؐ کی ابتدائی مدینہ کی ''قومیت'' ایک خالصتاً سیکولر قومیت تھی'' (۳۸) میثاق میں موجود مذہبی تکثیریت بجائے پیغمبرؐ کی کسی اختراع کے غالباً رواج کا نتیجہ تھی۔ تاہم اگر پیغمبرؐ کے سیاسی نصب العین کو مسلمانوں کیلئے ایک نمونہ سمجھا جائے، تو پھر اس میثاق کی تکثیر پسند بلکہ سیکولر نوعیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بد قسمتی سے، اس میثاق کے ذریعے قائم شدہ سسٹم طویل عرصے تک قائم نہ رہا، بنیادی طور پر مسلمانوں اور اُن کے سب سے بڑے دشمنوں، مکہ کے کفار، کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کی وجہ سے، جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا، اذیتیں دیں اور آخر کار اُن کے گھروں سے نکال دیا۔ ''اُن لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، جن کے خلاف جنگ کی جائے'' قرآن نے جلد ہی اعلان کیا۔ ''اُنہیں اُن کے گھروں سے ناحق نکالا گیا، محض یہ کہنے کی وجہ سے ''ہمارا رب اللہ ہے۔'' (۳۹)

مسلمان ذرائع کے مطابق، جس چیز نے مکیوں کی اس دھمکی کا تعلق مدینہ کے مسلمانوں اور شہر میں یہودیوں کے انجام کے ساتھ جوڑا، وہ یہودیوں کا دشمن کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ تھا۔ نتیجتاً، تین یہودی قبائل میں سے دو، جنہوں نے مکہ والوں کی مدد کر کے میثاق کی خلاف ورزی کی تھی کو مدینہ سے نکال دیا گیا، تیسرا یہودی قبیلہ، بنوقریظہ، ......جنہوں نے مکی فوج کے ساتھ، جب اُس نے مدینہ کا محاصرہ کیا، فیصلہ کُن جنگِ خندق کے دوران، پوری مسلمان قومیت کو ختم کرنے کیلئے، گفت وشنید کی ......زیادہ بدقسمت تھا......اس بغاوت کی سزا، جیسا کہ مسلمان اے

MashalBooks.org

سمجھتے ہیں، اُس سب سے زیادہ متنازعہ فیصلے کی رُو سے دی گئی جو محمدؐ نے کبھی کیا: پورے قبیلے کے ذکور کے اجتماعی قتل اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لینے کا فیصلہ۔

اس کہانی کی صحت پر بعض جدید مسلمان دانشوروں کی طرف سے شک کا اظہار کیا گیا ہے۔(۴۰) ان میں سے ایک ولید ابن عرفات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی بعد کی اختراع ہے۔ ''اتنی بڑی تعداد کو قتل کرنا'' انصاف کی اسلامی حِس اور قرآن میں بیان کئے گئے اصولوں سے کاملا متضاد ہے۔''، وہ اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استدلال کرتے ہیں: ''کوئی جی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔''(۴۱)

تاہم، اگر یہ اجتماعی قتل حقیقتاً واقع بھی ہوا ہو، جیسا کہ بڑے طبقے کا نقطۂ نظر ہے، تو بھی آدمی کو یہ مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ ایسا قرآن کے کسی حکم کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ وقت کے رواج کے مطابق ہوا۔ (۴۲) یہودی تاریخ کے پروفیسر نورمن اے سٹیلمین (Norman A. Stillman) بیان کرتے ہیں: ''ہم قریظہ کے ساتھ کئے گئے سلوک کے بارے میں فیصلہ آج کل کے اخلاقی معیارات کی رو سے نہیں کر سکتے'' اُن کا مقدّر تلخ ضرور تھا، لیکن اُس دور میں جنگ کے سخت اصولوں کے لحاظ سے غیر معمولی نہیں تھا''، سٹیلمین ہمیں یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ عہد نامۂ عتیق (Deut.20:13-14) میں اسرائیلیوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ یہی کچھ کرنے کا حکم دیا گیا تھا: بالغ ذکور کا قتل اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنانا، جو کہ بہرحال، ''پوری قدیم دُنیا میں عام معمول تھا''(۴۳)

اور یہ چیز ہمیں ایک فیصلہ کُن سوال کی طرف لے جاتی ہے: کیا وہ تمام چیزیں جو محمدؐ نے کیں مسلمانوں کیلئے نمونہ ہیں؟ یا کیا اُن میں سے کچھ اسلام کے ابدی ضابطوں اور اصولوں کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ پیغمبرؐ کے دور اور ماحول کے اصول و ضوابط کی عکاسی کرتی ہیں؟

حضرت محمدؐ بطور انسان

کچھ جدید مذہبی علما، اور بلکہ کلاسیکی علماء بھی، جو مندرجہ بالا سوال سے نمٹتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کے ''تاریخی'' اور ''مذہبی'' پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ کیا جانا چاہیے۔ (۴۴) دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ ایک ایسا پیغام لائے جو تمام زمانوں کیلئے تھا، لیکن آپ نے اپنے دور کے مطابق زندگی بسر کی۔

اس بات کا ادراک، ہمارے لئے دو بہت عام اور باہمی طور پر منسلک، غلطیوں میں سے کسی ایک کا شکار ہونے سے بچنے کی کُنجی ہے۔ پہلی غلطی جس کا شکار غیر مسلم ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ ہمارے جدید معیارات کے مطابق محمدؐ پر تنقید بلکہ بعض اوقات اُن کی مذمت کرتے ہیں۔ دوسری غلطی جو مسلمانوں کی طرف سے کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آپ کے دور کے معیارات کو ابدی طور پر صحیح سمجھتے ہیں اور اُنہیں جدید دور میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر، آپ کے کاموں میں سے ایک اور متنازعہ کام کو لیجئے: آپ کی عائشہؓ کے ساتھ شادی، جو ہمارے معیارات کے مطابق بہت کم عمر تھیں (۴۵) بلاشبہ، جدید معیارات کی رُو سے، قطعی ناقابلِ قبول ہے، لیکن اُس وقت یہ بالکل معمول کی بات تھی، جب بلوغت کو عمومی طور پر شادی کی فطری عمر سمجھا جاتا تھا (ساتویں صدی میں عرب، بلوغت کو اس سے کم تر عمر میں پہنچنے کا رُجحان رکھتے تھے، جتنا آج کل مغرب کے لوگ رکھتے ہیں)(۴۶)

حضرت محمدؐ کے دوسرے متنازعہ پہلو...... یہ کہ آپ کی متعدد ازواج تھیں۔ آپ غلام رکھتے تھے (جن کے ساتھ آپ نہایت شفقت کا برتاؤ رکھتے تھے) یا آپ تشدد کے اقدامات کا حکم دیتے

MashalBooks.org

تھے، جیسا کہ بنوقریظہ کا انجام......صرف موجودہ دور میں متنازعہ ہوتے ہیں اور جدید ناقدین کی نگاہ میں متنازعہ ہوتے ہیں۔ ولیم منٹگمری واٹ ذکر کرتے ہیں۔ ''یہ واضح ہے کہ محمدؐ کے وہ اقدامات جو جدید مغرب کی طرف سے ناپسند کئے جاتے ہیں، آپ کے ہم عصر لوگوں کیلئے تنقید کا نشانہ نہیں تھے۔'' (۴۷)

مسلم ذہن کیلئے، پیغمبرؐ کی یہ تاریخی حیثیت رسوائی کا باعث نہیں ہونی چاہیے۔ درحقیقت، محمدؐ سے ایک مکمل ابدی عقل کی توقع رکھنا، قرآنی دینیاتی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوگی۔ عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے تصوّر کے برعکس......جو کلام خداوندی کی حیثیت سے ابدی طور پر وجود رکھتے تھے اور مادی وجود میں آنے کے بعد تاریخ میں داخل ہوئے تھے......حضرت محمدؐ محض ایک بشر تھے۔ آپ کلام خداوندی نہیں تھے۔ وہ ایک سادہ سے انسان تھے جو کلامِ خداوندی سے مستفیض تھے۔ قرآن نے آپ کو یہ بیان کرنے کا حکم دیا ''میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔'' (صرف یہ کہ) میری طرف وحی نازل کی گئی ہے کہ اللہ ایک ہے۔'' (۴۸)

اگرچہ، یہ دلچسپ بات ہے کہ، بعد میں مسلم روایت آپ کو ایک مافوق البشر شخصیت تک بڑھائے چڑھائے والی تھی، جو عیسیٰؑ کی طرح وقت اور کائنات کے آغاز سے پہلے سے وجود رکھتے تھے اور اُنہوں نے زمین پر بہت سے معجزات برپا کئے۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح اس ''علم پیغمبری'' نے، پیغمبرؐ کی وفات کے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے بعد، ایک محیطِ کُل سُنّت (پیغمبر کی روایت) کے اسلام میں ایک جامد قوت کے طور پر، اُبھرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

اسلام کا ایک عظیم راز

پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری سال فتح کے سال ثابت ہوئے۔ پانچ سالہ جنگ کے بعد، مارچ ۶۲۸ میں، آپ نے کفّارِ مکہ سے ایک امن معاہدے پر دستخط کئے۔ اگلے دو سالوں میں مسلمانوں کو نئے مذہب کی تبلیغ کرنے، اور پورے جزیرہ نمائے عرب سے مذہب تبدیل کرنے والے حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع بالترتیب حاصل ہوا، پھر، مدینہ اور مکہ کے ساتھ وابستہ دو قبائل کے درمیان ایک جھڑپ کے بعد، امن معاہدہ تحلیل ہوگیا۔ دس ہزار جوانوں کی ایک عظیم فوج کے ساتھ محمدؐ نے مکہ کی طرف چڑھائی کی۔ آبائے شہر کیلئے واحد راستہ، اُس شخص کے سامنے ہتھیار

ڈالنے کا رہ گیا، جسے اُنہوں نے محض چھ سال پہلے نکال باہر کیا تھا۔ وہ سب خوفزدہ تھے کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے، لیکن اس کے بجائے آپ نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

شہر میں، بغیر خون خرابے کے، اپنے داخلے کے فوراً بعد حضرت محمدؐ فتح مند ہو کر کعبہ کی طرف آگے بڑھے۔ عرب یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ قدیم عبادت گاہ ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوئی تھی جو کہ اُن کے توحید پرست جدامجد تھے، خُدا کی عبادت کرنے کیلئے۔ تاہم وقت گزرنے پر یہ کفار کا بُت خانہ بن گئی اور جب محمدؐ نے اس کے دروازوں کو کھولا تو آپ نے دیکھا کہ اس میں تین سو سے زیادہ بُت بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک ایک کر کے ان بتوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ ''حق آگیا'' اُس آیت نے اعلان کیا جو آپ نے تلاوت فرمائی ''اور باطل غائب ہوگیا۔'' (۴۹)

مسلم ذرائع یہ خبر دیتے ہیں کہ کعبہ میں بنی ہوئی مقدس شبیہوں میں سے، صرف عیسیٰؑ اور مریمؑ کے نقوش کو چھوڑ دیا گیا کیونکہ قرآن میں اُن کا گہرا احترام کیا جاتا ہے۔ (۵۰)

یہ اس حقیقت کی علامت تھی کہ اسلام، جو شرک سے سخت نفرت کرتا ہے، عیسائیوں اور یہودیوں کو، جزوی طور پر گمراہ لیکن پھر بھی صحیح مذاہب کے افراد سمجھتا ہے۔ ان ساتھی توحید پرستوں، جنہیں قرآن ''اہل کتاب'' کا لقب دیتا ہے، اسلام کی حکومت کے تحت رہنے اور اپنے مذاہب پر عمل کرنے کا حق دیا گیا۔

صرف بیس سال کے اندر محمدؐ کو حیرت انگیز کامیابیاں ہوئیں۔ جلد ہی جونہی دوسرے عرب قبائل آپ کے پیغام کو قبول کرنے لگے، آپ جزیرہ نمائے عرب میں طاقتور ترین آدمی بن گئے۔ لیکن یہ آپ کی ذات کی کامیابی نہ تھی۔ قرآن نے آپ کو بتایا ''جب اللہ کی نصرت اور فتح آگئی اور آپ نے لوگوں کو گروہ در گروہ دین خداوندی میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیا، تو پھر اللہ کی حمد اور تسبیح کرو اور اُس کی مغفرت طلب کرو۔'' (۵۱)

یہ خُدا مرکزیت، اسلام کی بنیادی ترین خصوصیت تھی۔ انسان اور خدا کے درمیان کسی بھی واسطے کو مسترد کرنے سے......جیسا کہ ایک منظّم کلیسا......اسلام مغربی مفہوم میں ایک منظّم مذہب نہ بنا۔ لہٰذا اس نے فرد کو طاقتور بنانا جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ شہری آزادیاں رکھنے والا وہ جدید فرد تو نہیں تھا، جو آج کل ہمارے ہاں ہے، لیکن یہ کفر کے دور کی قبائلیت سے ایک صاف اور ترقی پسندانہ دوری ضرور

MashalBooks.org

تھی۔ کیرن آرمسٹرانگ استدلال کرتی ہے ''محمدؐ ہمارے جدید مغربی آزادانہ نظریات کے اطمینان کے مطابق ایک بھرپور فردیت...... تو پیدا نہ کر سکے، لیکن آپ نے ایک آغاز ضرور کر دیا تھا''۔(۵۲)

ایک اور مبصر جس نے اسلام کے آزادی دہندہ نصب العین کا سرسری تذکرہ کیا، روز وائلڈر لین (Rose Wilder Lane) ہے جو امریکہ کی مبلغینِ آزادی کی تحریک (۱۹۶۸۔۱۸۸۶) کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ (بہت سے امریکی، اُس کی والدہ لارا اِنگالز وائلڈر (Laurra Ingalls Wilder) کو اس کے مشہور ناول لِٹل ہاؤس آن دا پریری (Little House on the Prairie) سے جانتے ہوں گے) اپنی ۱۹۴۳ کی کتاب داڈسکوری آف فریڈم: انسان کی جبر کے خلاف جدّ وجہد (The.Discovery of Freedom: Man's Struggle against Authority) میں مِسز لیں نے ایک خصوصی باب اسلام کے نام وقف کیا ہے۔ اُس کی دلیل یہ تھی کہ زمین پر آزاد معاشرے قائم کرنے کی تین بڑی کوششیں ہوئی ہیں۔ پہلی کوشش کا سہرا اُس نے ابراہیمؑ کے سر باندھا ہے، جنہوں نے انسان کو ''متلون مزاج دیوتاؤں کے ظلم سے بچایا''۔ دوسری کوشش محمدؐ کی طرف سے کی گئی، جن کی تعریف اس نے ان الفاظ میں کی ہے ''ایک خودساختہ تاجر'' جس نے ''علمی معاملات میں انفرادیت آزادی کی حقیقت کو مسلم کیا۔'' تیسری بڑی کوشش، لین نے استدلال کیا'' امریکی انقلاب تھا۔(۵۳)

آج یہ چیز بہت سے امریکیوں اور دوسرے مغربی لوگوں کو خلافِ وجدان محسوس ہوگی جو یہ سوچتے ہیں کہ اُن آزادانہ خیالات کے جو مغربی تہذیب میں پروان چڑھے ہیں، زیادہ متوازی خیالات مسلم دُنیا میں نہیں ہیں۔ اور اسلامی مشرق میں آزادی کی یا اس کے فقدان کی موجودہ صورتِ حال، اس نقطۂ نظر کا جواز بنتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔

ایک دانشور، جس نے اس تضاد کا جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ کیا وہ قانون کا امریکی پروفیسر ڈیوڈ فورٹ ہے:۔

''اسلام میں ایک بہت بڑی پُراسراریت ہے۔ اسلام کو غلامی کو ترک کرنے والی پہلی تہذیب ہونا چاہیے تھا: لیکن یہ آخری تہذیب تھی۔ اسلام کو مکمل مذہبی آزادی کو قائم کرنے والا پہلا (دین) ہونا چاہیے تھا: لیکن آج اسلامی مما لک میں غیر مسلموں کو بہت بُری اذیتیں سہنا پڑتی ہیں۔ اسلام کو عورتوں کی سماجی برابری کو قائم کرنے میں سب سے پہلے نمبر پر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی بجائے، اُن عورتوں کو جو خاندان کے ضابطۂ اخلاق سے باہر نکل جائیں، بغیر کسی سزا کے خوف کے قتل کر دیا

جاتا ہے۔ اسلام کو جنگ کے انسانی قوانین کی پابندی کرنے والی اوّلین تہذیب ہونا چاہیے تھا، لیکن اس کی سلطنتیں دوسروں سے کسی طرح مختلف نہیں رہیں بلکہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُن سے بھی بُری رہیں۔۵۴

لیکن کیوں؟ ایسا کیا واقع ہوا؟ محمدؐ کی طرف سے کیا جانے والا آغاز کیوں اپنے منطقی نتیجے کو نہیں پہنچا؟

اس کا جواب تلاش کرنے میں چند اور ابواب درکار ہوں گے...... اور ہم آغاز اُس سے کریں گے جو کچھ ٹھیک ہوا۔

MashalBooks.org

باب 2

مشرقِ کی خردافروزی

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دُنیا نے اپنے پیشرووں، اپنے ہم عصروں، اور اپنے بیشتر جانشینوں میں سے کسی ایک کی نسبت بہت زیادہ آزادی پیش کی۔

......برنارڈ لیوس، شرقِ اوسط کا مورّخ (۱)

۶۳۲ میں اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل، پیغمبر محمدؐ نے مکہ میں اپنا آخری حج کیا، جہاں آپ نے اپنا الوداعی خطبہ دیا، جس کی اس وقت سے لے کر، تمام مسلمانوں کیلئے ایک تاریخی اہمیت ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع سے کہا ''اے لوگو، تمہاری جانیں اور تمہارے مال قابلِ احترام ہیں'' آپ نے آگے چل کر سود، خونی انتقام اور قتل کی مذمت کی۔ آپ نے مردوں کو یاددہانی کرائی، ''بلاشبہ آپ کی عورتوں کے حقوق آپ پر ہیں، اور اُن پر آپ کے حقوق ہیں۔'' آپ نے قبائلی، نسلی، اور ثقافتی تقسیموں کی بھی مذمت کی۔ ''تمام بنی نوع انسان آدم اور حوّا کی اولاد ہیں'' آپ نے کہا اور مزید کہا: ''ایک عربی کو کسی غیر عرب پر کوئی فضیلت نہیں...... گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں، نہ ہی کالے کو گورے پر، مگر تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے'' (۲)

خطبہ حجتہ الوداع سے چند ماہ بعد، پیغمبرؐ علیل ہو گئے اور چند دن تک درد اور کمزوری کا شکار رہے۔ ۸ جون ۶۳۲ کو، آپ خاموشی سے، اپنی پیاری بیوی عائشہ کے بازووں میں دُنیا سے

تشریف لے گئے۔ اُس مسلم قومیت کیلئے جو تیئس سال قبل آپ کی پہلی وحی سے لے کر آپ کی پیروی کر رہے تھے یہ ایک آزمائش کا لمحہ تھا۔ کچھ لوگوں نے اس بُری خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا، دوسرے سکتے میں آ گئے۔ لیکن پیغمبرؐ کے قریب ترین ساتھی ابوبکرؓ نے قیادت سنبھالی اور قوم سے خطاب کیا ''آپ میں سے جو کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا، تو محمدؐ وفات پا چکے ہیں''۔ آپ نے جیسا کہ مشہور ہے یہ اعلان کیا ''لیکن جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے اور کبھی اُسے موت نہیں آئے گی۔''

پیغمبرؐ نے اپنے پیچھے کوئی ادارہ یا وارث نہیں چھوڑا...... جو کہ ایک عجیب بات ہے، جس کی طرف ہم بعد میں واپس آئیں گے۔ وقت کے اس لمحے مسلمان قوم کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد اُنہوں نے، اپنے میں سے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ابوبکر کو ''خلیفہ'' (محمدؐ کے جانشین) کے طور پر چُنا۔ ابوبکرؓ کی ''خلافت'' کے بعد عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کی خلافت آئی تھی جو کہ محمدؐ کے دوسرے ممتاز صحابہ تھے سُنی ان چاروں کو اسلام کے خلفائے راشدین خیال کرتے ہیں، جبکہ شیعہ صرف حضرت علیؓ کا احترام کرتے ہیں اور باقی تینوں کو اُس حکومت کے غاصبین سمجھتے ہیں جن کے حقدار علیؓ تھے۔

ان خلفائے راشدین کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر کام علاقائی توسیع تھا۔ جب پیغمبرؐ فوت ہوئے تو مسلمان صرف جزیرہ نما کے عرب پر قابض تھے۔ صرف تین دہائیوں میں اُنہوں نے ایک ایسی سلطنت تشکیل دی جو لیبیا سے لے کر افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ فتوحات خاندان اُمیہ کے تحت بھی جاری رہیں، جو خلفائے راشدین کے بعد آیا، اور اسلامی سلطنت مغرب میں ہسپانیہ اور مشرق میں ہندوستان تک پھیل گئی۔ بعد میں افریقہ، ایشیائے کوچک، بلقان، کاکیشیا، اور جنوب مشرقی ایشیا کے کچھ حصے بھی اسلام میں داخل ہو گئے۔

اگرچہ بعض علاقوں میں اسلام کی توسیع میں فوجی فتوحات بھی اہم کردار ادا کرتی رہیں، جیسا کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، چین اور انڈونیشیا میں لیکن اسلام امن پسند تاجروں اور مبلغوں کے ذریعے پھیلا۔

دُنیا کا مسلم غلبے والا یہ وسیع خطہ...... دُنیائے اسلام ...... تاریخ میں اسلام کے تجربے کی ایک سٹیج بننے والا تھا اور اس کی کہانی دو علیحدہ علیحدہ حرکیوں سے تشکیل پائی تھی: ایک طرف اسلام

MashalBooks.org

کے پیغام نے، دُنیا پر اسلام کے لوگوں کو ہدایت دینی اور اُنہیں تبدیل کرنا تھا: دوسری طرف ان لوگوں کی پہلے سے موجود اور طویل عرصے سے قائم شدہ ثقافتوں نے اسلام کے پیغام کو متاثر کرنا اور بعض اوقات اسے گہنا دینا تھا۔

تلوار کا مذہب؟

اگر اسلامی دنیا، اپنی توسیع کیلئے زیادہ تر اُن فوجی فتوحات کی مرہونِ منت ہے جو جہاد (جدوجہد) کے جھنڈے تلے لڑی گئیں، تو کیا پھر ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ اسلام ''تلوار کا مذہب ہے؟''

بالکل نہیں۔ یقینی بات ہے کہ فتوحات نے، مسلمانوں کی حکومت کو توسیع دی، لیکن مفتوح لوگوں کو اسلام قبول کرنے کیلئے مجبور نہیں کیا گیا، اور اُن سے بہت سے لوگوں نے اپنے مذہب کو برقرار رکھا۔ قرآن نے یہ اعلان کر رکھا تھا ''دین میں کوئی جبر نہیں'' اور بہ استثنائے چند...... جیسا کہ شمالی افریقہ میں جنونی المہادین...... اسلامی دُنیا میں جبری تبدیلی مذہب ایک لعنت رہی ہے۔ (۳)

تو پھر مسلمانوں نے دُنیا کو فتح کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

ایک بڑا مقصد ''خدا کے پیغام کو پھیلانا'' تھا، تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یہ سب لوگوں کے علم میں آجائے۔ جیت کیلئے استعمال کیا جانے والا عربی لفظ ''فتح'' تھا، جس کا مطلب ''کھولنا'' ہوتا ہے لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے فتح کی ہوئی کوئی سرزمین اسلام کیلئے ''کھلی'' ہوتی تھی، جبکہ غیر مسلم وہاں اپنی زندگی کو جاری رکھ سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں جہاد کا مقصد جبری طور پر مذہب تبدیل کرانا نہیں بلکہ ''تبدیلی مذہب کے راستے میں رُکاوٹوں کو دور کرنا، ہوتا تھا۔ (۴) (ایسے ہی خیالات کا اظہار سینٹ تھامس اور سینٹ برنارڈ نے، عیسائی صلیبی جنگوں کے بارے میں کیا تھا) (۵) فتوحات کا دوسرا مقصد اس چیز کو پھیلانا تھا جسے مسلمان محض ایک سیاسی نظم مانتے تھے۔ تیسرا جذبہ، خاص طور پر، خلفائے راشدین کے دور کے بعد، محض دولت اور اقتدار حاصل کرنے کی ہوس ہوسکتا ہے۔

مفتوحہ علاقوں میں، رہنے والے غیر مسلم مسلمانوں سے ذمّہ (حفاظت) حاصل کرتے تھے۔ جان اور مال کی حفاظت اور آزادانہ طور پر عبادت کرنے کے حق کے بدلے میں ذِمّی (حفاظت یافتہ) ایک ٹیکس ادا کرتے تھے اور اُنہیں کچھ سماجی پابندیوں کو قبول کرنا پڑتا تھا، جو مسلم

راج کے سامنے اُن کی اطاعت پر دلالت کرتے تھے، (وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، یہ پابندیاں بڑھتی گئیں'، اور غیر مسلموں کا درجہ کم پسندیدہ ہوتا گیا، کیونکہ مسلمانوں نے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ مشرق میں قدیم سے موجود رویوں کو اپنا لیا) (۶) عیسائی اور یہودی ذمہ میں لئے جانے والے پہلے گروہ تھے لیکن جوں جوں حکومت پھیلتی گئی، زرتشتی، ہندو، بُدھ، اور دوسرے بھی اجتہاد کے طریقے سے شامل ہوتے گئے۔

اگر آج کے مساوی شہری حقوق کے جدید تصور کے ساتھ موازنہ کیا جائے، تو غیر مساوی ذمہ ناقابلِ قبول نظر آئے گا۔ لیکن اُس دور کے معیارات کے مطابق یہ خاص ترقی یافتہ تھا۔ وہ سب سے پہلے غیر مسلم جنہوں نے ذمہ کو ایک زندگی بچانے والا عمل سمجھا، وہ شام اور شمالی افریقہ کے عیسائی تھے، جنہیں وقت کی غالب عیسائی حکومت، بازنطینی سلطنت، کی طرف سے مذہب کے اختلافات کی بنا پر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ بازنطینی کالسیڈونین عقیدے میں یقین رکھتے تھے، جو اس بات کا قائل تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی دو فطرتیں تھیں، خُدائی اور انسانی۔ مصر اور شام میں زیادہ تر عیسائی منوفی زائٹس تھے، جو صرف ایک خدائی فطرت پر یقین رکھتے تھے۔ یہ مذہب منوفی زائٹس پر نہ صرف مذہبی جبر بلکہ بھاری ٹیکس بھی عائد کرتا تھا لہٰذا جب اُن کے شہروں کے دروازوں پر مسلمانوں کی فوجیں نمودار ہوتیں، دورن عیسائی مذہبی تنازعات کے بارے میں آزادہ روی اور ٹیکسوں میں نرمی کے ساتھ، تو بہت سے شرقِ اوسط کے عیسائی ان فاتحین کو خوش آمدید کہتے تھے، ''اپنے ساتھی عرب سمیا طیقیوں کو یونانی ٹیکس وصول کنندگان اور دقیانوسی اذیت رسانوں سے نجات دہندہ'' سمجھتے ہوئے۔ (۷)

بعض اوقات، یہ مقامی عیسائی مسلم فتوحات کی فعال طریقے سے مدد بھی کرتے تھے۔ جب بازنطین کے زیرِ حکومت دمشق کا ۶۳۴ میں عرب فوج کی طرف سے محاصر کرلیا گیا، تو شہر کے منوفی زائٹ پادری نے مسلمانوں کے کمانڈر، خالدؓ کو خفیہ طریقے سے یہ اطلاع دی کہ شہر کے مرکزی دروازے کا دفاع کمزور ہے، اور اس نے مسلمان دستوں کو، دیواروں پر چڑھنے کیلئے سیڑھیاں بھی مہیا کیں۔ فتح کے بعد شہر کا سینٹ جان کا کیتھیڈرل دو حصوں میں تقسیم ہوگیا: ایک نصف بطور کلیسا استعمال ہوتا تھا، جبکہ دوسرا نصف ایک مسجد بن گیا۔ (۸) جیسا کہ آثارِ قدیمہ کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے، زیادہ تر مفتوحہ علاقوں میں مسلم حکومت نہ صرف عیسائی کلیساؤں کی

MashalBooks.org

بقاپذیری کی، بلکہ نئے کلیساؤں کی تعمیر کی بھی اجازت دیتی تھی۔(۹)

یہودیوں نے بھی، عرب مسلم راج کے تحت اپنی حیثیت کو بہتر پایا۔اس وقت کی ایک القائی یہودی تصنیف میں خُدا کی تعریف کی گئی تھی، کیونکہ ''وہ صرف اسماعیل کی بادشاہت لایا ہے''، یعنی عربوں کی، یہودیوں کو بازنطینی ''ظلم'' سے بچانے کیلئے (۱۰) جدید دور تک، بہت سے یہودی اسلامی راج کے تحت زندگی کو قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے تحت زندگی پر قابل ترجیح سمجھتے تھے اور اکثر اوقات وہ عیسائی ممالک میں اذیتیں دیئے جانے کے بعد مسلمان ممالک میں ایک محفوظ پناہ گاہ پاتے تھے۔(۱۱)

قانون کی حکمرانی نا کہ حکمران کی

ذِمّہ کا نظام، اُس بنیادی تصور کے، جو قرآن نے متعارف کروائے، بہت سے مفاہیم میں سے صرف ایک مفہوم تھا۔انسانوں کے حقوق خدا تعالیٰ کی طرف سے حکماً دیئے گئے ہیں، اور کوئی دوسرا انسان ان حقوق کو پامال نہیں کرسکتا۔اس تصور نے، مسلمانوں کیلئے، قانون کی حکمرانی پر مبنی ایک تہذیب تخلیق کرنے کی گنجائش پیدا کی۔

یہاں ہمیں اس بات پر غور کرنے کیلئے رُکنا چاہیے کہ ''قانون کی حکمرانی'' کا مطلب کیا ہے۔

قانون کا اور اُس قوت حاکمہ کا فقدان جو اسے نافذ کرسکے، آسانی سے افراتفری اور بدنظمی کی طرف لے جاسکتا ہے، جس کے تحت انسانوں کے حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔لیکن محض قانون اور ایک قوّتِ نافذہ کا وجود لازمی طور پر ایک نعمت نہیں ہے، کیونکہ خود قانون بھی غیر منصفانہ اور ظالمانہ ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر، سٹالن کے تحت قانون کی حکمرانی ہولناک تھی۔اُس صورت میں، قانون کا مقصد افراد کے حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کرنا نہیں تھا بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے نظریات اور مفادات کا تحفظ تھا۔جب کبھی بھی کوئی حکمران یا اُمرا شاہی اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے قانون بناتے ہیں، تو ''قانون کی حکمرانی'' غیر منصفانہ اور غیر آزادانہ ہوگی۔

تو لہٰذا، جو کچھ مطلوب ہے وہ قانون کی ایسی حکمرانی ہے، جس کا مقصد حکمرانوں یا مراعات یافتہ طبقے کے حقوق کی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حقوق کی حفاظت کرتا ہو۔قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہی کچھ تھا جو دُنیائے اسلام میں قانون کا مطلب تھا اور اس کا بنیادی لفظ وہ تھا جو کہ حال ہی میں ایک

بُرا لفظ بن گیا ہے: شریعہ، سختی سے بات کی جائے تو شریعہ کا ترجمہ ہے ''راستہ'' ''یا طریقہ'' لیکن وہ تاریخی معنی جو اس نے حاصل کر لئے ہیں، وہ ہیں ''اسلامی قانون''، جیسا کہ یہ مسلم علما کی طرف سے قرآن اور سنت پیغمبر کے حوالے سے ترکیب دیا گیا۔

شریعت کی یہ تعریف عام طور پر معلوم ہے، لیکن وہ بنیادی نکتہ جس کی یہ نشاندہی ہے عموماً آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے: یہ امر کہ شریعت کی تشکیل (یا زیادہ صحیح طور پر اس کی دریافت'') علما کی طرف سے کی گئی، یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کا حکم ریاست کی طرف سے نہیں دیا گیا، اگر اس کا حکم ریاست کی طرف سے دیا گیا ہوتا، تو غالباً رومی قانون کی طرح ہوتا، جس کا آغاز یہ بیان کرنے سے ہوتا تھا، ''شہزادہ قانون کا پابند نہیں ہے'' (۱۲) لیکن دُنیائے اسلام میں، تمام حکمران گہرے طور پر قانون کے پابند ہوتے تھے، کیونکہ قانون پہلے سے موجود ہوتا تھا، اور اُن کے اقتدار سے بلند ہوتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ قانونی چارہ جوئی سے مامونیت...... جو آج تک، بادشاہوں، سربراہان ریاست، مجالسِ قانون ساز کے ارکان، اور سفارت کار، کو دوسرے قانونی نظاموں میں حاصل ہے...... وہ شریعہ میں بالکل معدوم ہے۔موخرالذکر کے تحت کوئی بھی شخص مامون نہیں، اور ہر شخص برابر ہے۔(۱۳)

نتیجے کے طور پر، اسلام کے آغاز سے ہی، شریعت نے من مرضی کی حکمرانی پر ایک رُکاوٹ کے طور پر کام کیا اور انصاف کی محافظ بن گئی۔

خلفائے راشدین کے زیرِ حکومت، ابتدائی تیس سال کے بعد، اُمہ کی سیاسی قیادت حکمران خاندانوں کے ہاتھ میں آگئی، جن کے ارکان اکثر اخلاقیات کے اعلیٰ معیاروں سے نہیں، بلکہ اُس چیز سے حکومت کرتے تھے جسے سینٹ آگسٹائین نے (Libido dominandi) اقتدار کی ہوس کا نام دیا یہ شریعت اور اس کے حامل علما تھے، جو ان کے ظلم کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتے تھے۔(اس وجہ سے، بہت سے مسلم معاشروں میں شریعت کا بہت گہرا احترام پایا جاتا ہے......ایسا احترام جو اکثر اوقات مغرب کے لوگوں کو پریشان کردیتا ہے) کچھ آزاد خیال نظریہ سازوں نے، اسلامی قانون کے اس عمل اور یورپ کی ''قانون فطرت'' کی روایت کے درمیان، جس پر آزاد خیال سیاسی روایت کا انحصار ہے (۱۴) ایک متوازیت، تلاش کی ہے۔

درحقیقت یہ نظریہ ہمیشہ کام نہیں کرتا تھا۔بعض مواقع ایسے ہوتے تھے جب علماء حاکمانِ

MashalBooks.org

وقت کے مطالبات کے آگے ہتھیار ڈال دیتے تھے، اور اُنہیں اُن کی خواہشات کے سلسلے میں حمایت بہم پہنچاتے تھے (۱۵) لیکن بعض دوسرے مواقع پر وہ جبر کے سامنے ایک مضبوط رُکاوٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ جب ہندوستان میں چودھویں صدی کے ایک مسلمان حکمران، علاوالدین خلجی نے، اپنی ہندو رعایا پر بھاری ٹیکس عائد کرنا چاہا، تو اُسے اُس کے سب سے بڑے عالم کی طرف سے ایسا کرنے سے باز رکھا گیا، کیونکہ ایسا کرنے سے، اسلام کی طرف سے تسلیم شدہ جائیداد کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی۔ خلجی نے یہ شکایت کی، ''جب کبھی میں اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تو کوئی نہ کوئی مجھے بتانے آجاتا ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے'' (۱۶)

اسی طرح، سلطنتِ عثمانیہ میں، چودھویں اور اوائل بیسویں صدی کے درمیان، شریعت نے ''بالائی طبقے کے آلۂ کار کے طور پر کام نہیں کیا'' اسرائیلی مورخ ہیم گربر (Haim Gerber) کے الفاظ میں، بلکہ بطور ''زیریں طبقات کے لوگوں کے، اپنے آپ کو، اونچے طبقے کی ممکنہ زیادتیوں کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے ایک ذریعے کے'' (۱۷) گربر، جس نے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے عثمانی عدالتوں کے فیصلوں کا مطالعہ کیا تھا، عثمانی مفتیوں (سرکاری منصفین) کی مثالوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو باوجود حکومت کے تنخواہ دار ہونے کے، ''حکومت کے خلاف کھل کر بات کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے، جب کبھی اُن کا سامنا کسی ناانصافی سے ہوتا تھا۔'' (۱۸)

ایک دلچسپ مثال وہ جواب تھا، جو سترھویں صدی کے مقامی مفتی نے، فلسطین میں ایک مقامی گورنر کو دیا، جو لِد کے قصبے (آج کل لود) میں آنے والے مہاجرین کو اپنے گاؤں میں واپس جانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ مفتی کے فتویٰ میں بیان کیا گیا:

> ''ان لوگوں کو، اُس شہر سے، جسے اُنہوں نے اپنا گھر بنالیا ہے اور جس کے وہ خوگر ہو چکے ہیں، ہجرت کرنے پر مجبور کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی...... کیونکہ مومن اپنی روح کا مالک ہوتا ہے: وہ جس ملک کو مناسب سمجھے، اور جس شہر کا انتخاب کرے، وہاں رہ سکتا ہے۔ کسی بھی قوم اور مذہبی طبقے میں، اُنہیں پریشان کرنے اور وہاں سے نکلنے پر مجبور کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ (۱۹)

گربر کے مطابق، یہاں شریعت کا اصول بلا مغالطہ انفرادیت پسندانہ تھا: ''ریاست کے

حقوق کی فرد کے حقوق کے مخالف ہونے کی تصویر کشی کی گئی ہے اور موخرالذکر کو برتر پایا گیا ہے'' (۲۰)

یہی وجہ ہے کہ پوری عثمانیہ صدیوں کے دوران، جب بھی سلطنت اور مقامی گورنر اپنی رعایا کے حقوق کو پامال کرنے کی جرأت کرتے، تو لوگوں کے، ہجوم احتجاج کرنا شروع کردیتے، نعرے لگاتے ہوئے ''ہم شریعت چاہتے ہیں'' وہ محض انصاف کا مطالبہ کر رہے ہوتے تھے۔

سنگساریاں، کوڑے اور تلواریں

بہت سے جدید مغربی لوگ، جو شریعت کے بارے میں کوئی مثبت بات سُنتے ہیں، تو فوری طور پر سوال اُٹھاتے ہیں، ''لیکن کیا شریعت ایک بہت وحشیانہ قانونی نظام نہیں ہے، جو مجرموں کو کوڑے لگانے، ہاتھ کاٹنے اور سنگسار تک کرنے کا حکم دیتا ہے؟'' وہ یہ اعتراض اُٹھانے میں ٹھیک ہوں گے، کیونکہ بہت سے ہمعصر مسلمان، جو شریعت کو نافذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں: اس کی قرونِ وسطیٰ کی شکلوں کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں، جس میں وہ جسمانی سزائیں شامل ہوتی ہیں، جو جدید معیارات کی رُو سے واقعی وحشیانہ ہیں۔

لیکن قرونِ وسطیٰ میں، معیارات بہت مختلف تھے، اور اسلامی قانون درحقیقت ہارورڈ لا سکول میں پروفیسر، نوواح فیلڈمین (Noah Feldman) (۲۱) کے مطابق ''دنیا میں کہیں بھی موجود قانونی ضابطوں میں سے سب سے زیادہ آزاد اور انسانی ہمدردی پر مبنی ضابطے پیش کر رہا تھا''

فیلڈمین یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ شریعت کی سخت جسمانی سزائیں، ثبوت کے بہت اعلیٰ معیارات کا تقاضا کرتی تھیں اور ایک خصوصی تناظر کیلئے تشکیل دی گئی تھیں؟

''جدید دور سے پہلے کسی معاشرے کے پاس بھی وہ چیز نہیں تھی، جسے آج ہم ایک مکمل ترقی یافتہ پولیس کا محکمہ کہتے ہیں، اور قدیم اسلامی آئینی نظام کے پاس بھی، عمومی طور پر، ایسے افسروں کی محض تھوڑی سی تعداد تھی جو عام قوانین کے نفاذ کے ذمہ دار تھے۔ انتہائی قسم کی اور نظر آنے والی سزائیں، عوام سے قانون کی پیروی کرانے کیلئے نمایاں یاددہانیوں کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، اگر کسی غلط کام کیلئے پکڑے جانے اور سزا دیئے جانے کے امکانات کم ہوں، جیسا کہ وہ کسی نظام میں جو پولیس نظام کے بغیر ہو خاص طور پر کم ہوں گے، تو پھر سزا کو اتنا زیادہ

رکھا جانا چاہئے کہ اُس کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اتنا اثر پیدا کرے کہ مُجرم کو جُرم سے باز رکھا جا سکے۔ شریعہ کی جسمانی سزائیں واضح طور پر، اصلاً ایسی ہی، بہت محدود نفاذ والی دُنیا کیلئے تشکیل دی گئی تھیں...... بہت حدتک انگریزی عام قانون کی مانند، جو ہر سنگین جُرم کو موت کی سزا دیتا تھا۔ (۲۲)

مورخ مارشل ہوجسن (Marshall Hodgson) اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں ''قبل جدید نظریے کے لحاظ سے'' شریعہ حقیقتاً ''نرم'' تھی۔ ایک ایسے دور میں جبکہ تشدد، مشکوک لوگوں سے نبٹنے کا معیاری طریقہ تھا، اسلامی قانون بلکہ ''مجرموں کے حق میں خطرناک حدتک نرم محسوس ہوتا تھا'' (۲۳)

اس بات پر توجہ دینا بھی اہم ہے کہ قید کی سزا کی بجائے جسمانی سزا کو نافذ کرنا، اُن حالات میں جن میں اسلام کی ابتدا ہوئی، واحد قابلِ عمل تھا۔ عرب صحرا میں، قید ایک انتہائی نا قابلِ عمل، تقریباً ناممکن طریقِ کار تھا۔ ''یہ اُن لوگوں کی بجائے جن پر یہ واقع ہونی تھی، اُن لوگوں کے لیے زیادہ بوجھ کا باعث تھی، جنہیں اس کو نافذ کرنا تھا۔'' (۲۴)

آج، مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ تر شریعت کے ہم عصر حامی، ان تاریخی حالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ایک ایسے لفظی نفاذ پر اصرار کرتے ہیں، جو اس کے مقاصد سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ چودھویں صدی میں امام الشاطبی نے، شریعہ کے مقاصد یا ''اعلیٰ نصب العینوں'' کو علیحدہ علیحدہ کیا تھا، اور محض پانچ بنیادی اقدار کی حفاظت پر مشتمل اُن کی فہرست بنائی: زندگی، مذہب، جائیداد، اولاد اور دانش (۲۵) جدید مذہبی علما، جیسا کہ اسلامی قانون کے پاکستانی نژاد عالم مرحوم فضل الرحمٰن، طویل عرصے سے یہ استدلال کر رہے ہیں کہ آج مسلمانوں کو اس چیز کی ضرورت ہے کہ وہ ان ''اعلیٰ مقاصد'' کو نا کہ اُن علمی معمولات کو، جن کے ذریعے ایک ہزار سال پہلے ان مقاصد کو بروئے کار لایا گیا، غیر متبدل معیار بنا کر شریعت میں اصلاح کریں'' (۲۶)

شریعت میں دوسرے مسائل، جیسا کہ زن بیزاری، اس امر سے پیدا ہوتے ہیں کہ اسلامی قانون نے، اپنی تشکیلی صدیوں میں بہت سے قدیم رویوں، رواجوں، اور روایات کو اپنے اندر جذب کیا۔ سنگساری، جس کی قرآن میں کوئی بنیاد نہیں، غالباً یہودیت سے آئی۔ (۲۷) آنے والے ابواب میں ہم جائزہ لیں گے کہ اسلامی قانون کی بعد قرآن کی یہ درشتی کیسے واقع ہوئی۔

جنگ کے اصول

آج کل مغرب میں اسلام کے بارے میں اور خاص طور پر شرعی ذہن والے مسلمانوں کے بارے میں ایک عام دلچسپی دہشت گردی سے ہے۔

لیکن قرونِ وسطیٰ میں شریعہ، درحقیقت، اُس چیز جسے آج ہم دہشت گردی، یعنی ''دشمن کے غیر لڑا کا لوگوں کو شعوری طور پر نشانہ لگا کے مارنا کہتے ہیں، کے خلاف ایک بند کا کام کرتی تھی۔ اسلامی علما نے محنت کر کے، منصفانہ جنگ کا ایک تفصیلی نظریہ پیش کیا تھا، جس نے عام شہریوں کی زندگیوں کو احترام دینے اور بچانے کیلئے بہت عرق ریزی کی تھی۔ شرقِ اوسط کے ممتاز مورخ، برنارڈ لیوس درج ذیل بیان کرتے ہیں:

''جہاد میں لڑنے والوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عورتوں، بچوں، اور سن رسیدہ لوگوں کو اُس وقت تک قتل نہ کریں جب تک کہ وہ پہلے حملہ نہ کریں، قیدیوں پر تشدد نہ کریں اور نہ اُن کا مثلہ کریں۔ معاہدے کے بعد دشمنیوں کو بحال کرنے کیلئے صاف طریقے سے تنبیہ کریں، اور معاہدوں کا احترام کریں۔ قرونِ وسطیٰ کے فقہا اور مذہبی علما، جنگ کے اصولوں پر تفصیلی بحث کرتے ہیں، بشمول ایسے سوالات کے کہ کیسے ہتھیاروں کی اجازت ہے اور کیسے ہتھیاروں کی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ کے متون میں، میزائیلوں اور کیمیائی جنگ کے جواز کے بارے میں بھی کچھ بحث ہے، ایک بحث منجنیقوں (میزائل پھینکنے والے) اور گوپھنوں کے بارے میں ہے، اور دوسری زہر آلود سرے والے تیروں اور دشمن کے پانی کے ذخیروں کو زہر آلود کرنے کے بارے میں...... کچھ فقہا ان ہتھیاروں کی اجازت دیتے ہیں، کچھ پابندی لگاتے ہیں اور کچھ ناپسند کرتے ہیں۔ اس بارے میں فکر مندی کی وجہ وہ بلاامتیاز اموات ہیں جو یہ پیدا کرتے ہیں۔'' (۲۸)

لیوس مزید کہتا ہے، ''اسلام کے بنیادی متون کسی موقع پر بھی دہشت گردی یا قتل کا حکم نہیں دیتے۔ کسی بھی مقام پر...... وہ غیر ملوث راہگیروں کے بلاسوچے سمجھے قتلِ عام کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔'' (۲۹)

اسلامی علما نے، غیر جنگجو لوگوں کے شعوری قتل کی غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کی ہے، کیونکہ

MashalBooks.org

قرآن نے حکم دیا تھا: اللہ کے راستے میں اُن لوگوں کے ساتھ لڑو جو تمہارے ساتھ لڑیں، لیکن حدود سے آگے مت بڑھو'' (۳۰) اور پیغمبرؐ کا، اپنے دستوں کو یہ فرمان ریکارڈ پر ہے، ''زیادہ عمر رسیدہ، شیر خوار، چھوٹے بچوں یا عورتوں کو قتل مت کرو۔'' (۳۱) اس طرح جنگ کے اسلامی اصول وجود میں آئے، ایک ایسی چیز جسے آج کل کے اسلام پسند دہشت گرد نظر انداز کرنے اور اُن سے کنی کترانے کے لئے سخت محنت کر رہے ہیں۔ (۳۲)

اخلاقی جنگ کے بارے میں قرونِ وسطیٰ کی اسلامی فکرمندی نے اس وقت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے، جب اس کا موازنہ، مسلمانوں کے بعد دشمنوں کی طرف سے بروئے کار لائی جانے والی، بے وجہ کی قتل وغارت کے ساتھ کیا جائے، جیسا کہ منگول حملہ آوروں اور صلیبی جنگجوؤں کی طرف سے کی جانے والی قتل وغارت، جب صلیبی جنگجوؤں نے ۱۰۹۹ میں یروشلم کو تاراج کیا، تو اُنہوں نے مقامی آبادی کو بلا امتیاز قتل کیا۔ ''اُنہوں نے تمام عربوں اور ترکوں کو، جو ان کے سامنے آئے قتل کر دیا'' زکور تھے یا اناث قتل کیا'' (۳۳) ایسی ہی زیادتیاں بعد والے صلیبی جنگجوؤں جیسا کہ رچرڈ دی لائن ہارٹ (Richard the Lionheart) کی طرف سے بھی جاری رکھی گئیں۔ جس نے یہ حکم دیا کہ کوئی ۲،۷۰۰ مسلمانوں، بشمول عورتوں اور بچوں کے، ایک ایک کر کے ایکر کے قلعے پر قتل کر دیئے جائیں۔

جوابی طور پر، صلاح الدین کی قیادت میں مسلمان فوجوں نے، نہ صرف غیر لڑاکا لوگوں کو معاف کر دیا، بلکہ بہت سے جنگی قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ جب صلاح الدین نے ۱۱۸۷ میں یروشلم کو دوبارہ فتح کیا، تو شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور صرف ''دو فرنگیہوں کو'' جو کہ یورپ کے عیسائی تھے، نکالا گیا، جبکہ مشرقی عیسائیوں کو رہنے کی اجازت دی گئی۔ ایک معمولی سا فدیہ مقرر کیا گیا، لیکن اُن لوگوں کو جو اس کی استطاعت نہیں رکھتے تھے معاف کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ صلاح الدین نے کچھ فرنگیوں کا فدیہ اپنی ذاتی خیرات میں سے ادا کیا۔ عیسائی اس رحمدلی سے اس قدر مثبت طور پر متاثر ہوئے کہ یورپ میں داستانیں مشہور ہو گئیں کہ صلاح الدین کو بطور عیسائی بپتسمہ دیا گیا تھا، اور اسے ایک عیسائی سورما کا نام دیا گیا۔ (۳۴)

درحقیقت، وہ ایک ایسا مسلمان حکمران تھا، جو شریعہ کی پابندی کرتا تھا۔

اسلامی آزاد منڈی......اور اس کی ایجادات

شریعت کی ایک اور نعمت جائیداد کے حقوق کی حفاظت تھی۔ اگر کوئی حکمران جائیداد کو غضب کرنے کی طمع اپنے اور پاتا تو، اس کے آگے ''نجی ملکیت کی حُرمت اور اسی سے مربوط چوری کی ممانعت کی شریعت کی طرف سے توثیق روک بن کر کھڑی ہو جاتی تھی'' قانون کی حفاظت کو مزید مستحکم کرنے کیلئے، علما نے وقف کے قانونی اصول کا ایک متن ترتیب دیا تھا۔ اس چیز نے خیراتی ادارے، وقف کی تخلیق کے ذریعے سے، دولت کی نسلوں میں منتقلی کو جواز بخش دیا، جو کہ قانونی طور پر حکومت مداخلت سے محفوظ تھا۔ (۳۶)

اس کا نتیجہ ''ایک توانا، اور مضبوط شہری معاشرہ'' تھا، جس میں خیراتیں، ہسپتال، اور سکول شامل تھے......جن کی مدد نجی اداروں کی طرف سے کی جاتی تھی۔ جو شریعت کی حفاظت میں ہوتے تھے (۳۷)

اسلام نے نہ صرف دولت کی حفاظت کی ضمانت دی، بلکہ معاشی سرگرمی کے ذریعے اس کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی۔ قرآن نے کام اور تجارت کو پروان چڑھایا، اور تجارتی منافع کو ''خُدا کا فضل'' قرار دیا۔ (۳۸) پیغمبرؐ جو کہ خود ایک تاجر تھے کہ ایسے فرمان ریکارڈ پر ہیں جیسا کہ: ''وہ شخص جو دولت پیدا کرتا ہے، خُدا کو راضی کرتا ہے'' (۳۹) یہ بات بھی معلوم ہے کہ آپ نے قیمتوں کے تعین کے مطالبات کو مسترد کر دیا، یہ کہتے ہوئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی منڈی کو کنٹرول کرتا ہے۔ (۴۰) جیسا کہ فرانسیسی مورخ میکزائم روڈنس واضح طور پر کہتا ہے: ''محمدؐ سوشلسٹ نہیں تھے'' (۴۱)

اس حوصلہ افزائی کے ساتھ، دنیائے اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں شرقِ وسط کے تاجروں کو ''ایک وسیع آزاد تجارتی علاقے (زون)'' میں مربوط کر دیا۔ (۴۲) اور ''مالیاتی اور تجارتی سرمایہ داری'' قائم کی (۴۳) مسلمان علما نے کچھ معاشی معمولات اور تکنیکیں ایجاد کیں جو جلد ہی یورپ پہنچ گئیں۔ سود پر مذہبی پابندی کے خلاف جائے بغیر منافع وصول کرنے کا طریقہ مُحاترا جلد لاطینی کا mohatra بن گیا۔ عربی اصطلاح مضاربہ، جو ایک کاروباری شراکت کی طرف اشارہ کرتی ہے، بہت ممکنہ طور پر اطالوی Commenda کی اصل ہے، جو جدید ''لمٹیڈ کمپنی'' کا پیشرو ہے۔ (۴۴)

MashalBooks.org

عربی اصطلاح سَک، کا سفر، جس کا مطلب ''تحریری دستاویز ہے، اور اُن کاغذات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو قرونِ وسطیٰ کے مسلمان تاجر کرنسی کی جگہ استعمال کرتے تھے، اور زیادہ واضح ہے: یہ فرانسیسی لفظ چیک (Cheque) اور انگریزی لفظ چیک (Check) کی اصل ہے۔ (۴۵)
یہ محض چند مثالیں ہیں۔ فرنینڈ براوڈیل (Fernand Braudel) جو کہ عظیم فرانسیسی مؤرخ ہے بیان کرتا ہے، ''مغربی سرمایہ داری میں برآمدی اصل کی کوئی بھی چیز اسلام سے آئی ہے۔'' (۴۶) یہ کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے کہ بارھویں صدی کے سپین کے عظیم یہودی عالم اور فلسفی میمونیڈیز (Maimonides) نے یہ شکایت کی کہ یہودی تاجر، ''اسلامی طریقے پر'' کاروبار کر رہے ہیں۔ (۴۷)

یہ بات تاریخ دانوں کے درمیان اکثر زیرِ بحث رہتی ہے کہ ''مغرب کس حد تک اسلام کا مرہونِ منت ہے'' مثال کے طور پر ایک دلچسپ نظریہ یہ ہے کہ برطانوی عام قانون کی اصل اسلام ہے، جو واضح طور پر اپنی ''منصف ساختہ'' نوعیت میں شریعہ سے مشابہت رکھتی ہے...... براعظم یورپ کی ریاست کی طرف سے عائد کردہ رومن قانون کی روایت سے مختلف۔ (۴۸) لیکن دُنیائے اسلام سے مغرب میں آنے والی واحد نمایاں درآمدات کو آج کل آسانی سے اُن انگریزی الفاظ میں کھوجا جاسکتا ہے جن کی اصل عربی ہے۔ ایک مختصر فہرست میں شامل ہوں گے، الجبرا، الکیمی، الکلی، آلمینک، ایمیلگم، ایلمبک، ایڈمرل، الکوو، ماسک، مسلن، نادر، زینتھ، ٹیرف، شوگر، سیرپ، چیک میٹ، لیوٹ اور گٹار۔ (۴۹) اور پھر بلاشبہ عربی اعداد بھی ہیں۔

ایک بُردبار مذہب

مغرب دُنیائے اسلام سے ایک سبب کے تحت چیزیں درآمد کر رہا تھا۔ آٹھویں سے لے کر تیرھویں صدی تک، موخر الذکر ''دُنیا کا سب سے امیر، سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ تخلیقی، سب سے زیادہ روشن علاقہ تھا'' (۵۰) مسلمان سائنسدانوں نے طبیعیات، کیمیا، حیوانیات، طبِ اور فلکیات اور بصریات کے میدانوں میں بہت اہم دریافتیں کیں۔ (۵۱)
ایک امریکی مورخ استدلال کرتا ہے کہ ''اگر ۱۰۰۰ء میں نوبیل انعامات ہوتے، تو تقریباً کُلی طور پر مسلمانوں کے حصے میں آتے۔'' (۵۲) اسلامی مذہبی علما نے بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل

سے نمٹنے میں پہل کر لی تھی، جن کے ساتھ، اُن کے عیسائی ثنیٰ بہت بعد میں نمٹنے والے تھے۔ (۵۳) اسلامی شہر یورپی شہروں کی نسبت بہت زیادہ صاف ستھرے اور زیادہ سلجھے ہوئے تھے۔ اسی سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ دسویں صدی میں ایک راہبہ اُس وقت کے مسلمانوں کے زیرِ نگیں سپین کے ایک شہر قرطبہ سے کیوں اتنی متاثر تھی کہ اُس نے اسے ''دُنیا کا زیور قرار دیا''۔ (۵۴)

وہ آزادی جو اسلام نے مشرقی اقوام کو دی، اور وہ انداز جس سے اس نے فرد کو تحریک دی، وہ اس عظمت میں فیصلہ کُن تھے۔ یہ ''ایک غیر معمولی طور پر لچکدار سماجی نظام تھا۔ جو کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو جاتا اپنی صلاحیتوں کو اُس پیمانے پر پروان چڑھانے کا موقع فراہم کرتا، جو قبل جدیدیت کے معیارات سے نسبتاً آزاد تھا'' (۵۵) اس لچک کا ایک نتیجہ تیزی سے شہری زندگی کو اپنانا تھا۔ اس کی انفرادیت کے طفیل، اسلام نے قابلِ شناخت طور پر شہر کے عروج کیلئے راستہ ہموار کیا، جس میں، ایک دوسرے سے لاتعلق نسلی طور پر متنوع شہری، قانونی اور ذاتی طرزِ عمل کے مسلمہ ضابطوں کے تحت، ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعامل کرتے تھے۔'' (۵۶) اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ۸۰۰ء تک ''شرقِ اوسط میں پچاس ہزار سے زیادہ آبادی والے تیرہ شہر تھے، جبکہ یورپ میں صرف ایک شہر...... روم تھا'' (۵۷)
اس کامیابی کے ہوتے ہوتے، یورپ کی طرف سے تعریف بھی آئی اور تلخی بھی۔ نویں صدی میں، عیسائی پادری پال الوارس (Paul Alvarus) نے موخر الذکر کا اظہار کیا، جب اُس نے غصے سے لکھا:
''عیسائی عربوں کی نظموں اور بہادری کی کہانیوں کو پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ عرب مذہبی علما اور فلسفیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اُن کی تردید کرنے کیلئے نہیں بلکہ ایک صحیح اور باوقار عربی تشکیل دینے کیلئے۔ اب وہ عام آدمی کہاں ہے جو، مقدس صحائف پر لاطینی تبصرے پڑھتا ہے، جو مذہبی کتب یا انبیا و پیغمبروں کو پڑھتا ہے۔ افسوس؟ تمام باصلاحیت نوجوان عیسائی جوش و جذبے کے ساتھ عربی کتابیں پڑھتے ہیں اور اُن کا مطالعہ کرتے ہیں۔'' (۵۸)
اُن عیسائیوں کو، جو مسلم کلچر سے مسحور تھے، جلد ہی اپنے قدامت پرست ہم مذہبوں کی طرف سے موزارب (Mozarab) کا نام دیا گیا...... ایک ایسی اصطلاح جس کا لفظی ترجمہ ''عرب

MashalBooks.org

پرفریفتہ'' (۵۹) ہوتا ہے۔ اس کی قابلِ فہم وجوہات تھیں۔ خلیفہ الحکم ثانی کے عہد میں، دسویں صدی میں، قرطبہ کی لائبریری میں چار لاکھ مسودات کا ہونا بتایا جاتا ہے، جبکہ فرانس کے چارلس پنجم، ''ذہین چارلس'' کی لائبریری میں، جو چار صدی بعد میں تھا۔ صرف ۹۰۰ کتابیں تھیں۔ (۶۰)

قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کیلئے اسلام کی ایک اور کشش یہ تھی کہ بہت آسانی والا مذہب محسوس ہوتا تھا۔ ''اسلام کی سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ یہ عملی تھا: یہ بظاہر مافوق البشر قسم کی کوششوں کا تقاضا نہیں کرتا تھا''، قدامت پرست عالم نکولس زرنوف (Nicolas Zernov) کہتا ہے:

''اسلامی فتوحات کے موقع پر عیسائی مشرق انسانی فطرت کی حدود کو بھول چکا تھا۔ کلیسا کے بہت سے ارکان فرشتوں کی پیروی کرنا چاہتے تھے: یہی وجہ ہے کہ راہبوں اور راہبات کی جنس سے پاک زندگی کی طرف اجتماعی تحریکیں چلیں: اسی وجہ سے شہروں اور گاؤں سے صحراؤں کی طرف آبادی کا انخلا ہوا: اسی وجہ سے خود کو مارنے کے کرتب ہوتے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے۔

انسان، روح کے حکم پر اپنے جسموں کو کس حد تک دبا سکتے تھے۔ ان مشرقی زاہدوں میں سے کچھ لوگ صرف کھڑے ہونے کی حالت میں نیند کرتے تھے، دوسرے اپنے آپ کو تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس کرتے تھے یا ستونوں پر رہتے تھے، یا صرف جڑی بوٹیاں کھاتے تھے، اور وہ بھی ایک ہفتے میں ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں۔

اسلام نے ان تمام تجاوزات کو روک دیا۔ اس نے جنس کے مبالغہ آمیز خوف کو بھگا دیا، زہد کو دُھتکار دیا، اُن لوگوں کیلئے جو تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے جہنم کے خوف کو دُور کر دیا، اور مذہبی چھان بین کی تسکین کی۔ (۶۱)

عیسائیوں کا ''جنس کا مبالغہ آمیز خوف'' جدید دور تک رہا، جبکہ دُنیائے اسلام، پھر جدید دور تک زیادہ جنس دوست رہی۔ یہاں تک کہ شریعہ کے زیادہ قدامت پسند علما نے ''عورتوں کے جنسی مسرت کے حق'' کے بارے میں لکھا'' (۶۲) جنسوں کے درمیان دوستی کے بارے میں رویے بھی، قبل جدیدیت اسلامی دُنیا اور مغرب میں نمایاں طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ جہاں قبل جدیدیت کے دور میں مغرب کے لوگ جنسی عمل کو ایک ایسے ''میدانِ جنگ'' کے طور پر دیکھتے تھے جہاں مرد عورتوں پر اپنی برتری کا اظہار کرتے ہیں، مسلمان اسے ''ایک محبت بھری مشترکہ مسرت'' کے طور پر دیکھتے تھے۔ مسلمان یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ ''جنسی تسکین ایک ہم آہنگ سماجی

نظام اور ایک ارتقا پذیر تہذیب پر منتج ہوتی ہے''(۶۳)

قرونِ وسطیٰ میں اسلامی اور عیسائی ثقافتوں کے درمیان یہ تفاوت، اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب آدمی غور کرتا ہے کہ اُس وقت سے لے کر معاملات کیسے بالکل اُلٹ ہو گئے ہیں۔ آج یہ مسلمان مذہبی رہنما ہیں جو اپنے نوجوانوں سے دلکش مغربی ثقافت سے مسحور ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ اسلام ہے جسے ایک انتہائی سخت، منضبط، اور بلکہ بعض اوقات خود کو اذیت دینے والا مذہب سمجھا جاتا ہے اور یہ اسلامی معاشرے ہیں جو اکثر اوقات جنس کے خوف میں مبتلا محسوس ہوتے ہیں۔

آج، یہ مغرب ہے جو آزاد ہے، آسانی والا ہے اور دولت مند ہے اور یہ دُنیائے اسلام ہے جو واضح طور پر ایسی نہیں ہے۔

لیکن کیوں؟ کیا واقع ہوا؟ اگر اسلام نے مشرق کو اتنے قابلِ ذکر طریقے سے روشنی بخشی، تو پھر غلطی کہاں ہوئی؟

MashalBooks.org

باب 3

قرونِ وسطیٰ کی نظریات کی جنگ (ا)

آزاد سیاست، ایک [مذہبی] قومیت کے ساتھ......ناموافق ہے، جب تک کہ مزید یہ یقین نہ ہو کہ اُس قومیت کے افراد اپنے خالق کی طرف سے معقولیت اور آزادانہ رائے سے نوازے گئے ہیں، اور یہ کہ اُنہیں اس بات کا یقینی علم نہ ہو کہ خالق کے ارادے کیا تھے/ہیں۔

......لیونارڈ بائنڈر (Leonard Binder)، اسلامِک لبرلزم

یہ سن ۶۵۷ کا جولائی کا ایک جھلسا دینے والا دن تھا، اور دریائے فرات کے کنارے ناممکن طور پر خشک تھے۔ صفین نامی مقام پر ایک حیرت انگیز منظر تھا: دو مسلمان فوجیں ......دونوں ہزاروں جوانوں پر مشتمل، تلواریں اور نیزے اُٹھائے ہوئے......ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔ ایک کی قیادت، چوتھے خلیفہ اور حضرت محمدؐ کے عم زاد اور داماد، حضرت علیؓ کر رہے تھے، دوسری کی قیادت شام کے نومفتوحہ صوبے کے گورنر حضرت معاویہؓ کر رہے تھے......شام کا صوبہ ایک وسیع علاقہ تھا جس میں جدید دور کا شام، اسرائیل/فلسطین اور اُردون شامل تھا۔ یہ تنازعہ ایک سال قبل شروع ہوا تھا، جب تیسرے خلیفہ کے طور پر حضرت علیؓ کے پیشرو حضرت عثمانؓ مسلمان باغیوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی جگہ لے لی تھی، لیکن

معاویہؓ نے جو حضرت عثمانؓ کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، حضرت علیؓ پر قاتلوں کو سزا دینے میں ناکامی کا الزام عائد کر دیا۔ اُنہوں نے اپنی خلافت کا اعلان بھی کر دیا......اسلام میں پہلے فتنہ (خانہ جنگی) کا آغاز ہوا۔

دونوں فوجوں نے صفین (موجودہ شام میں)، تقریباً تین ماہ تک خیمے گاڑے رکھے، یہ انتظار کرتے ہوئے کہ اُن کے عمائدین کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ ایسا کرنے کے قابل نہ ہونے پر، حضرت علیؓ نے بھرپور حملے کا حکم دے دیا، جس میں آپ نے خود بھی اپنی روایتی بہادری کے ساتھ شرکت کی۔ صفین کی لڑائی تین دن تک جاری رہی، اموات کی شرح بہت بلند ہوگئی، بعد میں حضرت علیؓ کے حامی فتح حاصل کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

حضرت معاویہؓ کی جنہوں نے اپنے خیمے سے لڑائی کو دیکھنے کی ترجیح اختیار کی، نااُمیدی بڑھتی گئی۔ لیکن اُن کے پاس ایک آخری حربہ تھا۔ اپنے مشیروں میں سے ایک مشیر کی تجویز سے متاثر ہوکر آپ نے اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ اپنے نیزوں کی انیوں پر قرآن کریم کے صفحات کو رکھ کر، یہ آواز لگائیں، ”اللہ کا قانون! یہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا!“ اس نعرے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں اطراف جنگ بند کر دیں اور معاملات کا فیصلہ پُرامن ثالثی کے ذریعے کریں۔ حضرت علیؓ کے بہت سے سپاہی اس پُکار کی مزاحمت نہ کر سکے۔ لہٰذا تلواریں گر گئیں اور مذاکرات بحال ہوگئے۔

لیکن یہ حکمتِ عملی بھی ناکام ہوگئی۔ یہ ثالثی جو جنگ کے چند ماہ بعد تک ٹھیک رہی، غیر فیصلہ کُن طریقے سے ختم ہوگئی، اور دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہی رہے۔ اس کا عملی حل، حسبِ سابق حالت کو برقرار رکھنا تھا: معاویہؓ شام پر حکومت کریں گے، جبکہ علیؓ باقی ماندہ مسلم علاقوں ......عرب، عراق اور ایران پر حکومت کریں گے۔

وقت کے ساتھ ساتھ حضرت علیؓ کے پیروکار ”علیؓ کے حامی“ یا شیعان علی، یا محض شیعہ کے طور پر جانے جانے لگے۔ حضرت معاویہؓ، جو حضرت علیؓ کے بعد زندہ رہے، نے اُمیہ خاندان کی بنیاد رکھی، جس نے دُنیائے اسلام پر اگلے نوے سال تک حکومت کی۔ بڑا اسلامی دھارا جو اس سلطنت کے تحت تشکیل پایا سُنی کہلانے لگا۔

ایک تیسرے مسلم دھڑے کا آغاز، سپاہیوں کے ایک گروہ سے ہوا۔ جو حضرت علیؓ کی فوج

MashalBooks.org

سے اس وقت علیحدہ ہوگیا، جب آپ نے معاویہؓ کے ساتھ مصالحت کو قبول کرلیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک ایسے معاملے میں، جس کا تعلق صرف خُدا سے تھا، ''انسانی مداخلت'' الحاد ہے...... جلد ہی اس دھڑنے نے علیؓ اور معاویہؓ کو کافر قرار دے دیا اور دونوں کے خلاف لڑنے کی قسم کھائی۔ اُنہیں خارجی یا ''علیحدہ ہونے والے'' کا نام دیا گیا، جنگِ صفین کے چار سال بعد، ایک خارجی نے حضرت علیؓ کو زہر آلود تلوار سے شہید کردیا۔

پیغمبرؐ کے دور...... مسلمانوں کے بقول دورِ مسرت...... کے ایک چوتھائی صدی بعد...... مسلمان بھائی ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے...... اس تصور کا کیا ہوا کہ تمام مومن ایمان میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں؟

سیاسی اقتدار کی لعنت

اس کا جواب مذہب میں نہیں بلکہ ایک اور عامل میں ہے۔ جس نے شروع سے ہی اسلام کیلئے مسائل پیدا کئے: سیاسی اقتدار۔ علیؓ اور معاویہؓ کو، یا سابقہ تنازعے میں علیؓ اور حضور پاک کی بیوہ عائشہؓ کو کسی مذہبی تنازعے نے آپس میں دشمن نہیں بنایا بلکہ اُن کا اختلاف کسی قدر دنیوی معاملے پر تھا: حکومت کرنے کا اختیار کس کو ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاست کے اختلافات نے آہستہ آہستہ مذہب میں اختلافات پیدا کردیئے۔ شیعوں نے جلد ہی ایک اصول بنالیا کہ پیغمبرؐ کی واحد جائز وارث حضرت علیؓ کی اولاد ہے۔ سنیوں کا استدلال یہ تھا کہ، قطع نظر اس کے کہ کون حاکم ہے، نظم وضبط اور استحکام کیلئے اُس کی اطاعت کی جانی چاہیے۔ جنونی خارجیوں نے...... جو ایک مسلم مبصر کے الفاظ میں ''اسلامی تاریخ میں پہلی دہشت گرد تحریک تھی''...... نے یہ حلف اُٹھایا کہ وہ تمام دوسرے مسلمانوں کا مذہب تبدیل کرائیں گے یا اُنہیں قتل کردیں گے۔ (۲)

یہ تفریق ناگزیر تھی، کیونکہ سیاسی اقتدار کی فطرت میں یہ ہے کہ یہ رقابتیں پیدا کرتی ہے۔ اسلام میں اس اصول کا واحد استثنا پیغمبر محمدؐ کا عہد تھا، جن کے حکم کو تمام مسلمان تسلیم کرتے تھے۔ آپ کی سندِ اقتدار، بہرحال اوپر سے آئی تھی۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد مسندِ اقتدار زمین پر آگئی۔ اور تمام انسانی چیزوں کی وجہ سے پیچیدہ ہوگئی...... مختلف ادراکات، متنازعہ مفادات، متصادم وفاداریاں۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ، نے ایک دیانت دارانہ اصول قائم

کرکے اپنی بہترین کوشش کی۔ آپ نے اعلان کیا ''اُس وقت تک میری اطاعت کرو، جس وقت تک میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی صورت میں، مجھے آپ سے اطاعت طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' (۳) لیکن یہ فیصلہ کون کرتا کہ آیا اُنہوں نے اور اُن کے جانشینوں نے حقیقتاً اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کی؟ یہ فیصلہ کون کرتا کہ کون پارسا تھا؟ اس سوال کو تناؤ پیدا کرنے میں صرف ایک دہائی لگی، اور دو دہائیاں ایک خانہ جنگی پیدا کرنے میں لگیں۔

ایک خُدا اُمر تکز تکثیریت

علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان کون صحیح ہے، کون غلط تنازعے کے وسط میں، مسلمانوں کا ایک گروہ ایک مصالحتی تصور کے ساتھ سامنے آگیا، اُنہوں نے یہ استدلال کیا کہ تقویٰ پر تنازعے کو حل کرنا ناممکن محض ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حتمی علم ہے۔ اُنہوں نے اصرار کیا، لہٰذا انسانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں فیصلہ کن آرا دینے سے باز رہنا چاہیے۔ قرآن کی ایک آیت نے واضح طور پر اعلان کیا ''اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک واحد قوم بنا دیتا۔'' ''تم میں سے ہر شخص کو اللہ کی طرف کاٹنا ہے اور وہی آپ کو ان چیزوں کے بارے میں آگاہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو'' (۴) اس آیت کو ہاتھ میں لے کر، ان مسلمانوں نے ان سوالات کو کہ کون صحیح ہے کون غلط دوسری زندگی پر ''ملتوی کر دینے'' کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا جلد ہی وہ مُرجئین (ملتوی کرنے والے) کہلانے لگے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ مذہبی استدلال، جو ان ساتویں صدی کے مسلمانوں نے مذہبی رواداری کے بارے میں تلاش کیا...... کہ حتمی فیصلے خُدا پر چھوڑ دینے چاہیں۔ وہ صحیح استدلال تھا جسے جان لاک، ایک ہزار سال بعد، رواداری کے بارے میں ایک خط میں پیش کرنے والا تھا۔ (۵)

مُرجئین نے خارجیوں کی اور لوگوں کے ظاہری مذہبی اعمال کو دیکھ کر، لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے اُن کے رُجحان کی سختی سے مخالفت کی۔ اول الذکر کے نزدیک عقیدہ کوئی عمل کی شکل نہیں تھی۔ جسے مسلمان نے اپنے کاموں کے ذریعے ظاہر کرنا ہوتا تھا، بلکہ ایک حسیت

MashalBooks.org

تھی جسے اپنے دل میں محسوس کرنا ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان ہونا ''خُدا کے علم کو اور اُس کی اطاعت اور اُس کی محبت'' کو اپنے اندر میں داخل کرنے کا نام ہے(۶) جب ایک شخص ایمان قبول کرلیتا ہے، تو اس کی نجات ہوجائے گی باجود اُن گناہوں کے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہو۔ (کچھ لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اُنہوں نے ایک سینٹ پال والی دینیات پیدا کرلی تھی) (۷) مُرجئین اس قدر عالمگیریت کے قائل تھے کہ اُنہوں نے یہاں تک کہا کہ انتہائی غیر دقیانوسی اصولوں، جیسا کہ ''تثلیت پرستی'' ......جیسا کہ اکثر مسلمان اسے سمجھتے ہیں عیسائیت کا تثلیث کا اصول......لازمی طور پر کُفر پر دلالت نہیں کرے گا۔(۸)

تکثیریت کی طرف مذہبی راستہ کھولنے کے علاوہ، مُرجئین کی دینیات نے مذہبی حکومت یا مذہب پر مبنی حزب اختلاف کے تصور کو رد کردیا، اُنہوں نے استدلال کیا، چونکہ صرف خدا ہی حکمرانوں کے مذہبی اخلاص کا تعین کرسکتا ہے، لہٰذا سیاسی اقتدار کا جواز یا اُس پر اعتراض مذہبی بنیادوں پر نہیں ہونا چاہیے۔(۹) یہی وجہ ہے کہ خارجیوں کے برعکس جو ہر اُس شخص پر جس سے وہ اختلاف کرتے تھے ''کافر'' کا لیبل لگادیتے تھے، مرجئین اپنے آپ کو باہمی طور پر نفرت کرنے والے دھڑوں سے بغیر کسی ایک کی مذمت کئے، اپنے آپ کو الگ کرلینے کے قائل تھے۔(۱۰)

بدقسمتی سے روادار مُرجئین کا علیحدہ مکتب فکر زیادہ عرصے تک نہ چلا۔ اُن کی تکثیری دینیات، خود کو پرہیز گار سمجھنے والے دھڑوں کے درمیان گرما گرم کشمکشوں میں مُرجھا گئی۔ لیکن جنونیت کے خلاف اُن کا موقف دوسری مسلمان جماعتوں کی سمجھ میں آگیا۔ اس کا خاص طور پر امام ابوحنیفہ پر خاصا اثر ہوا، جو کہ چار۔ اور سب سے زیادہ روادار سُنی مکاتب فکر میں سے ایک مکتبِ فکر، حنفی کے بانی تھے۔

کیا خُدا ظالموں کے ظلم کا ارادہ رکھتا ہے؟

ہم اس ساری کتاب میں بار بار ابوحنیفہؒ کی طرف لوٹیں گے۔ تاہم پہلے ضرورت ہے کہ ہم دیکھیں کہ اُس قوت نے جسے مرجئین نے مذہب سے دُور ہٹانے کی کوشش کی ......یعنی سیاسی قوت...... نے دنیائے اسلام کے پہلے شدید مذہبی تنازعے میں کیسے ایک کردار ادا کیا: یعنی انسانی آزادانہ مرضی کے مدافعین اور الوہی تقدیر کے حامیوں کے درمیان تنازعے میں۔

اسلام سے قبل عرب کلیتاً جبری تھے۔ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ انسان ''دہر'' یا مقدر کے بے بس کھلونے ہیں، جو ستاروں یا فطرت کی دوسری قوتوں کی طرف سے متعین ہوتا ہے۔(۱۱) قرآن نے، یہ دعویٰ کرکے کہ خُدا ایک ایسا حاکم ہے، جس کے ہاں انسان اپیل کرسکتے ہیں، جو اُن کے مقدر کا فیصلہ کرتا ہے، اس دیومالا کو ردّ کردیا۔ علاوہ ازیں قرآن نے، اخلاقی فیصلے کرنے کی انسانوں کی ذمہ داری کی بات کی۔(۱۲) لیکن کیا اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ قادرِ مطلق خُدا نے، انسانوں کو اپنی زندگیوں کو کنٹرول کرنے کی حقیقی قوت بھی عطا کی تھی؟

ساتویں صدی کے آغاز پر، مسلمان مذہبی علما کا ایک گروہ جو قدری کہلاتا تھا شام میں جو کہ دُنیائے اسلام کا ایک نیا علمی مرکز تھا، جمع ہوا، اور اُس نے ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیا۔ اُنہوں نے یہ استدلال کیا کہ اگر خُدا نے انسانوں کو انتخاب کا اختیار نہ دیا ہوتا، تو اس کا انسانوں کو سزا اور جزا دینا غیر منصفانہ ہوتا۔ اس کے مطابق اُنہوں نے ایک اصول وضع کیا جو ذاتی ذمہ داری، طبیعت، اور انسان کی خودمختاری پر زور دیتا تھا۔

لیکن ہر شخص قدری تحریک کے حق میں نہیں تھا، اور جلد ہی ایک اور اس کا مخالف مکتبِ فکر جبریہ کے نام سے ظہور میں آیا۔ اس اصطلاح کا لفظی مطلب تھا ''[خُدا کے] جبر کے حامی''، اور اس کے علمبرداروں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ انسانوں کی کوئی آزادانہ مرضی ہوتی ہے، اُن کا ماننا تھا کہ انسان صرف وہی کررہے ہیں جو خُدا نے اُن کیلئے ''لکھ دیا ہے۔''

اس فکری تنازعے نے جلد ہی سیاسی حکمرانوں: اُموی خلفا کی توجہ حاصل کرلی۔ ان میں سب سے پہلے معاویہؓ تھے۔ جو شام کے گورنر تھے، جنہوں نے علیؓ کے ساتھ تلواریں ٹکرائی تھیں۔ جب معاویہؓ فوت ہوئے تو خلافت اُن کے بیٹے یزید کو منتقل ہوگئی، ایک ایسا مطلق العنان شخص، جو عنقریب ہی، پیغمبرؐ کے نواسے حضرت حسینؓ کو ۶۸۰ میں کربلا میں ایک خوفناک قتلِ عام میں شہید کرنے کی وجہ سے، سُنی اور شیعہ دونوں کے ہاں قابلِ نفرت ہوگیا۔ یزید کی تمام اولاد یزید کی طرح خوفناک نہیں تھی، لیکن اُمویوں نے اپنے لئے بدعنوان ظالم حکمران ہونے کی بدنامی کمالی۔ دوسری چیزوں کے علاوہ، اُن سے جبری مشقت متعارف کروانے کی وجہ سے نفرت کی جاتی تھی، جسے مسلمانوں کی طرف اپنے اجداد کے رویوں کی طرف واپسی کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جو ''قبل اسلام کے ظلم کے بے راہ رو معمولات میں سے ایک'' تھا۔(۱۳)

MashalBooks.org

دوسرے لفظوں میں اُمویوں کا جائزیت کا مسئلہ تھا۔ پہلے اُنہوں نے، اپنے آپ کو ''خلیفۃ اللہ''...... کا مبالغہ آمیز خطاب دے کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ یہ راستہ بہت زیادہ ہوس کا راستہ تھا، کیونکہ انتہائی قابلِ احترام خلفائے راشدین، جو کہ حضرت محمدؐ کے قریب ترین ساتھی تھے، نے بھی اپنے آپ کو ''خلیفۃ الرسول'' کہا تھا۔ بنواُمیہ واضح طور پر مذہب کو سیاسی طاقت کیلئے استعمال کرنے کے بہت زیادہ خواہشمند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدریہ اور جبریہ کے درمیان مباحثہ اُن کی دلچسپی کا باعث تھا: اُنہوں نے سمجھ لیا کہ موخرالذکر کی مقدر کی دلیل، اُن کے اپنے اقتدار کا جواز پیدا کرتے کیلئے بہت مفید تھی۔ وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ابد تک کیلئے طے کر دیا ہے، تو اس نے اُمویوں کے اقتدار کو بھی طے کر دیا ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر خُدا کی یہ مرضی نہیں ہوتی تو وہ تخت پر نہ بیٹھے ہوتے۔

پھر یہ مذہبی تنازعہ قدریہ اور اُموی حکومت کے درمیان ایک سیاسی تنازعہ بن گیا۔ اپنے آزادمرضی پر ایک مکتوب میں قدریوں کے رہنما، حسن البصری نامی ایک درویش عالم نے اموی خلیفہ ابن مروان کو کھلے بندوں چیلنج کیا (۱۴) البصری کے پیروکاروں میں سے ایک پیروکار اس سے بھی آگے چلے گئے۔ اُنہوں نے یہ استدلال کیا کہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کو ''خُدا کی نعمت'' قرار دینے کا کوئی حق نہیں: اُنہیں خُدا کے سامنے لوگوں کے بارے میں اپنی ذمہ داری سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے یہ بھی زور دے کر کہا کہ اگر تمام مسلمان سچے دل سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے قانون کی اطاعت کریں تو کسی خلیفے کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ (۱۵)

اب بہت ہوگئی تھی۔ خلیفہ نے جلد ہی الدمشقی، کو اُن کے دو ہم خیال رفیقان کار کے ساتھ گرفتار کروا کے پھانسی دے دی۔ یہ تحریک اُمیہ خاندان کے نوے سالہ دور کے دوران دبی رہی۔

پھر اُموی دور کے بارے میں ایک حتمی اور بہت واضح تفصیل ہے۔ سلسلہ وار چودہ اُموی خلفا میں سے، دو، عمر ثانی اور یزید ثالث کو اس اصول کی مستثنیات سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ پاکباز اور منکسر المزاج آدمی تھے، جنہوں نے دباؤ اور بدعنوانی کی لہر کو پیچھے کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر یزید ثالث اپنی اُس افتتاحی تقریر کی وجہ سے مشہور ہے، جو اس نے ۷۴۴ میں دمشق میں کی، جب اُس نے لوگوں کے سامنے اپنے احتساب پر زور دیا، اور اپنے پیشروؤں کے طاقت کے غلط استعمال سے گریز کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ عورتوں اور بچوں پر رقم

کو نہیں لٹائیں گے اور نہ ہی بلاوجہ دولت کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں منتقل کریں گے، اور نہ ہی ذمیوں (حفاظت میں لئے گئے) عیسائیوں اور یہودیوں پر بھاری ٹیکس عائد کریں گے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے اپنے سامعین کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ اگر وہ ان وعدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو اقتدار سے ہٹ جائیں گے، اور جس شخص کو بھی وہ لوگ منتخب کریں گے وہ اُنہیں تسلیم کریں گے۔ (۱۶)

اب ایسا ہے کہ یہ اچھا خلیفہ محض اچانک پیدا نہیں ہوگیا۔ مورخین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قدریوں کے ساتھ قریبی طور پر منسلک تھا۔ (۱۷) واضح بات ہے، کہ لوگوں کے سامنے ذمہ واری کا سیاسی تصور آزادمرضی کے مذہبی نظریے کے ساتھ قریبی طور پر منسلک تھا۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ یزید ثالث اپنی فطری موت سے پہلے صرف چھ ماہ حکومت میں رہا۔ اور پھر اُموی حکومت معمول سے مطابق اپنے کاروبار کی طرف واپس آ گئی۔

اہل الرّائے کا عروج

آزادمرضی، اور جبریت کے حامیوں کے درمیان تنازع ایک اہم تنازعہ تھا، لیکن یہ اسلام کی تشکیلی صدیوں میں نظریات کی حقیقی جنگ کا افتتاحیہ تھا: اہل الرائے اور اہل الحدیث یا صاحبانِ عقلی استدلال اور صاحبانِ روایت کے درمیان تصادم۔

یہ تنازعہ بنیادی طور پر شریعہ کی ساخت کے طریقے پر اختلافِ رائے کے طور پر شروع ہوا، جس کے دُنیائے اسلام کیلئے اہم کردار کا جائزہ پچھلے باب میں لیا گیا تھا۔ تمام مسلمان اس بات پر متفق تھے کہ قرآن کو شریعت کا بنیادی ماخذ ہونا چاہیے، لیکن یہ چیز معاملے کی زیادہ وضاحت نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ قرآن نسبتاً ایک مختصر کتاب ہے ...... جو عہدنامِ جدید سے زیادہ طویل نہیں ہے ...... اور اس کا بڑا فوکس خالصتاً روحانی معاملات ہیں، جیسا کہ خُدا کے مقاصد انسان کے اخلاقی فرائض، اور اگلی زندگی۔ جُرم وسزا، اور شادی اور وراثت، جو کہ خالصتاً ذہنی معاملات ہیں، بمشکل محض چند صفحات پر مشتمل ہوں گے...... قرآنِ کریم کا زیادہ تر حصہ ''وسیع، عمومی اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہے۔'' (۱۸)

ان عمومی اخلاقی ہدایات ...... جیسا کہ انصاف، دیانت داری اور شرافت ...... کا اطلاق

MashalBooks.org

خصوصی اصول وضوابط پر کیسے ہوگا۔ شریعہ کا بنیادی سوال تھا۔ خود قرآن نے دو دوسرے ماٰخذ کی طرف اشارہ کیا: (۱) انسان کا عقلی استدلال (۲) خود پیغمبرؐ کی ذات بطور پیروی کرنے کے ایک نمونے کے۔ لیکن یہ نمونہ صرف محمدؐ کے اپنے تناظر تک محدود تھا، لہٰذا جب مسلمانوں نے جزیرہ نمائے عرب کو چھوڑا اور وہ شرقِ اوسط کے زیادہ عالمی مراکز، جیسا کہ مصر، شام اور خاص کر عراق کے زیادہ قریب ہوئے، تو انہیں بالکل نئے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ عراق شریعت کے ان علما کا ایک مرکز بن گیا جنہوں نے انسانی عقل کو، قرآن کے بعد دوسرے حتمی ماٰخذ کے طور پر استعمال کیا۔ دوسرے لفظوں میں، وہ اہل الرائے تھے، رائے ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ''عقل'' یا ''عقلی رائے'' ہے...... اس مکتبِ فکر سے اُبھرنے والے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ مستند عالم ابوحنیفہؒ تھے، جو مُرجئین کے مکتبِ فکر کے ہمدرد تھے۔ اُن کی فکر سختی سے قرآن اور انسانی عقل پر، اور تھوڑا سا کم ''اُسوۂ رسول'' پر مبنی تھی:۔

آپ نے بظاہر محسوس کیا کہ مقامی حالات مختلف ہوتے ہیں، اور اگرچہ مدینہ حالات کی قوت کی وجہ سے محمدؐ کا شہر تھا، لیکن یہ ایک صحرائی شہر تھا، اور لہٰذا آپ صحرائی قانون کو ممکنہ طور پر شہری زندگی پر لاگو کرنے کی توقع نہیں کر سکتے، جب معاملہ عالمگیر اہمیت کا ہو...... لہٰذا ابوحنیفہؒ نے قرآن کی سہ گونی رسی پر تکیہ کیا، قیاس، اور رائے پر جس کے ساتھ استحسان کے گاہ گاہی استعمال پر اور شاذونا کسی حدیث پر۔ (۱۹)

یہاں استعمال ہونے والی عربی اصطلاحات اہم ہیں قیاس کا مطلب ہے ''مشابہتی استدلال'' اور استحسان کا مطلب ہے ''مفادِ عامہ کی خاطر قانونی ترجیح''۔ یہ دو عقلی آلات ایک تیسرے، عرف، کے ہمراہ ابوحنیفہ کے حوالے سے بڑے معقول تھے۔ لہٰذا اُن کا شریعت کا متن ایک حرکی اور لچکدار متن تھا، جو قرآن کے عمومی اصولوں کو کسی بھی تناظر میں قائم رکھتا تھا، اس طرح کہ اپنے آپ کو نئے حقائق کے ساتھ ڈھالنے کے بھی قابل تھا۔

احادیث پیغمبر محمدؐ کے اقوال یا آپ سے منسوب افعال پر مشتمل ہیں اور جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے دیکھیں گے، یہ مختلف فقہی مکتب، جسے اہلِ الحدیث یا ''روایت کے لوگ'' کہا جاتا ہے کا ستون بننے والے تھے۔

ایک خُدا جو اصول رکھتا ہے

ابوحنیفہ عقلیت پسند مکتبِ فکر کے فقہی دھڑے کے پیشرو تھے۔ لیکن فقہ کے مسائل آخرکار دینیات کے مسائل سے منسلک تھے...... یعنی خُدا، وحی اور انسان کے بارے میں نظریات کے ساتھ۔ لہٰذا، عراق میں، ماہرین الٰہیات کے ایک مکتبِ فکر نے، جو معتزلہ کہلاتا تھا ان تمام موضوعات سے ایک عقلی تناظر میں نمٹنے کی کوشش کی۔ اسلام کے صحیح معتقدین اور ایسے جدید دانشوروں کے طور پر، جو بشمول یونانی فلسفہ کے دوسری روایات کا علم رکھتے تھے، اُن کا مقصد مذہب اسلام اور عقلیت پسندی کے درمیان موافقت کی نشاندہی کرنا تھا۔

بہت سے معتزلہ ابوحنیفہ کے پیروکار (اس طرح فقہ کے لحاظ سے حنفی) تھے، دوسرے شیعہ تھے۔ (۲۰) لیکن وہ سب کے سب قدریوں کے آزاد مرضی کے نظریے کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک یہ محض ایک ترجیحی نقطۂ نظر نہیں تھا...... یہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ایک، یعنی انصاف کا منطقی نتیجہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مطلقاً منصف ہے، وہ استدلال کرتے تھے، لہٰذا وہ اپنی مخلوقات کو سزا یا صلہ بغیر معقول وجہ کے نہیں دے گا۔ لہٰذا، انسان جنت میں اپنا صلہ یا جہنم میں اپنی سزا اپنی آزاد مرضی کے نتیجے میں پائیں گے۔ معتزلہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ کسی بھی شخص کو جو خدا پر یقین رکھتا ہے یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ انسان ''اپنے اعمال کا خالق ہے'' (۲۱)

لیکن انصاف کا مطلب کیا ہے؟ اور انسان کس طرح یہ جان سکتے ہیں کہ کون سی چیز منصفانہ ہے یا نہیں ہے؟ معتزلہ کے مخالفین یہ استدلال کرتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ پہلے انصاف کی تعریف کی جائے کہ انصاف کیا ہے، اور پھر خُدا سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کی مطابقت اختیار کرے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جو کچھ خُدا کرتا ہے وہ انصاف کا معیار ہوگا۔ اگر خواہ وہ تمام لوگوں کو کسی وجہ کے بغیر جہنم میں ڈال دے، تو یہ بڑی منصفانہ بات ہوگی، کیونکہ انصاف کی اس سے آگے کوئی تعریف نہیں کہ یہ وہ کچھ ہے جو خدا کرتا ہے۔

معتزلہ کے نزدیک، خُدا کی بے اصولی کی تصویر، اُس کی کوئی تعریف نہیں تھی، جیسا کہ اُن کے مخالفین سمجھتے تھے بلکہ یہ توہین تھی۔ اُن کے نزدیک یہ خُدا کی فطرت میں تھا کہ وہ منصف اور اچھا ہو، اور وہ کبھی ان اصولوں کے خلاف نہیں جائے گا، اگرچہ اس کے پاس ہر وہ چیز کرنے کی قدرت

MashalBooks.org

ہے جو وہ چاہیے۔ معتزلہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ''وہ معصوم لوگوں کو اذیت نہیں دے سکتا اور ناممکن کا تقاضا نہیں کرسکتا'' اس وجہ سے نہیں کہ اُس کے پاس ایسا کرنے کی قدرت نہیں، بلکہ ''محض اس وجہ سے کہ وہ خدا ہے'' (۲۲)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ خدا کے بارے میں یہ باہم مخالف نظریات عیسائی روایت میں بھی موجود ہیں۔ معتزلہ کے مترادف نظریہ (ریشنلزم) یا انٹلکچول ازم (عقلیت پسندی) کہلاتا ہے، کیونکہ یہ استدلال کرتا ہے کہ خُدا (معقولیت پسند ہے، اور اُس کے طور طریقے، کم از کم جزوی طور پر انسانوں کیلئے قابلِ فہم ہیں۔ دوسرا نظریہ ''ارادیت'' (والنٹر ازم) کہلاتا ہے، جو خُدا کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ جس کے طور طریقے نا قابلِ ادراک ہیں اور کسی بھی ایسے اصول کے، جسے ہم جانتے ہیں، پابند نہیں۔

ایک نمایاں مبصر جس نے ۲۰۰۶ میں اس موضوع کو اُٹھایا پوپ بینڈکٹ شانزدہم تھا، جس نے ریجبرگ (جرمنی) کے اپنے متنازعہ خطاب میں، اسلام میں ارادیت کے نظریات پر تنقید کی۔ ایک ایسے متلون مزاج خُدا کے تصور پر منتج ہو سکتے ہیں، جو سچ اور نیکی کا بھی پابند نہ ہو، '' لیکن وہ یہ فرض کرنے میں کوئی ایسا صحیح نہیں تھا کہ اسلام میں واحد یہی نظریہ ہے۔ درحقیقت مقدس باپ کا استدلال ...... کہ ''جب ہم خدا کو، محض نا قابلِ نفود ارادیت میں اپنے آپ سے دُور دھکیل دیتے ہیں تو وہ کوئی زیادہ الوہی نہیں بن جاتا'' ...... ٹھیک ٹھیک وہی نظریہ تھا، جس کا دفاع معتزلہ بارہ صدیاں قبل کر رہے تھے، اُس سے بہت پہلے، جب یہ قرونِ وسطیٰ کی دُنیائے عیسائیت تک، بعد کے دور کے ایک معتزلی ابن رُشد کے ہاتھوں، جسے مغرب میں ایوروس (Averroes) کے نام سے جانا جاتا ہے، منتقل کیا گیا۔ (۲۳)

معتزلہ کی تعقل پسندی نے اُن کی رہنمائی، خُدا اور، لہٰذا اُس کی کائنات کے بارے میں یہ نتیجہ نکالنے کی طرف کی کہ یہ ''عقلی قوانین کے مطابق کام کرتے ہیں'' ایک ایسا قضیہ جو سائنسی تحقیق کا تقاضا کرتا تھا۔ (۲۴) اس سے قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دُنیا کی سائنسی ترقی میں اچانک تیزی نمودار ہوئی۔ خُدا کی نوعیت کے بارے میں اپنا ایک نقطۂ نظر رکھنے کے علاوہ، معتزلہ وحی کی نوعیت کے بارے میں بھی اپنے مخالفین سے اختلاف رکھتے تھے۔ زیرِ بحث وحی قرآن تھی، اور معتزلہ یہ استدلال کرتے تھے کہ یہ ''مخلوق'' ہے۔ یہاں معنیات اہم ہیں۔ ''غیر مخلوق قرآن'' کے

حامیوں کے نزدیک، مسلمانوں کی مقدس کتاب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ازل سے موجود رہی ہے...... عیسیٰؑ کی نوعیت سے مشابہ جیسا کہ وہ جون کے چوتھے صحیفے میں بیان کی گئی ہے۔ معتزلہ کے نزدیک، قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے، لیکن اُس نے تاریخ کے کسی خاص نقطے پر یہ کلام کیا۔ اُنہوں نے استدلال کیا، کہ بصورتِ دیگر، کتاب مقدس ایک دوسرے الٰہ کے رُتبے تک بلند ہو جاتی ...... جو کہ اُن کے استدلال کے مطابق، ایک ایسی چیز تھی جو اسلام کی غیر متبدل توحید سے متضاد تھی۔

اگرچہ، قرآن کی اس نوعیت کے بارے میں یہ بحث بنیادی طور پر دینیات سے متعلق تھی، لیکن اس کے تعبیراتی نتائج بھی تھے، کیونکہ ایک مخلوق قرآن کی تعبیر کی جاسکتی ہے: غیر مخلوق قرآن کا صرف اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ (۲۵)

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ معتزلہ کا الکتاب کے بارے میں نقطۂ نظر اس کی غیر لفظ پرستانہ قراءت کی گنجائش پیدا کرتا تھا۔ جس کی قرآن کی بظاہر تجسیمی آیات کی تشریح کرنے کیلئے، اُنہیں ضرورت تھی...... جن میں خُدا تعالیٰ کے ''ہاتھوں''، ''چہروں'' اور ''تخت'' کے حوالے ہیں۔ معتزلہ تجسیمیت کے شدید مخالف تھے، لہٰذا اُنہوں نے تمثیلی تشریح کا ایک طریقہ اختیار کیا، جسے تاویل کہا جاتا تھا، جس نے جلد ہی، دوسری مذہبی ترغیبات سے عقلیت پسندوں کو متاثر کیا۔ بلاشبہ، نویں اور دسویں صدیوں میں ربانی اور کیراعتی یہودیوں، قبطی عیسائیوں اور شیعہ اور سُنی مذہبی عالموں، نے اپنی مقدس کتابوں کی عقلیت پسندی کا دفاع کرنے کیلئے معتزلہ کی تاویل کو استعمال کیا۔ (۲۶)

قرونِ وسطیٰ کا آزاد لوگوں کی سرزمین کا نظریہ

معتزلہ کو اکثر اوقات، غلط سمجھا گیا اور کچھ دوسرے سیکولر ''فلسفیوں'' ...... جو نیز قرون وسطیٰ کے اسلام میں اسی عقلیت پرست گروہ میں سے اُبھرے، لیکن بعد میں قدیم یونانی فلسفے سے اس قدر مسحور ہوئے کہ وہ تقریباً مادہ پرست آزاد مفکر بن گئے ...... کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ درحقیقت، معتزلہ پکے مسلمان تھے۔ جو اپنے مذہب کو تعلیم یافتہ غیر مسلموں کیلئے قابلِ رسائی اور متاثر کُن بنانے کے شدید خواہشمند تھے (۲۷) جنہیں ایسے بیان کیا گیا ہے کہ وہ ''دائیں'' (یعنی عقلیت مخالف مسلمانوں) اور ''بائیں'' (سیکولر یا غیر مسلم فلسفیوں) کے درمیان اعتدال کا راستہ

MashalBooks.org

مہیا کر رہے تھے۔(۲۸)

اُن کی خدمات متاثر کُن تھیں۔انسانوں کی تعریف ایسی آزاد اور خودمختار ہستیوں کے طور پر کر کے، جن کے اندر خدا اور اس کی تخلیق کو سمجھنے کی صلاحیت ہے، اُنھوں نے اُن بنیادی تصورات میں سے کچھ پیش کئے، جنہیں آج ہم 'جدید' بلکہ 'آزادرو' کہتے ہیں۔ایک امریکی قانون کے پروفیسر کے الفاظ میں، اُن کے نظریات بلاشبہ ''مغربی قانون سے منسلک بہت سے اصولوں میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ اُن کی پیش بینی کرتے ہیں ......جیسا کہ ''معقولیت پسندی'' معروضیت، انفرادی آزادی، اور مساوات کے اصول(۲۹)

اس کی ایک دلچسپ مثال وہ آزاد مرضی کا اصول تھا، جس کے حامی معتزلہ اور اُن کے پیشرو قدری تھے۔اس تصور نے یہ نتیجہ نکالنے میں اُن کی رہنمائی کی کہ دُنیا ایک آزاد جگہ ہونی چاہیے، تا کہ انسانوں کو ''انتخاب کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے'' (اَلتَّمکن والاختیار). لہٰذا، اُن کا استدلال یہ تھا کہ پوری دُنیا کو آزمائش کے گھر (دارُ الابتلا) کے طور پر دیکھنا چاہیے، جہاں لوگوں کو اس سلسلے میں آزمایا جاتا ہے کہ آیا وہ سچے مذہب کو اختیار کرنے کیلئے رضامند ہیں یا نہیں۔(۳۰) معتزلہ بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ مذہب کو قبول کرنے کی یہ کیفیت صرف صحیح اطمینانِ قلب سے واقع ہوتی ہے......دل کے عمل سے......جو کہ وہ تصور ہے جو اُنہوں نے قرآن کی ایک آیت سے اخذ کیا: ''مذہب میں کوئی جبر نہیں''۔(۳۱) اُن کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ ''مذہب کے انتخاب کرنے کیلئے آزادی'' کے مستحق ہیں۔(۳۲)

ایک مغربی دانش ور بیان کرتا ہے، کہ کفر اور دوسرے ''غلط رویوں'' کیلئے برداشت کی یہ ٹھوس بنیاد تھی، ''اس وجہ سے نہیں کہ، جیسا کہ جدید تکثیریت پسند دعویٰ کریں گے کہ تمام ترجیحات یکساں صحیح ہیں، بلکہ اس لئے کہ غلط نظریات کا مطلب مسلمانوں کی مضبوطی تھا، اور لہٰذا ان کا مقابلہ کرنا مطلوب تھا نہ اُن کو ختم کرنا''(۳۳)

کچھ سیاسی نظریات بھی جو اس سے پیدا ہوئے، قابلِ ذکر تھے۔الفارابی نے جو دسویں صدی کا ایک مسلمان فلسفی تھا، ایک کتاب لکھی جس کا نام کتاب السیاسۃ المدنیہ، شہری سیاست کی کتاب، تھا۔اُس نے اس بیان سے آغاز کیا کہ روئے زمین پر تمام حکومتیں نامکمل ہیں، سوائے اس حکومت کے جو مدینہ میں پیغمبر محمدؐ کے ہاتھوں قائم ہوئی، کیونکہ اُس پر حکمرانی خدا تعالیٰ کے ساتھ

براہِ راست رابطے سے ہوتی تھی لیکن، الفارابی نے اپنے قاریوں کو یاد دلایا، کہ ایسی مذہبی حکومت پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ناممکن ہوگئی، لہٰذا منصفانہ حکومت کے اصول انسانی عقل کی رُو سے متعین کئے جانا چاہیں۔

پھر اُس نے اپنی مثالی حکومت کو بیان کیا، جسے اُس نے ''قومی ریاست'' کا نام دیا، جس کے باشندے مکمل آزادی (حُریت) سے لطف اندوز ہوں گے۔یہ ایک ''مساواتی تنظیم ہوگی جہاں لوگ جو کچھ بھی وہ چاہیں کرنے کیلئے آزاد (احرار) ہوتے ہیں۔'' مزید برآں، وہ ''اُن لوگوں کی قیادت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں گے جو اُنہیں زیادہ آزادی مدینے کا وعدہ کریں گے ......اور اُنہیں اپنے مخصوص رجحانات کی پیروی کرنے کے زیادہ مواقع دیں گے'' (۳۴) جب ایک ایسی آزادی کو پروان چڑھانے والی حکومت موجود ہوگی'' الفارابی نے مزید کہا، ''تو باہر سے لوگ اس کی طرف ہجوم کر کے آئیں گے'' اور یہ چیز ''انتہائی پسندیدہ قسم کے نسلی ملغوبہ اور ثقافتی تنوع'' پر منتج ہوگی، جو کہ ایسے باصلاحیت افراد جیسا کہ فلسفی اور شاعر کے بڑھنے پھولنے کی ضمانت مہیا کرے گی۔(۳۵)

قدرے امریکہ جیسی کیفیت محسوس ہوتی ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟ الفارابی یقیناً پیش بینی کی صلاحیت رکھتا تھا۔عربی کے مرحوم پروفیسر فرانز روزنتھال (Franz Rosenthal) نے اُس کے بارے میں کہا:

''جدید قاری یہ سمجھنے میں کبھی ناکام نہیں رہتا کہ یہ مسلم فلسفی جمہوریت کے لوازمات کی صحیح تعریف دینے میں کامیاب رہا۔اس نے فرد کے ارتقا اور مسرت کیلئے سیاسی آزادی کے مکمل مفہوم اور اہمیت کا احاطہ کیا۔''(۳۶)

الفارابی اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مسلمان مفکرین ......جیسا کہ الکندی، ابنِ سینا، اور ابنِ رُشد......کے خیالات کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا، اور اُنہوں نے جدید مغربی فکر کے عروج میں اپنا حصہ ادا کیا، یہی وجہ ہے کہ اُن سب کے لاطینی نام بھی ہیں: الفارابیس (Alpharabius)، الکندس (Al_Kindus) ایوسینا (Avicenna) اور ایوروس (Averroes) بالترتیب۔ایک اور مسلمان مفکر ابن خلدون نے، چودھویں صدی میں، تاریخ کا تعارف (Introduction to History) لکھی، جو آنجہانی برطانوی مورّخ ٹوئن بی کے مطابق، ''بلاشبہ اپنی قسم کا عظیم ترین کام،

MashalBooks.org

جو آج تک، کسی بھی ذہن کی طرف سے کسی بھی وقت اور جگہ پر تخلیق کیا گیا ہے‘‘(۳۷) کتاب میں، ابن خلدون نے، دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ، اقتصادی آزادہ روی کے نظریے کو پروان چڑھایا، جس میں حکومتوں کو ٹیکسوں کو کم کرنے، نجی املاک کی حفاظت کرنے، آزاد منڈی کی حمایت کرنے، اور بجٹ کے خساروں سے گریز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے(۳۸) ورلڈ بینک نے حال ہی میں آپ کا حوالہ ’’نجکاری کا پہلا پرچارک‘‘ کے طور پر دیا ہے۔(۳۹)

المختصر، آزادی کا تصور...... دینیاتی، سیاسی یا معاشی مفہوم میں، کلاسیکی اسلامی دُنیا میں غیر معروف نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے۔ اہل الرائے نے واضح طور پر اس کی تمنا کی، اور ہوسکتا ہے کہ اُنہوں نے ایک حقیقی اسلامی آزادہ روی کو قائم کرنے کیلئے پیش رفت کی ہو۔

لیکن وہاں صرف وہی لوگ نہیں تھے۔ وہاں جیسا کہ ہم نے دیکھا، جابر خلفا بھی تھے، جو ایسے ضدی آزادہ رو لوگوں سے نفرت کرتے تھے، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ، ایک مخالف اور مسلسل بڑھتا ہوا گروہ، جسے اہلِ روایت کہا جاتا تھا۔

MashalBooks.org

باب 4

قرونِ وسطیٰ کی نظریات کی جنگ (II)

اہلِ روایت میں گنہگار اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔لیکن اہلِ تجدید کے اندر نیک لوگ خُدا کے دشمن ہیں۔......امام احمد بن حنبل، اسلام کے حنبلی مکتبِ فکر کے بانی

اُنیسویں صدی سے دو دہائیاں پہلے، بغداد میں ایک عالم نمودار ہوا۔ جسے آج کل کے حساب سے ''ایک انقلابی مذہبی پیشوا'' کہا جاتا۔ بغداد کا یہ شہری، سولہ سال کی عمر میں شہر کو چھوڑ کر، دُنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں اور خاص طور پر حجاز کے خطے میں، جو جزیرہ نمائے عرب کا مغربی حصہ تھا، وقت گزارنے کیلئے روانہ ہوا۔ وہاں کے اور خاص طور پر مدینہ کے علما، یہ یقین رکھتے تھے کہ اہلِ عراق، مذہب کے معاملات کے بارے میں اپنی عقلیت پسندی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک سوچتے تھے کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کوئی بھی کردار دینا ایک خطرناک بدعت ہے، ایک ایسی اصطلاح جو جلد ہی عیسائیوں کی اصطلاح الحاد کے مترادف ہونے والی تھی۔

بغداد اپنی آمد کے بعد ہمارے ''انقلابی مذہبی رہنما'' جلد ہی اس خلاف عقل نظریے کے پُرجوش ترین علمبردار بن گئے۔ جنہوں نے اہل الرائے کے خلاف ایک مقبولِ عام مہم چلائی۔ یہ شہر عقلی مباحثوں کا عادی ہو چکا تھا، لیکن حنبل اور اُن کے پیروکاروں کا نوخیز گروپ وہاں بحث کرنے

کیلئے نہیں بلکہ مذمت کرنے کیلئے گیا تھا۔ اپنے وعظوں میں، حنبلؒ نے اُن تمام عقلی مکاتبِ فکر کی مذمت کی جن کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے: تکثیری مُرجئین، جو کون صحیح ہے، کون غلط بحث کو اگلی زندگی پر ملتوی کرنے کو ترجیح دیتے تھے: قدری، جو انسان کی آزادانہ مرضی کا دفاع کرتے تھے اور پہلے سے طے شدہ مقدر کی مخالفت کرتے تھے، وجہمیہ جو کہ معتزلہ کی ایک قسم تھی اور حنفی جو ابوحنیفہ کے پیروکار، جنہوں نے فقہ کی ایک عقل پرستانہ اور لچکدار قسم کی بنیاد رکھی۔ حنبلؒ کے مطابق، ان تمام لوگوں پر پابندی لگانی چاہیے تھی اور اُن کی کتابوں کو دفن کر دینا چاہیے تھا۔(۱)

درحقیقت، حنبلؒ ان اہل الرائے کو مسلمان بھی نہیں سمجھتے تھے وہ یہاں تک جاتے تھے کہ وہ اُن کی گردن زدنی کی تلقین کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کسی بھی ایسے شخص کو جو یہ کہے کہ قرآن مخلوق ہے، توبہ کرنے کو کہنا چاہیے: اگر وہ انکار کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔(۲) خوش قسمتی سے حنبلؒ کے پاس، اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کیلئے، اپنے ماتحت کوئی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی نہیں تھی۔ لیکن اُن کے پیروکار اپنے مخالفین کو مختلف انداز سے خوفزدہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ طرسوس (ایشیائے کوچک) سے، احمد السرّاق نامی ایک درویش، جو کہ ''قرآنِ مخلوق'' کے نقطۂ نظر کے حامی تھے بغداد میں آئے۔ اس شخص کے ''الحاد'' کے بارے میں سُن کر حنبلؒ نے حکم دیا کہ کوئی شخص اُس کے پاس نہ بیٹھے۔ السرّاق حقارت زدہ ہو کر ابادان بھاگ گیا، لیکن حنبلؒ کے ایک ساتھی نے وہاں کے حکمران کو قائل کر لیا کہ وہ ایک منادی والے سے یہ اعلان کروائیں کہ تمام سرایوں میں کوئی شخص اُس کے ساتھ نہ بیٹھے، اور بے چارے آدمی کو اُس شہر سے بھی نکلوا دیا گیا۔(۳)

حنبلؒ کا عقل کے بطور مذہب کے ایک ماخذ ہونے کا متبادل دوہرا تھا۔ دینیات کے معاملات میں، یہ ایک سادہ اور دوٹوک کٹر پن تھا۔ مثال کے طور پر، وہ قرآن میں بعض مبہم آیات کے معانی پر بحث کرنے سے محض انکار کرتے تھے......مثال کے طور پر ایسی آیات کے جو اللہ تعالیٰ کے ''چہرے'' یا ''تخت'' کے بارے میں ہیں۔ حنبلؒ کا یہ استدلال تھا کہ ایسے تمام اسرار کو بلا کیف (بغیر یہ پوچھے کہ کیسے) تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ اصطلاح جلد ہی آپ کے پیروکاروں کیلئے ایک مذہبی اصول بن گیا۔

حنبلؒ کا دوسرا اصرار، جو اُن کے فقہ کے پورے تصوّر کی بنیاد تھی، پیغمبر محمدؐ کی ''روایت''

MashalBooks.org

(سنت) تھی......جس کا جائزہ اب ہم زیادہ باریکی سے لیں گے۔

سُنّہ بخلاف عقل

تمام مسلمان پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں، لہٰذا آپ کی روایت اُن سب کیلئے انمول ہے لیکن یہ بات کہ اُن کی روایات کا مطلب ٹھیک ٹھیک کیا ہے، اور اسے کیسے سمجھا جا سکتا ہے، متنازعہ ہے۔ یہ چیز کم از کم نویں صدی میں تنازعہ کا بہت سنجیدہ سبب تھی۔

اہل الرائے کی نگاہ میں، پیغمبرؐ قرآن کریم کے انتہائی متقی شارح اور عامل تھے، لیکن آپ کسی خصوصی، مافوق البشر عقل کے حامل نہیں تھے۔ قرآن میں وہ تمام وحی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ پر نازل فرمائی، اور آپ نے الکتاب کی پیروی ''اوّلین مسلمان کے طور پر'' کی جیسا کہ تمام دوسرے مسلمانوں سے کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ (۴) لہٰذا ایک مسلمان جب قرآن کی پیروی کر رہا ہوتا ہے، اور جب کوئی نئے سوالات سامنے آئیں تو اپنی رائے کا استعمال کر رہا ہوتا ہے، تو وہ پہلے ہی پیغمبرؐ کے اُسوہ کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔ بہر حال، قرآن تمام انسانوں کو مسلسل عقل کی طرف بُلاتا ہے۔

اہلِ روایت نے اس سے اختلاف کیا۔ اگر اسے نرم الفاظ میں بیان کیا جائے تو، کیونکہ وہ ''عقل کی زیادتی'' سے نالاں تھے، لہٰذا وہ کسی ایسی ہیئتِ حاکمہ کی تلاش میں تھے، جو عقل کے دائرے کو محدود کرے، جسے وہ ترغیب اور انحراف کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نگاہوں میں، پیغمبرؐ کی روایت عقل کا ایک محیطِ کُل ذریعہ بن گئی، جو ہر چیز کی تعریف کرتی تھی، احمد حنبلؒ کے بارے میں مشہور تھا کہ اُنہوں نے زندگی میں کبھی ایک تربوز بھی نہ کھایا، کیونکہ وہ پیغمبرؐ کی روایت میں اس کی کوئی ایک مثال بھی نہ پا سکے۔ (۵) ایک اور مثال میں، آپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے، کہ آپ نے اپنی بیوی ریحانہ کو ایک خاص قسم کا جُوتا پہننے سے منع کر دیا، کیونکہ یہ پیغمبرؐ کے دور میں وجود نہیں رکھتا تھا۔'' (۶)

سُنہ کی یہ نئی تفہیم، اُس آزادی پسند قول سے ایک بہت بڑا انحراف تھا، جس کو شریعہ کے اس سے قبل کے علما، جیسا کہ ابوحنیفہ تسلیم کرتے تھے۔ ''بنیادی اصول اجازت ہے'' (۷) اس کا

مطلب تھا کہ آزادی کو ایک فطری انسانی حالت فرض کیا جاتا ہے، اور اس میں بغیر وجہ کے تخفیف نہیں کی جا سکتی۔ (۸) لیکن حنبلؒ کی دُنیا میں، صرف اُس چیز کی اجازت ہے، جسے سنت میں ہونا ثابت کیا جا سکے۔ آج بعض مسلمان بنیاد پرست، جو جمہوریت جیسی ''جدّتوں'' سے یہ کہتے ہوئے انکار کرتے ہیں کہ ''پیغمبرؐ نے کبھی ووٹ نہیں دیا''، وہ اسی ذہنی ساخت کی بازگشت کرتے ہیں۔ (۹)

سچی بات یہ ہے کہ، تمام اہل الرّائے ایسے کٹر نہیں تھے، جیسا کہ حنبلؒ۔ اُن کے استاد، الشافعی، قدرے زیادہ لچکدار تھے، اور بعض لوگوں نے الشافعی مکتبِ فکر کو ''نیم عقلیت پسند'' قرار دیا ہے (۱۰) الشافعی کے اُستاد، مالک، اس سے بھی زیادہ ڈھل جانے کے اہل تھے، کیونکہ آپ اور آپ کا مدینہ میں جڑیں رکھنے والا طبقہ، پیغمبرؐ کی ''زندہ روایات'' پر یقین رکھتا تھا، جس کا دائرہ حنبلؒ اور آپ کے پیروکاروں کی طرف سے اپنائی جانے والی، محیطِ کُل روایت کی نسبت زیادہ چھوٹا تھا۔ یہ نام......حنبلؒ، الشافعیؒ، اور مالکؒ......اہم ہیں، کیونکہ وہ فقہ کے چار بڑے مکاتبِ فکر میں سے تین کے بانی تھے۔ ان میں سے، الشافعی کا مکتبِ فکر زیادہ محقق بن گیا، کیونکہ وہ طریقِ کار جو اس نے وضع کیا دوسروں کیلئے ایک معیار بن گیا۔ 'شافعی انقلاب اس قدر اہم اور ایک اصول قائم کرنے والا تھا، یہاں تک کہ ابوحنیفہ، جو کہ اہل الرّائے کے علمبردار تھے کے طلبہ کو بھی، اس کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا پڑی، اور اس طرح اُس عقلیت پسندی کے کچھ حصے سے، جسے اُن کے استاد نے پسندیدہ قرار دیا تھا، پیچھے ہٹنا پڑا۔

احادیث کا عروج

اسلامی فقہ پر الشافعی کا اثر بہت پیچیدہ ہے، لیکن اس کی بنیاد میں، پیغمبرؐ کی روایت (سُنہ) کو قرآن کی سطح تک بلند کرنا ہے۔ اُنہوں نے پیغمبرؐ کا تصوّر......جنہیں اب تک وسیع پیمانے پر اللہ تعالیٰ کے قانون کے شارح اور عامل کے طور پر دیکھا جاتا تھا......ایک دوسرے ''قانون ساز'' کا درجہ دے دیا، جن کے الفاظ اور اعمال ایسے مستند تھے جیسا کہ قرآن۔ (۱۱) لہٰذا یہ بات اہمیت اختیار کرنے لگی کہ آیا پیغمبرؐ نے واقعی تربوز کھایا تھا یا نہیں۔ اور یہ کہ آپ کیسا لباس پہنتے تھے، کیسے کھاتے تھے، کیسے اپنے دانتوں میں مسواک کرتے تھے، کیسے بالوں میں کنگھا کرتے تھے، اور

MashalBooks.org

کیسے اپنی ریش بڑھاتے تھے۔

اُس وقت تک جب تک الشافعی نے اپنے نظریے کو پروان چڑھایا، پیغمبرؐ کی وفات کو دوصدیاں گزر چکی تھیں۔ لہٰذا آپ کی سنت کا کھوج لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایک ''زندہ سنت'' تھی۔ جو ایسے معمولات کا احاطہ کرتی تھی جیسا کہ وہ طریقہ جس پر روزانہ کی نمازیں ادا کی جاتی تھیں، جو پیغمبرؐ کے وقت سے ایک ناشکستہ ادائیگی کے ایک سلسلے میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔ لیکن ایک ایسے وقت میں جب کوئی دستاویز خانے، ریکارڈ یا اخبارات نہیں تھے کوئی شخص کیسے معلوم کرسکتا تھا کہ دوصدیاں پیشتر کسی خاص صورتِ حال میں پیغمبرؐ نے کیا کہا تھا یا کیا کیا تھا؟

الشافعیؒ، حنبلؒ اور اُن کے پیروکاروں نے، احادیث یا پیغمبرؐ کے ساتھ منسوب اور مبینہ طور پر آپ کے قریب ترین ساتھیوں سے مشاہدہ کئے گئے اقوال میں اپنے جوابات تلاش کئے (یہی وجہ ہے کہ اُنہیں اہلِ حدیث کہا جاتا ہے) یہ بیانات درحقیقت سُنی سنائی باتیں تھیں...... جن پر لوگ یقین کرتے تھے یا یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ یقین کرتے تھے کہ یہ وہ صحیح خبریں ہیں جو پیغمبرؐ کے دور سے چلی آرہی تھیں۔ مثال کے طور پر پیغمبرؐ کے ساتھیوں میں ایک حدیث بیان کرتی ہے ''ایک دن میں نے پیغمبرؐ کو مسجد کی طرف چل کر جاتے ہوئے دیکھا''...... پھر اس بیان کی تائید اوسطاً چھ یا سات لوگوں کی طرف سے کردی جاتی۔ جنہوں نے اس کہانی کو ایک دوسرے سے سُنا ہوتا ''یہ ہے جو کچھ ترمذی نے ابن مہدی کے ذریعے، اُس نے الثوری سے، اُس نے واصل اور منصور اور العمش سے، اُس نے ابی وائل سے اُس نے عمرو ابن شرحبیل سے اُس نے ابن مسعود نے سُنا جس نے کہا......''

یقیناً...... جیسا کہ ''ٹیلیفون کے کھیل'' میں ہوتا ہے...... یہ سوچنا انتہائی رجائیت پسندانہ ہے کہ اصل پیغام واسطوں کے اتنے لمبے سلسلے میں سے گزرتے ہوئے محفوظ رہا ہوگا۔ اس قدر مرصع کہانیوں کی موجودگی چیلنج کو اور بھی شدید کردیتی ہے۔ قرآن پیغمبرؐ کی زندگی کے دوران ہی لکھا گیا تھا، اور آپ کی وفات کے عین بعد قانونی شکل اختیار کرگیا تھا، لیکن احادیث محض زبانی روایات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی بھی ایسے شخص کیلئے ایک کھلا میدان تھا، جو کسی ایسے نقطۂ نظر کا جواز پیدا کرنے کیلئے جس میں وہ یقین رکھتا تھا یا کسی ایسے مفاد کو جائز قرار دینے کیلئے جس کی وہ پیروی کرتا تھا، کوئی مبینہ الفاظ پیغمبرؐ کے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس امر نے کہ احادیث الشافعیؒ یا اہلِ حدیث کے دوسرے حضرات کے تحت زیادہ مستند ہوگئیں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ترغیب

میں اضافہ کیا۔

لہٰذا، دوسری صدی کے آغاز میں پیغمبر ١ کی وفات کے بعد، دُنیائے اسلام حدیثوں کا ایک جنگل بن گئی، جس میں تقریباً ہر نقطۂ نظر کو جائز قرار دینے کیلئے احادیث موجود تھیں۔ عرب قوم پرستوں نے پیغمبرؐ کو عرب فوقیت کا قائل ثابت کرنے کیلئے بیانات گھڑے: دوسروں نے جلد ہی جوابی طور پر، ایرانیوں اور ترکوں کی تعریف کرنے والی احادیث گھڑیں۔ (۱۲) اور ایک اور جذبۂ محرکہ محض ذاتی مفاد تھا۔ ایک حدیث میں بیان کیا گیا کہ ''میٹھے بسکٹ'' آدمی کو مضبوط بناتے ہیں'' اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی کہ وہ شخص جس نے یہ حدیث پھیلائی، محمد بن حجاج محائی، بھلا اندازہ لگائیں کیا بیچتا تھا؟......(۱۳)

دوسری قسم کی جعلی احادیث اُن مکاتبِ فکر کی مذّمت کرنے کیلئے وضع کی گئیں جن سے اہلِ حدیث نفرت کرتے تھے۔

ایک حدیث میں مبینہ طور پر پیغمبرؐ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا ''میری اُمت میں سے دو گروہوں پر ستر انبیا نے لعنت کی۔ وہ قدریہ اور مُرجیہ ہیں'' (۱۴) یہ دونوں گروہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، آزادانہ مرضی کے حامی اور تکثیری کنندگان تھے۔ یہاں ایک واضح بیہودگی تھی، کیونکہ یہ گروہ پیغمبرؐ کی وفات کے کئی دہائیوں بعد ظہور میں آئے، لہٰذا آپ کو اُن کے بارے میں کبھی معلوم ہی نہ ہوا تھا۔ لیکن جہاں قرآن کا نبیؐ ایک منکسر المزاج شخص تھا جو کہتا تھا ''میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں'' (۱۵) اور ''میں غیب کا علم نہیں رکھتا'' (۱۶) وہیں احادیث نے آپ کو ایک ایسے عالمِ کُل مستقبل کی پیش گوئی کرنے والے کے طور پر پیش کیا، جو مستقبل کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔

یہ پیغمبرؐ جنہیں عظیم بنایا گیا اور اپنی منشا کے مطابق شکل دی گئی اپنے بعد آنے والے حکمرانوں پر تبصرہ کرسکتے تھے اور ایسی ناقابلِ یقین باتیں کہہ سکتے تھے جیسا کہ، ''اللہ تعالیٰ حکمران کے صرف اچھے اعمال کو لکھتا ہے اور بڑے اعمال نہیں لکھتا''۔ (۱۷) غالباً یہ ایسی موضوع حدیث تھی، جسے آٹھویں صدی کے اوائل میں، اُمیہ خُلفا کے ظلم اور بدعنوانی کو جواز دینے کیلئے، پھیلایا گیا۔

ایک اور دلچسپ حدیث کے بارے میں لگتا ہے کہ وہ، خصوصی طور پر، اُن لوگوں کی مذمت کرنے کیلئے وضع کی گئی، جو حدیث کی خبروں کیلئے زیادہ اطاعت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس

MashalBooks.org

حدیث میں مبینہ طور پر پیغمبرؐ کہتے ہیں، ''میں تم میں سے کسی ایسے شخص کو نہ پاؤں جو تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہو، اور جب اُس کے سامنے میری طرف سے کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی حکم آئے، تو کہے، میں نہیں جانتا [کہ آیا یہ فرض ہے یا نہیں]: ہم تو صرف اسی کی پیروی کریں گے جو ہم خُدا کی کتاب میں پاتے ہیں،'' (۱۸)

اسلام کی دوسری صدی کے آغاز پر، ہر شخص، بشمول احادیث کے انتہائی پُر جوش حامیوں کے، کو معلوم ہو گیا کہ وضع احادیث کی تعداد بہت حیران کُن ہے۔ اہل حدیث صرف یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وضعی احادیث میں سے مستند احادیث کو چھانٹی کرنا ممکن ہے اور یہ کہ اُنہیں ایسا جائزہ لینے کا اختیار ہے۔ لہٰذا، خود احمد حنبلؒ سے آغاز کر کے، اُنہوں نے بیانات کو جمع کرنا، اُن کے واسطوں کے سلسلے کی تفاصیل معلوم کرنا اور صحیح احادیث کے مجموعے تیار کرنا شروع کر دیا۔ ان علما میں سے نمایاں ترین، البخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے ۳۰۰،۰۰۰ سے زیادہ احادیث کے مجموعے میں سے ۲۶۰۲ کا انتخاب کیا۔ یہ چیز نہ صرف اُن غیر مستند احادیث کا اندازہ دیتی ہے، جو اُس وقت موجود تھیں، بلکہ اس امکان کا بھی، کہ البخاری نے صرف مستند احادیث ہی چُنی ہوں۔

بہر حال، جلد ہی صحیح البخاری اور دوسرے پانچ علما کے حدیث کے مجموعے اہل حدیث کے ہاں انتہائی قابلِ احترام ہو گئے، بلکہ مقدّس ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک بھی کہنا شروع کر دیا کہ احادیث اس قدر مستند ہیں کہ وہ قرآن کو منسوخ کر سکتی ہیں (تنسیخ کا یہ نظریہ الشافعی کی اختراعات میں سے تھا) (۱۹)

احادیث کے تفوّق کا یہ نظریہ، جو اُس پیغمبرؐ کی وفات کے دو سو سال بعد وضع کیا گیا۔ جس کی نمائندگی کا یہ دعویٰ کرتا ہے، فرانسیسی مورّخ میکسم روڈنسن (Maxime Rodinson) کے الفاظ میں ''بعد قرآن نظریہ'' کی تخلیق پر منتج ہوا۔ اور یہ اُس قرآن کے نظریے سے بالکل مختلف تھا، جو ''عقل اور دلائل کو زیادہ بڑا کردار دیتا تھا'' (۲۰)

''سخت گیری اور درشتی کی طرف''

اہل روایت کے عروج نے دُنیائے اسلام کی تاریخ میں ایک فیصلہ کُن موڑ کی نشاندہی کی۔ اُن کے احادیث کی بہت بڑی تعداد کو، بطور مستند مذہبی احکام کے متعارف کروانے کے ساتھ ہی

عقلی چھان بین کا دائرہ کم سے کم ہوتا گیا۔ اور شریعت بہت زیادہ جامد اصولوں کا ایک مجموعہ بن گئی۔ اسلامی قانون کے ایک سرکردہ مغربی دانش ور، جوزف سیکنٹ (Joseph Schocht) بیان کرتے ہیں کہ، یہ مکمل رُجحان ''سخت گیری اور درشتی کی طرف تھا'' (۲۳)

ستم ظریفانہ طور پر، اہل روایت جہاں عقلیت پرستی کی مخالفت پُر جوش طریقے سے بطور خطرناک ''بدعت'' کے کرتے تھے، وہیں پر وہ شریعت میں اپنی بدعات کو شامل کرتے تھے، جیسا کہ زانیوں کی سنگساری، مرتدین کا قتل، عورتوں پر سماجی پابندیاں، فن اور موسیقی پر پابندیاں شراب پینے کی سزائین، اور عصیاں کاری کی دوسری شکلوں کیلئے سزائیں۔ ان میں سے کوئی بھی قرآن میں نہیں ہیں۔ یہ سب کی سب احادیث میں ہیں۔

جو چیز شریعت کی اس سختی کا سبب بنی، وہ پیغمبر سے قبل کے قدیم مشرق کی روایات و اقدار کو اُبھارنا تھا۔ عورتوں کے حقوق کی تذلیل اس کی ایک مثال تھی۔ درحقیقت قرآن اور اس طرح پیغمبر نے آگے کو ایک زقند لگائی تھی۔ ۱

''اُنہیں عورتوں کو جائیداد اور بعض دوسرے حقوق عطا کرتے ہوئے، اور اُنہیں ایک حد تک، اپنے شوہروں کے بُرے سلوک کے خلاف حفاظت مہیا کرتے ہوئے ...... لیکن عورتوں کی حیثیت کمزور رہی، بلکہ اور زیادہ خراب ہو گئی جب، اسلام کے حقیقی پیغام نے، اس سلسلے میں اور بہت سے دوسرے سلسلوں میں اپنی قوتِ محرکہ کو کھو دیا، اور اسے پہلے سے موجود رویوں اور رواجوں کے اثر کے تحت تبدیل کر دیا گیا۔'' (۲۲)

یہ ''پہلے سے موجود رویے اور رواج'' شریعت میں اُن احادیث کے ذریعے داخل ہوئے جنہیں پیغمبرؐ سے منسوب کیا گیا۔ عورتوں کی علیحدگی ایک برمحل مثال تھی۔ قرآن نے علیحدگی کا حکم صرف پیغمبر محمدؐ کی ازواج کیلئے، اُن کے منفرد مرتبے کی ایک علامت کے طور پر دیا۔ لیکن بازنطینی اور ایرانی ثقافتوں میں، جو مسلمانوں نے بتدریج اپنائیں، اونچے طبقے کی عورتوں میں یہ رواج تھا کہ وہ سوائے اپنے مردوں کے باقی مردوں سے پردہ اختیار کرتی تھیں۔ اسلام کی مساوات نے متضاد طور پر اس اونچے طبقے کے پردے کو حدیث کے ذریعے پھیلا دیا، اور ''احادیث کے ذریعے حیا کے بارے میں قرآنی احکام کو پھیلا کر جدید دور کے مروجہ پردہ: اری کا احاطہ کرنے کیلئے اس پر منطبق کر دیا۔'' (۲۳)

MashalBooks.org

مشرقِ وسطیٰ کے زن بیزاری کے رویوں کے اسلام میں نفوذ نے بھی قرآن کی تعبیر کے انداز کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر، قرآن آدم وحوّا کی کہانی کے ممنوعہ پھل کو چکھنے پر خُدا کی رحمت سے دُھتکارے جانے کے متن کو پیش کرتا ہے لیکن عہد نامۂ عتیق کے برخلاف، یہ حوّا کی تصویر کشی بطور بہکانے والی کے نہیں کرتا، ......اُلوہی سرزنش آدم کو ملتی ہے۔ (۲۴) لیکن اسلام کی تیسری صدی کے بعد لکھی جانے والی قرآن کی تفسیروں میں'' حوا کو الزام دینا شروع کر دیا گیا۔ یہ اُس وقت واقع ہوا جب درجنوں نئی احادیث نمودار ہوئیں، جن میں عورتوں کو چالاک، خطرناک اور غیر اخلاقی مخلوقات کے طور پر بیان کیا گیا۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہمارے دور کے اسلامی نسائیت پرست اکثر اوقات، زن بیزاری کی احادیث کو جنہیں وہ ''نظریہ غلبہ ذکور'' کی پیداوار سمجھتے ہیں، کو چیلنج کرنے کیلئے قرآن کا علم بلند کرتے ہیں۔ (۲۵)

تصویر کشی اور مجسمہ سازی پر روایتی اسلام پابندی بھی، ایک حدیث کی پیدا کردہ بعد کی ایجاد تھی۔ اگر چہ زندہ شکلوں کی تصویر کشی قرآن میں واضح طور پر ممنوع نہیں ہے، لیکن ''بہت سے فقہا نے، حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے، یہ نظریہ قائم کیا کہ اللہ تعالیٰ کے، زندگی تخلیق کرنے کے کلی اختیار میں یہ ایک تجاوز ہے'' (۲۶) اسی طرح سود پر قرآنی پابندی کو حدیث کے ذریعے توسیع دی گئی، جو اس روایتی موقف پر منتج ہوئی کہ سود کی تمام شکلیں ممنوع ہیں۔ (۲۸) ایسی تحریکوں کے ذریعے شریعہ کے جمود کے ساتھ ہی، اسلام کی ابتدائی صدیوں کی حرکیت آہستہ آہستہ مرجھا کر ختم ہوگئی۔ (۲۹)

''سختی اور درشتی'' کی طرف اس رُجحان کا اظہار، نہ صرف مسلم معاشرے کے بالمقابل ہوا، بلکہ غیر مسلموں کے بھی۔ ذمیوں ......حفاظت یافتہ عیسائیوں، یہودیوں اور دوسروں، کے معاملات کو ضبط کرنے والے اصول......وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم روادارانہ ہوتے گئے، اور مسلمانوں نے، اکثر حدیثوں کے ذریعے، بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے رویے اپنائے۔ (۳۰)

جہاد کے فلسفے کو بھی، احادیث اور اُن کے حامیوں کی طرف سے زیادہ نمایاں کیا گیا۔ اوائل دور کے علما کا رُجحان، نماز اور مسجد کی حاضری جیسے مذہبی معمولات پر زیادہ زور دینے کی طرف تھا اور وہ جہاد کو مذہبی فریضہ نہیں سمجھتے تھے۔ (۳۱) مغربی مورخ این۔ کے این لیمٹن (Ann K. S.

Lambton) بیان کرتی ہے ''تاہم، عرب فتوحات نے اسلامی فکر کو ایک نفسیاتی موڑ دیا، جس کے نتیجے میں جہاد کے فریضے کی، روایات (یعنی احادیث) میں، قدر و قیمت بہت بڑھا دی گئی۔'' (۳۲)

احادیث کے سب سے بڑے علمبردار، الشافعیؒ، یہاں خصوصی طور پر موثر تھے۔ اُنہوں نے یہ نظریہ پروان چڑھایا کہ قرآن کی زیادہ امن پسندی والی آیات، ''سیف کی آیات'' سے منسوخ کر دی گئی ہیں جبکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اُن کے حوالوں کو مختلف تناظرات میں دیکھا جائے ......یعنی جنگ کرنے والوں کے ساتھ جنگ اور دوسروں کے ساتھ امن''۔ (۳۳) اُنہوں نے دُنیا کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا......دارالاسلام اور دارالحرب، اور ان دونوں کے درمیان مسلسل جنگ کا تصور قائم کیا، الشافعی کے بعد کے سیاسی نظریہ سازوں نے اس نظریے کو یہ ادّعا کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں جگہ دی کہ خلیفہ کے فرائض میں ایک فریضہ ''جہاد کو، سال میں کم از کم ایک دفعہ جہاد کا آغاز کرنا تھا'' اگر چہ اس سے بہت سے حنفیوں نے اختلاف کیا اور یہ استدلال کیا'' کہ کفار کے ساتھ صرف اس وقت جنگ کی جا سکتی ہے اگر وہ مسلح تصادم کی طرف رُخ کریں'' (۳۵)

بلا حیرت، اہلِ عقل، زیادہ عقلیت پسند واقع ہوئے۔

احادیث کا جائزۂ نو

یہاں مجھے ایک مختصر سا تبصرہ پیش کرنا چاہیے تا کہ احادیث کی محض ایک سادہ تصویر کشی سے اجتناب کیا جا سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سب کی سب وضعی ہیں، اور نہ ہی اُن سب کا مواد ناگوار ہے۔ بلاشبہ، بہت سی روح پرور احادیث ہیں، جن میں سخاوت، رحم اور دیانت داری کے بارے میں اچھی اخلاقی تعلیمات موجود ہیں۔ مزید برآں، ایک ایسے اسلام کا تصور جو احادیث سے بالکل عاری ہو......جیسا کہ کُلی طور پر کتاب مقدس کو تسلیم کرنے والے قسم کے ہمارے دور کے اصلاح پسند تجویز کرتے ہیں......موزوں نہیں ہے۔

کم از کم بھی، اُن تاریخی معلومات کے بغیر جو احادیث ہمیں مہیا کرتی ہیں، قرآن کے تناظر کو سمجھنا ناممکن ہو جائے گا......جو اکثر اوقات اس کے مفہوم کو سمجھنے کیلئے لازم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا، مسئلہ احادیث کے لٹریچر کی موجودگی کا نہیں ہے، بلکہ اُس طریقے کا ہے، جس سے

MashalBooks.org

انہیں برتا جاتا ہے۔اہل روایت نے ان بیانات کو ایک ایسے مقدس ذریعے میں تبدیل کر دیا، جس کی صرف اطاعت کی جا سکتی ہے اور اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ بالکل شعوری طور پر اُنہوں نے احادیث کو انسانی عقل سے برتر درجہ دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ، کسی حدیث کو قبول کرتے وقت، وہ جس کسوٹی کو مدِّ نظر رکھتے تھے، وہ اس کے واسطوں کا سلسلہ تھا......اور نا کہ اس کا مواد۔

لیکن اہل عقل نے، جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، احادیث کو پرکھنے کیلئے عقل کا استعمال کیا۔ خصوصی طور پر، معتزلہ ''پیغمبر کے بارے میں ان روایات کے مواد کے عقلی مفہوم کو، ان کی صحت کا زیادہ اہم پیمانہ سمجھتے تھے، ساتھ ہی ساتھ واسطوں کے سلسلے کے تجزیے کو بھی'' (۳۶) اس کتاب کے اندر، ہم دیکھیں گے کہ کچھ معاصر مسلمان مصلحین، حدیث کے لٹریچر کے ایسے عقلی جائزۂ نو کی وکالت کرتے ہیں۔

بیت الحکمتہ

اہلِ روایت اور اُن کے خیالات سے متعارف ہو جانے کے بعد آیئے اُس کہانی کی طرف واپس چلتے ہیں، جس سے اس باب کا آغاز ہوا تھا: یعنی ''انقلابی مذہبی عالم'' امام احمد بن حنبلؒ اور اہل عقل کے خلاف اُن کی مہم۔

دُنیائے اسلام کے یہ دونوں گروہ (اب کے بعد انہیں اہلِ روایت اور اہل دلیل کہا جائے گا) اپنی تصوّرات کی جنگ میں کم از کم پانچ صدیوں تک اُلجھے رہے......آٹھویں صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک۔ اس سارے عرصے کے دوران، اہل روایت کو اکثر اوقات سیاسی حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل رہی۔ ابتدائی نویں صدی میں ایک مختصر عرصے کیلئے دلیل پرستوں نے سیاسی حکام کی حمایت بلکہ فعّال مدد حاصل کی......ایک ایسی مدد جو نعمت سے زیادہ زحمت ثابت ہوئی۔

آیئے جائزہ لیں کہ اس سیاسی عامل نے اپنا کام کیسے کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اُموی خلفا نے، آزادانہ مرضی کے حامیوں کے خلاف تقدیر پرستوں کی حمایت کی محض اپنی بدعنوان حکومت کو جواز بخشنے کیلئے۔ لیکن، ایسی تمام کوششوں کے باوجود اُمویوں کا تختہ ۷۴۹ میں اپنے مخالف عباسی خاندان کی طرف سے اُلٹ دیا گیا۔ موخرالذکر دُنیائے اسلام میں بہت اہم تبدیلیاں لے کر آئے، اپنے پیشروؤں کے عرب برتری کے رویوں کا خاتمہ کرتے ہوئے، اور غیر عرب مسلمانوں، جیسا کہ ایرانیوں اور ترکوں کو، ممتاز مناصب پر فائز ہونے کی اجازت دیتے ہوئے۔

عباسیوں نے دُنیائے اسلام کے دارالخلافہ کو، اُمویوں کی بنیاد، دمشق سے عراق منتقل کر دیا ...... پہلے کوفہ اور پھر اپنے بنائے ہوئے نئے شہر، بغداد میں خوبصورت سبزہ زاروں باغات، رہائش گاہوں، نہروں، اور سیر گاہوں والے اس شہر نے جلد ہی دُنیا کے خوصبورت ترین شہر کی شہرت حاصل کر لی۔ یہ ابتدائی قرونِ وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کے سنہری دور کی ایک تماشا گاہ بھی بنا، جو ہارون الرشید کے تیئس سالہ (۸۰۔۷۸۶) عہد حکومت کے دوران عروج پر رہا۔ جس کے شاندار دربار نے الف لیلیٰ کی داستان کو تحریک دی۔

۸۱۳ میں، ہارون کا بیٹا المامون، جو کہ عقیدے کے لحاظ سے ایک دلیل پرست تھا، عباسی تخت پر بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نوجوان خلیفہ نے ایک مرتبہ ایک خواب دیکھا جس میں اُس نے ارسطو کو دیکھا، جس نے اُسے بتایا کہ ''عقل اور وحی'' نا صرف یہ کہ ایک دوسرے سے موافق ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں، اور یہ کہ ایک اچھے مسلمان حکمران کو دونوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے (۳۷) لہٰذا، المامون نے ایک اکیڈمی کی بنیاد رکھی، جس کا نام بیت الحکمہ تھا، جہاں قدیم یونان کی فلسفیانہ اور سائنسی، تصانیف، بشمول ارسطو کی تمام بڑی تصانیف کے، عربی میں ترجمہ کیئے گئے۔ بڑے بڑے ذہن، جیسا کہ ''عرب کے فلسفی'' الکندی، اور ریاضی دان الخوازمی، جس کے نام سے لفظ الگورِتھم وجود میں آیا، اس اکیڈمی میں ملازم تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بے شمار عیسائی بھی۔

بطور ایک دلیل پرست کے، المامون مذہبی مباحثوں میں دلچسپی رکھتا تھا، بشمول بین المذاہب مباحثوں کے۔ اُس نے، شام کے ایک یونانی آرتھوڈاکس بشپ، القرا کو اپنے دربار میں بُلایا، اور موخرالذکر نے عیسائی مذہب کا دفاع کیا، جبکہ خلیفہ نے اس کے دلائل کو رد کرنے کی کوشش کی ...... سب کے سب ایک مہذب طریقے سے۔ المامون اور اُس کے جانشین، عیسائیوں، یہودیوں، زُرتشتوں، بُدھوں اور بہت سے دوسروں کے ساتھ بات چیت کو خوش آمدید کہتے تھے......اس طرح دُنیائے اسلام کے ذہنی طور پر ترقی کرنے میں مدد ملی۔ (۳۸)

یہاں تک تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن اپنی حکومت کے نویں سال میں، المامون نے ایک تباہ کُن فیصلہ کیا، جس نے اُس کے تمام اچھے کاموں کو داغدار کر دیا۔ روایت پرستوں کیلئے اُس کی ناپسندیدگی ...... جنہیں اُس نے نہ صرف ''اُجڈ'' پایا بلکہ سیاسی طور پر مشکوک بھی ...... اُسے مِحنہ

شروع کرنے کی طرف لے گئی۔ جو ''قرآن مخلوق'' کے نظریے کو تمام علما پر عائد کرنے کی خاطر ایک طرح کی سرکاری تحقیقات تھیں۔ (۳۹) روایت پسند گروہ کی نمایاں شخصیات، بشمول احمد حنبلؒ، کو گرفتار کرلیا گیا، اُن سے پوچھ گچھ کی گئی، اور بعض صورتوں میں، اُنہیں قرآن کو ''غیر مخلوق'' کہنے کے اصرار پر کوڑے بھی مارے گئے۔ یہ ظالمانہ حکمتِ عملی، المامون اور اُس کے دو جانشینوں کے تحت سولہ سال تک جاری رہی، اور فطری طور پر اس نے نہ صرف بغداد میں بلکہ پوری مملکت میں ایک دہشت پھیلا دی۔

اس بے ڈھنگی تحقیقات کے پیچھے صحیح جذبۂ محرکہ اور اُس کے مجرم کون تھے؟ طویل عرصے سے یہ ایک متازعہ مسئلہ ہے۔ ''مخلوق قرآن'' یقین ایک ایسا نظریہ تھا جس کی علمبرداری معتزلہ نے کی، اور اگرچہ وہ براہِ راست محِنہ کے ذمہ وار نہ تھے، لیکن اُن کا نظریاتی تعلق اُن کے بارے میں شک پیدا کرتا ہے۔ (۴۰) ایک موزوں تشریح، جو احمد حنبلؒ اور دلیل پرستوں کے خلاف اُن کی مہم کے ساتھ ہماری سابقہ آگاہی کی روشنی میں کچھ مفہوم رکھتی ہے، نمروڈ ہروِٹز کی طرف سے پیش کی گئی ہے، جو کہ حنبلی مکتب فکر کی تشکیل کا ایک ماہر ہے۔ وہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ محنہ کی حمایت دلیل پرست علما کی طرف سے، بجائے ایک حملے کے ''ذاتی دفاع کے ایک اقدام'' کے طور پر کی گئی ہوگی ......روایت پرستوں کی ''خوف زدہ کرنے'' کی تراکیب سے مایوس ہوکر، جو دلیل پرستوں کو مسلسل مرتد کہتے تھے، موخرالذکر نے، لگتا ہے، محنہ کو ایک محافظ حیات پایا ہوگا، کیونکہ اس نے اُن لوگوں کو خاموش کردیا، جنہوں نے اُنہیں دہشت زدہ کیا ہوا تھا، اور اُنہیں ''اپنے سر پر اُٹھانے، اپنے خیالات کا ظہار کرنے اور معاشرے میں اپنا موزوں کردار ادا کرنے'' کے قابل بنایا۔ (۴۱)

لیکن پھر بھی، ''جو کوئی میرے جابر کو دباتا ہے وہ ٹھیک ہے'' کا یہ نقطۂ نظر یقیناً غلط تھا۔ اسے معتزلہ اور دوسرے ایسے لوگوں کی، جنہوں نے محنہ میں اتحاد کیا، کی ایک تاریخی غلطی کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اور غالباً اُن بعض اصلاحاتی ذہن رکھنے والے آج کے مسلمانوں کو، جو معاصر روایت پرستوں کے خلاف آمرانہ اقدامات کی حمایت کرنے کا رُجحان رکھتے ہیں، اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

ایک مزید سبق اس حقیقت سے حاصل ہوسکتا ہے کہ محنہ مکمل ناکامی پر منتج ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ روایت پرست اپنے نظریات میں مستحکم ہوئے بلکہ اس تفتیش نے، اُنہیں مزید مقبولیتِ عام

حاصل کرنے میں مدد دے کر اُنہیں عوامی ہیروؤں میں تبدیل کردیا، اور جلد ہی اُنہوں نے غلبے کا اپنا موقع حاصل کرلیا۔

عقلیت پسندی کی تباہی

۸۵۷ میں، عباسی خلافت خاندان کے ایک نئے فرد، المتوکل کو منتقل ہوگئی۔ وہ المامون کا بھتیجا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کی ٹھیک ٹھیک ضد تھا۔ اُس نے نہ صرف محنہ کو ختم کردیا، بلکہ سرکاری پالیسی کو اُلٹ دیا، اور احمد حنبلؒ جیسے روایت پرستوں کے نظریات کو بطور سرکاری نقطۂ نظر کے اپنا کر اُنہیں مکمل حمایت دی۔

اب معتزلہ حلقہ بدر تھے۔ المتوکل نے اعلان کیا کہ ''ہر وہ بحث کسی ایسی چیز کے بارے میں، جس پر پیغمبرؐ نے بحث نہیں کی، ایک غلطی ہے'' (۴۲) اُس نے روایت پرستوں کو معتزلہ کے خلاف تبلیغ کرنے کا حکم دیا، جنہیں جلد ہی تمام سرکاری عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ (۴۳) بیت الحکمہ نے خلیفہ کی حمایت کھودی اور زوال پذیر ہوگیا۔ اس کے سرکردہ علما میں سے ایک، الکندی کو، جس نے فلسفہ، طبعیات، کیمیا، طب، نفسیات، یہاں تک موسیقی کے نظریے، پر ۲۵۰ سے زیادہ مقالات تحریر کئے پیٹا گیا، اور اُس کی لائبریری کو ضبط کرلیا گیا۔ روایت پرستی انتقام کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔

المتوکل نے غیر مسلموں کو بھی دبا کر رکھا۔ اُس کی حکومت میں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اُن کے سماجی مرتبے سے کافی حد تک محروم کردیا گیا: اور اُنہیں امتیازی لباس پہننے پر مجبور کیا گیا۔ بغداد میں کچھ کلیساؤں اور کنیوں کو ڈھا دیا گیا، اور مستقبل کیلئے مساجد بنانے کیلئے ہر دسویں عیسائی یا یہودی گھر کو ضبط کرلیا گیا۔ المتوکل نے یہاں تک ''حکم دیا کہ شیطانوں کی لکڑی کی بنی ہوئی تصویریں اُن کے'' (غیر مسلموں کے) گھروں کے دروازوں پر گاڑ دی جائیں تا کہ اُن کی مسلمانوں سے تمیز ہو سکے۔ (۴۴)

بدتر بات یہ ہے کہ، المتوکل کی پالیسیاں قائم رہنے والی تھیں۔ روایت پرست سرکاری حمایت حاصل کرتے رہے اور ''خلافت کے ادارے کے پُرجوش حامی بن گئے'' (۴۵) اُن میں سے سب سے زیادہ انتہا پسند، یعنی حنبلی، تخت کی سرپرستی کے تحت زیادہ فعال ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء میں مسلم مصنف ابن الاثیر نے لکھا:

MashalBooks.org

''اُس سال، جب اُن کا غصہ زیادہ شدید ہوگیا، تو حنبلی معاملہ زیادہ تکلیف دہ ہوگیا۔ اُنہوں نے کمانڈروں اور عام آدمیوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیئے اور اگر انہوں نے شراب دیکھی تو اسے اُنڈیل دیا، اور اگر اُنہوں نے کوئی گاتی ہوئی لڑکی دیکھی تو اسے پیٹا اور اُس کے آلات توڑ دیئے۔ وہ خرید وفروخت کے راستے میں رُکاوٹ بنتے تھے، اور اُن مردوں کو جو عورتوں اور جوانوں کے ساتھ چل رہے ہوتے تھے ان کے ساتھیوں کے بارے میں سوال وجواب کرنے کیلئے روک لیتے تھے۔ اگر اُن کے جوابات اُنہیں مطمئن کرنے میں ناکام رہتے تو وہ مردوں کو مارتے اور اُنہیں پولیس کے سربراہ کے پاس گھسیٹ کر لے جاتے اُن کے غیر اخلاقی اقدامات کی تصدیق کرتے۔ حنبلیوں نے بغداد میں انتشار پیدا کر دیا'' (۴۶)

گیارھویں صدی کے آغاز میں، المتوکل کی پالیسی کا احیا اُس کی اولاد میں سے ایک شخص، عباسی خلیفہ القادر نے کیا، جس نے تمام ''جدیدیوں'' اور خاص طور پر دلیل پرست معتزلہ اور حنفی علما کو بلایا تاکہ وہ اپنے گمراہ طور طریقوں سے ''توبہ'' کریں۔ اُن لوگوں کو۔ جنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا، کسی قسم کے مذہبی یا عدالتی کام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ خلیفہ کا ایک سخت گیر منظورِ نظر مصاحب، محمود غزنوی، جو کہ آج کے ایران، افغانستان اور پاکستان کے وسیع علاقے پر محیط مملکت کا حکمران تھا، اس پالیسی کو انتہا تک لے گیا۔

اُس نے تمام معتزلہ اور دوسرے ملحدین کو ''پھانسی پر لٹکانے، قید میں ڈالنے، (یا) ملک بدر کرنے'' کے ذریعے قتل کرنے کی وحشیانہ مہم کا آغاز کیا۔ اُس نے ''اُن پر مسلمانوں کے منبروں سے لعنت بھیجنے کا (بھی) حکم دیا، اور اُس نے اہلِ البدعہ کے ہر گروپ کو دھمکی دی، اور اُنہیں اُن کے گھروں سے نکال دیا'' (۴۷)

پیچھے بغداد میں خلیفہ نے جلد ہی حالات کا مقابلہ کیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ کسی بھی ایسے شخص کو جو، قرآن کو مخلوق کہے گا...... جو معتزلہ کے مذہبی نظریے کا بنیادی پتھر تھا...... اسے کافر سمجھا جائے گا، اور اُس کا خون بہایا جائے گا۔ (۴۸)

اس سارے اندرونی تعصّب کے علاوہ، اسلامی عقلیت پسندی کو اور حقیقتاً خود دُنیائے اسلام کو، سب سے تباہ کُن دھچکا، ایک بیرونی خطرہ تھا:۔ یعنی وسط تیرھویں صدی کی ''منگول آفت''، چنگیز خان اور اُس کے جانشینوں نے شرقِ اوسط کو روند ڈالا، اور شام اور ہندوستان کے

درمیان ہر چیز کو فتح کر لیا۔ تمام حملہ آور وحشی ہوتے ہیں، لیکن منگولوں کی دہشت گردی ''بے مثال'' تھی، کیونکہ وہ ''تباہی کو تباہی کی خاطر پسند کرتے تھے'' (۴۹) جب اُنہوں دُنیائے اسلام میں سے مارچ کیا،

> 'بار بار، کسی شہر کی تقریباً تمام آبادی کا بلا لحاظ جنس وعمر قتلِ عام کیا جاتا تھا، صرف مہارت یافتہ کاریگروں کو بچاتے، اور وہاں سے منتقل کرتے: یہاں تک کہ کسان بھی اس میں شامل ہوتے تھے، جنہیں فوج کے آگے، تیروں کو جذب کرنے اور خندقوں کو بھرنے کیلئے، اینٹ روڑے کے زندہ مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔'' (۵۰)

۱۲۵۸ میں، منگولوں نے بغداد کو تباہ کر دیا...... جو کہ اُس وقت اگر دُنیا کا نہیں تو کم از کم دُنیائے اسلام کا سب سے متحرک اور سب سے مہذب شہر تھا۔ اُنہوں نے تقریباً ساری مسلمان آبادی کو، بشمول خلیفہ قتل کر دیا، اور بیت الحکمہ کو، معتزلہ اور اسلام کے دوسرے دانشوروں کی شاندار تصانیف کے مجموعے سمیت تباہ کر دیا۔ یہ کہا گیا کہ دریائے دجلہ میں اس قدر مسوّدات پھینکے گئے کہ ان کی سیاہی سے دریا کئی دنوں تک سیاہ رہا۔ (۵۱) منگولوں نے مشرقِ وسطیٰ کے آبپاشی کے نظاموں کو بھی تہہ وبالا کر ڈالا، اور اسی طرح اس کی زرعی پیداوار کو پہلے کی نسبت دسویں حصے تک کم کر دیا (۵۲) یہ ایک ایسی زبردست تباہی تھی، جس سے یورپ کا بچ جانا ایک خوش قسمتی تھی۔ (۵۳)

ایسی ہی تباہی، تین صدیاں بعد، دُنیائے اسلام کے مغربی کنارے، سپین، سے ٹکرانے والی تھی۔ وہاں کی مسلم بادشاہت، جو اندلس کہلاتی تھی، نے دلیل پرست مکتبِ فکر کی ذہنی تہذیب کو محفوظ رکھا تھا، ساتھ ہی ساتھ فن اور فن تعمیر کے شاندار نمونوں اور تین مذاہب کے درمیان ثقافتی تصورات کی روح کو بھی...... مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی ملاپ اور رواداری کے تصورات ثقافتی اور شہری تعاون کو۔ (۵۴) اگرچہ جیسا کہ بغداد میں ہوا، قرونِ وسطیٰ کی خرد افروزی کو پہلے اندرونی تعصب اور بعد میں بیرونی حملے سے زخم لگے۔ مسلم سپین کی مالا مال لائبریریوں پر، پہلے شمالی افریقہ کے خارجیوں کی طرح کے عسکریت پسند مسلمانوں کی طرف سے، اور پھر ہسپانوی تسخیرِ نو کی طرف سے حملہ ہوا، جس نے تمام مسلمانوں اور یہودیوں کو جزیرہ نمائے آئی بیریا سے نکال باہر کیا۔ (۵۵) جب اِنکویزیٹر زِمینیز ڈی سِسنروز (Inquisiton Ximenez de

Cisneros) نے ۱۴۹۹ میں غرناطہ میں کوئی اسی ہزار کتابوں کو جلانے کا حکم دیا، ''اسلامی تعلیمات کے تمام نشانات مٹانے کیلئے'' تو حقیقت میں وہ جس چیز کو مٹا رہا تھا وہ اسلام کا بہترین سرمایہ تھا۔(۵۶)

سُنّی اسلام کے رنگ جو اتنے متحد نہیں ہیں

اسلام کے روایت پرستوں کے درمیان نظریات کی جنگ طویل اور پیچیدہ تھی، اور ہم نے اس عجیب وغریب کہانی کی صرف موٹی موٹی سُرخیوں کا احاطہ کیا ہے۔ لُبِّ لباب کی شکل میں اس کا نتیجہ روایت پرستوں کی جیت اور دلیل پرستوں کی ہار کی شکل میں نکلا۔ یہ اُس رُجحان کا ملخص تھا، جو اسلام کی تیسری صدی میں شروع ہوا، اور اُس نے پانچویں صدی میں قطعی شکل اختیار کی۔ روایت پرستوں کی فتح کے مسلم فکر پر مستقل اثرات ہوئے۔ ''بہت اوائل کے دور میں مسلمانوں نے قرآن کی تعبیر خاصی آزادانہ طور پر کی، ممتاز مسلم جدید مذہبی عالم، مرحوم فضل الرحمٰن ذکر کرتے ہیں، ''لیکن دوسری صدی کے بعد......قانونی ماہرین نے اپنے آپ کو اور معاشرے کو صاف طریقے سے باندھ لیا......اور مذہبی علم لفظ پرستی کے بوجھ تلے دفن ہوگیا۔'' (۵۷) روایت پرستوں نے، قرآن کی انفرادی رُوح کو بھی نظرانداز کردیا، کیونکہ وہ ''فرد اور اُس کے ذاتی تجربے کی پروا نہیں کرتے تھے۔'' اس کی بجائے وہ ''تقریباً کُلّی طور پر اسلام کے سماجی مواد پر [زور دیتے تھے]...... اور [اور] فرد کو تخلیقی سوچ کا حق دینے سے انکار کرتے تھے۔'' (۵۸)

اتنا جلدی جتنا کہ اسلام کی تیسری صدی (دسویں صدی) میں، روایت پرست یہ استدلال کرنے لگے تھے، کہ وہ تمام مسائل جن کا مسلمانوں کو سامنا ہوسکتا تھا، حل ہو چکے ہیں، اور اب مزید تحقیقات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُنہوں نے واضح طور پر یہ دعویٰ کیا کہ اجتہاد (آزادانہ استدلال) کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

اسلام میں صوفی ازم یا تصوّف کی روایت کا بطور نویں صدی اور اس کے بعد کے ایک عوامی رُجحان کے ظہور کے لحاظ سے، اس سخت اور تنگ قانون پرستی سے باہر تازہ ہوا تلاش کرنے اور فرد کیلئے جگہ تلاش کرنے کی ایک کوشش تھی۔ (۵۹) اس بات پر غور کرنا اہم ہوگا کہ، اگرچہ اس کے خلاف بھی نظریات موجود ہیں، لیکن صوفی ازم کی اصل قرآن میں ہے، (۶۰) اور اس کی معتزلہ

کے ساتھ کچھ مشترک بنیادیں ہیں۔(۶۱)

تاہم، روایت پرست ایک متحد گروہ نہ تھے۔ دلیل پرست مکتبِ فکر کی وراثت کلی طور پر ختم نہ ہوئی تھی، اور اس نے کچھ روایت پرست مکاتِب فکر میں راہ پالی۔ جو کچھ عقلیت پسندی اور کٹڑ پن کے درمیان ایک طویل تنازعے کے اختتام پر ظاہر ہوا، وہ ایک سیدھی سادی تقسیم کی بجائے، فکر کا ایک طیف تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، روایت پسند گروہ میں سب سے زیادہ معتبر نام، الشافعیؒ کا تھا، جن کے ماننے والوں نے شافعی مکتبِ فکر قائم کیا۔ اُن کا طریقِ کار اس قدر حاوی ہوگیا کہ جلد ہی، حدیث کی طرف کم رُجحان رکھنے والے مالکی، اور سابقہ دلیل پرست حنفی بھی، شافعی کے نقطۂ نظر کے قریب ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے باوجود، حنفی مکتبِ فکر، جسے بعد میں عثمانیہ اور مغل سلطنتوں نے اپنایا، نسبتاً معقولیت پسند، لچکدار اور نرم رہے۔

مذہبی فکر میں، شافعی نقطۂ نظر کا مثنیٰ اشعریت تھا، جس کا بانی دسویں صدی کا عالم الاشعری تھا جو کہ ایک سابقہ معتزلی تھا، جس نے پیغمبرؐ کو خواب میں دیکھنے کے بعد ''توبہ کرلی'' ...... اپنے مناظرات میں اُس نے عقلیت پسندانہ طریقِ استعمال کیا لیکن اس نے اسے عقلیت پسند نظریات کو رد کرنے اور روایت پرست نظریات کا دفاع کرنے کیلئے استعمال کیا، جیسا کہ تقدیر پرستی، رضا کاریت، اور نظریۂ مشیّت الٰہی (یعنی قوانینِ فطرت کا ردّ)۔ اس نے اس بات پر اصرار کیا کہ انسانی عقل یہ فیصلہ نہیں کرسکتی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے ...... جو کہ وہ نقطۂ نظر ہے جو، تمام جوابات سنت میں تلاش کرنے کی، روایت پرست فقہا کی کوششوں کا جواز پیدا کرتا ہے۔

زیادہ عقلیت پسند حنفی مکتبِ فکر نے اپنا دینیاتی تکملہ ماتُریدی مکتبِ فکر میں پایا، جس کی بنیاد دسویں صدی میں الماتُریدی نے رکھی۔ اُس کے، انسانی عقل اور مرضی کو زیادہ وزن دینے کی وجہ سے، اُس کے نظریات کچھ معتزلی اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر الاشعری سے اختلاف کرتے ہوئے، الماتُریدی نے یہ استدلال کیا کہ انسانی عقل، وحی کی مدد کے بغیر، صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرسکتی ہے۔(۶۲)

اسی دوران میں، روایت پرستوں کے گروہ میں سب سے زیادہ انتہا پسندانہ موقف، جو امام حنبل کی طرف سے اپنایا گیا، جلد ہی، حنبلیّت میں تبدیل ہوگیا، جو کہ چار بڑے سنی مکاتب فکر میں

MashalBooks.org

سے سب سے زیادہ کٹڑ مکتب فکر ہے......اس کے پیرکار ''جدّت'' کی تمام شکلوں اور عقلی بحث کی کسی بھی شکل کی مخالفت کرتے تھے۔ اُن کا نظریہ اس قدر غیر عملی تھا، کہ یہ مسلمانوں میں بہت کم موثر رہا، اور صرف بحران کے اوقات میں دوبارہ زندہ ہوتا رہا، جیسا کہ تیرھویں صدی میں تباہ کُن منگول حملے کے دوران۔

اٹھارویں صدی نے، صحرائے عرب میں، ایک اور انتہا پسند مذہبی پیشوا، محمد ابن عبدالواہاب کی زیرِ قیادت، حنبلی مکتبِ فکر کی حیرت انگیز، حیات نو دیکھی ......اُس کے پیروکاروں نے، سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک عسکری مہم شروع کی، جس کی وہ صوفی ازم اور دوسری ''بدعات'' کی وجہ سے مذمّت کرتے تھے۔ سلطنت نے بعد کے دور کے ان حنبلیوں کو قابو میں رکھا......جن کے اندر ''خارجیوں کا ساجذبہ'' تھا......جنگِ عظیم اوّل تک، جب سلطنتِ برطانیہ نے عثمانی طاقت کو تباہ کرنے اور عرب کو ایک خودمختار ریاست بنانے کا فیصلہ کیا۔(۶۳)

جلد ہی عرب سعودی عرب بن گیا، اور وہابیت اس کا سرکاری نظریہ بن گیا۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ یہ ملک دُنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر کی چوٹی پر بیٹھا ہے......ایک ایسا ذریعہ جسے سعودی مسلم دُنیا کے چاروں کونوں میں اپنے غیر لچکدار نظریے کا پرچار کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں، یہ ایک ایسی کامیابی تھی، جس کا، امام حنبلؒ، جنہوں نے ''سختی اور درشتی'' کی قیادت کی، کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

MashalBooks.org

باب 5

برفانی تودے کے نیچے صحرا

ان منافقین میں جو دیہاتی لوگ ہیں وہ کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔ ان کو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم ہی نہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ۱ پر نازل فرمائے ہیں۔

قرآن: ۹۔۹۷ مولانا اشرف علی تھانوی

اسلام میں دلیل پرست مکتبِ فکر کا زوال، اور روایت پرست مکتبِ فکر کی فتح ایک بہت مشہور کہانی ہے......اور اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ کچھ ناقدین نے یہ استدلال کیا ہے کہ دلیل پرست مکتبِ فکر قدیم یونان سے درآمد شدہ ایک اجنبی تھا، جسے بہرحال ''قرآنی تصور دُنیا کے ساتھ غیر موافق'' ثابت ہونا تھا۔ (۲) تاہم، جیسا کہ ہم نے دیکھا، یہ قرآن کا تصور دنیا نہیں تھا، بلکہ بعد از قرآن روایت تھی، جس نے اسلامی عقلیت پسندی کو گہنا دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟

کچھ لوگوں نے اس کا جواب، کچھ مخصوص افراد، جیسا کہ بارھویں صدی کے امام الغزالی جیسے موثر شخص پر الزام دینے سے دیا۔ اُن کے شاہکار، ''فلسفیوں کی بے ربطی'' تہافتہ الفلاسفہ بلاشبہ فلسفہ کیلئے ایک شدید دھچکا تھا، جو کہ ایک ایسی اصطلاح تھی، جو اس وقت سیکولر علم کے تمام ذرائع پر دلالت کرتی تھی۔ الغزالی پر یہ تنقید بھی کی جاتی ہے کہ اُنہوں نے تنقیدی سوچ کی بجائے، بلا چون و چرا اطاعت پر مبنی مذہبی شعور کو پروان چڑھایا۔ (۳) لیکن کیا ہم الغزالیؒ کے اثر کو دُنیائے

اسلام کے جمود کی علّت سمجھیں یا اُس کا نتیجہ؟ (۴) بہرحال، دوسرے مفکرین، جیسا کہ عظیم ابنِ رُشد (Averroes)، جس نے الغزالی کا ردّ کیا اور اپنی تصنیف ''بے ربطی کی بے ربطی'' Incoherence of the Incoherence میں ''فلسفے'' کا دفاع کیا، عقلیت پسندی کی فتح کی قیادت کر سکتے تھے تو کیا پھر اس میں کوئی ایسا فیصلہ کُن عامل تھا، جس نے اسلامی فکر میں ایک نقطۂ نظر کو دوسروں پر ترجیح دی؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ، سیاسی حاکمیت، اُمیہ اور عباسی خلافتوں نے، اکثر اوقات روایت پرستوں کیلئے اپنی حمایت پیش کر کے، اس کہانی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک سطحی دلیل ہوسکتی ہے؟ کیونکہ یہ بھی ہمیں اس حیرت میں چھوڑ دیتی ہے کہ سیاسی اقتدار نے اس انداز سے کام کیوں کیا اور اس کے فیصلے اس قدر فیصلہ کُن کیوں تھے۔

چیزوں کو تناظر میں رکھنے کیلئے، یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ تنازع، جس نے دُنیائے اسلام کو پریشان کو......(عقلیت پسندی بمقابلہ کٹڑپن)......عیسائی دُنیا میں بھی واقع ہوا تھا۔ ابتدائی دور کا عیسائی عالم، طرطولیان، جس نے تثلیث کا لفظ وضع کیا، دلیل پرستی کا شدید مخالف تھا'' جسے وہ کافر یونانیوں کی طرف سے آنے والا بھٹکا ہوا اثر سمجھتا تھا۔ ''اب جبکہ ہمارے پاس یسوع مسیحؑ ہیں، ہمیں عجیب وغریب سوالات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے لکھا ''نہ ہی اب ہمیں کسی تحقیقات کی ضرورت ہے جبکہ ہمارے پاس انجیل ہے'' (۵) ''نظریہ تیقن''......بغیر دلیل کے یقین...... پر اُس کا اصرار، کیتھولکس کے ہاں اُنیسویں صدی تک بھی ایک رُجحان کے طور پر باقی رہا۔

لیکن عیسائیت کی تاریخ میں کسی نقطے پر، دلیل پرستانہ نظریہ زیادہ حاوی ہوگیا، جبکہ اسلام میں اس کے برعکس واقع ہوا۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ، مشعل ایک سے دوسرے کو منتقل ہوگئی۔ جبکہ ابنِ رُشد کے عقلی عقیدے کے دفاع کا دُنیائے اسلام میں بہت کم اثر ہوا، وہیں پر اس نے سینٹ تھامس ایکویناس کو بہت زیادہ متاثر کیا، جس کے فلسفہ، سائنس اور مذہب کے ملاپ نے، مغرب میں جدیدت کا راستہ کھولا۔ اور الفارابی کی، فرد کی آزادیوں اور حقوق کے تحفظ کیلئے جمہوری حکومت کی، دسویں صدی کی پیشین گوئی، نے کسی بھی اور جگہ سے پہلے مغرب میں اپنی منزل پائی۔

پس عقل اور آزادی دُنیائے عیسائیت میں کیوں پھلے پھولے جبکہ یہ اسلامی مما لک میں

MashalBooks.org

زوال پذیر ہو گئے؟

کیا اس کا جواب اس امر سے متعلق ہو سکتا ہے کہ اسلام کا ظہور مشرق میں ہوا، جبکہ عیسائیت مغرب میں پھلی پھولی؟

متن کا تناظر

کسی مذہب کے اصول محض اس کے مقدس متون سے اخذ نہیں ہوتے۔ یہ متون، خاص طور پر ابراہیمی مذاہب میں، بلاشبہ اہم ہیں لیکن پھر بھی وہ انسانی ذہنوں میں اور لوگوں کے ہاتھوں میں آ کر زندہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مذہب مختلف معاشروں میں مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ تمام عیسائی وہی ایک عہد نامۂ جدید پڑھتے ہیں، لیکن نیویارک کے عیسائی، مثال کے طور پر اپنے فلپائنی ہم مذہبوں سے کئی لحاظ سے مختلف ہیں، جہاں کچھ لوگ مقدس ہفتے کے دوران اپنے گناہوں کی تلافی کیلئے، خود کو کوڑے مارتے اور ایذا پہنچاتے ہیں۔ اور تمام معاصر عیسائی اپنے قرونِ وسطیٰ کے ہم مذہبوں سے مختلف ہیں، جن میں سے کچھ سُولی پر جادوگرنیوں کو جلاتے تھے یا ''مرتدین'' کو تفتیش کے دوران ایذا پہنچاتے تھے۔ پوری تاریخ کے دوران، عیسیٰؑ کے ایسے تمام مختلف پیروکاروں نے اُن کے صحیفے کو مختلف مفاہیم دیئے ہیں، کیونکہ اُنہوں نے اسے مختلف ذہنی ماحولوں کے درمیان سمجھا۔

یہی بات اسلام کے حق میں بھی درست ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کو ہر قسم کے اطوار و طریق میں سمجھا ہے، کیونکہ اُن کے ہر قسم کے ذہنی ماحول تھے، جن کی تشکیل اُس دور اور سماجی حالات سے کی گئی تھی جن میں وہ رہ رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، اُن کے تناظرات نے اُن طریقوں کو شدید طور پر متاثر کیا ہے، جن میں اُنہوں نے اُن کے مقدس متون کو سمجھا ہے۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں، جب ہم ''قرونِ وسطیٰ کی نظریات کی جنگ'' کے پس منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں، جس کا کھوج پچھلے ابواب میں لگایا گیا، ہم اُن مختلف رُجحانات اور مکاتبِ فکر کی تشکیل میں، جو ایک دوسرے سے متقابل اور بعض اوقات متصادم ہوتے تھے، تناظر کا اثر واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ جب ہم اُن کے تناظرات پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو درحقیقت ایک نئی تصویر اُبھرتی ہے جو یہ وضاحت کرتی ہے کہ معتزلہ کیوں دلیل پرست تھے، حنبلی کیوں دلیل پرستی کے

مخالف تھے، اور دوسرے وہ کیوں تھے جو کہ وہ تھے بلکہ یہ اس کی وضاحت بھی کرتی ہے کہ آخر کار جیتنے والے کیوں جیتے اور ہارنے والے کیوں ہارے؟۔

قبائل واپس آتے ہیں

آیئے باغی خارجیوں سے شروع کرتے ہیں، جنہوں نے علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان جنگ کے بعد، دونوں فریقوں پر ارتداد کا الزام لگایا، اور لہٰذا دونوں سے پیچھے ہٹ گئے اور اُن کے خلاف جنگ کی۔ اسلامی تاریخ کی یہ پہلی ''دہشت گردانہ'' تحریک......اور جیسا کہ موجودہ واقعات ظاہر کرتے ہیں، آخری نہیں......تمام ابتدائی اسلامی فرقوں میں سے سب سے زیادہ جنونی تھی۔ وہ ہر اُس مسلمان کی، جو ان کے نظریے سے اختلاف کرتا تھا، بطور ''کافر'' مذمّت کرتے تھے، اور پھر اُن کو قتل کرنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ تشدّد کے اس قدر رسیا تھے، کہ اُنہوں نے اسے اپنے ایجنڈے میں سب سے اوپر رکھا ہوتا تھا، اور جہاد کو اسلام کا چھٹا ستون قرار دیتے تھے، علاوہ اُن پانچ پُرامن ارکان کے جنہیں تقریباً ہر مسلمان قبول کرتا ہے۔ (۶) اُن کا سب سے انتہا پسند بازو، آج کل کی القاعدہ، اور دوسرے اسلام پسند دہشت گرد گروہوں کی طرح، لڑنے والوں اور ان لڑنے والوں کے درمیان بھی امتیاز نہ کرتے تھے، جو نہ صرف مردوں بلکہ اُن کی عورتوں اور بچوں کو بھی تہہ تیغ کرتے تھے۔ (۷)

اب، جیسا کہ بہت سے مورخین نے توجہ دلائی ہے، یہ تمام جنون، اور عسکریت پسندی خارجیوں کے ماقبل کے سماجی ڈھانچے کے ساتھ براہِ راست منسلک تھی۔ اُن میں سے زیادہ تر بدّو تھے۔ صحرا کے عرب خانہ بدوش، جن کی ثقافت کی تشکیل، بقول ایک معاصر عرب عالم کے، ''صحرا کے ماحول کے سخت حالات کے ساتھ ''تطبیق کے طویل تاریخی عمل'' سے ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ ''جرأت، بہادری، قوت، شدید جوشِ حیات، کشمکش، اسلحہ کے ساتھ لگاؤ اور اس پر عبور، مردانگی، رقابت، مزاحمت، دلیری اور اور زہد پرستی'' کی تحلیل تھا۔ (۸) دوسرے لفظوں میں بدوون کا طرزِ زندگی سوائے جنگوں کے اور کچھ نہ تھا۔

اس ثقافت کے بارے میں زبانی بیان کئے جانے والے واقعات میں سے ایک واقعہ پیغمبر محمدؐ کی اپنی زندگی سے متعلق ہے۔ یہ خبر دی گئی کہ، ایک موقع پر آپ نے ایک بدّو کے سامنے اپنے

MashalBooks.org

نواسے کو بوسہ دیا۔ موخرالذکر حیران ہوا اور اُس نے کہا ’’میرے دس بچے ہیں، لیکن میں نے ان میں کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا۔‘‘ پیغمبرؐ نے جواب دیا ’’وہ شخص جو رحم کو پھیلاتا نہیں، وہ کبھی رحم کو نہیں پائے گا‘‘ (۱۰)

دوسرے لفظوں میں رحم اور شفقت اسلام کا پیغام تھا، لیکن بدّو خاص طور پر اس کو اپنے اندر اُتارنے پر مائل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پیغمبرؐ کو متنبہ کیا: ’’صحرائی عرب کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں، اور اس بات کا زیادہ امکان رکھتے ہیں کہ وہ اُن حدود کو نہ سمجھیں جو اللہ نے اپنے پیغمبر کی طرف نازل کی ہیں‘‘ (۱۱) اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ صحرائی عرب مسلمان نہ ہوئے۔ وہ مسلمان ہوئے۔ لیکن وہ اپنی درشتی کو بھی مذہب میں لے آئے، جس کا اظہار خارجیوں کی عسکریت پسندی میں ہوا۔

اگر، عسکریت پسندی زیادہ تر خارجیوں کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک تھی...... اگرچہ، سچی بات ہے کہ سب کی نہیں...... تو فرقہ واریت کی مضبوط حسیت، دوسری تھی۔ یہ بھی، اُن کے قبل از اسلام کی خصوصیات ...... قبائلیت ...... میں سے ایک تھی۔ اُنھوں نے چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیئے جو ذیلی قبائلی یا خاندانوں سے بہت مشابہ تھے، ’’گویا کہ وہ اُن سابقہ گروہوں کو جن میں وہ زندگی گزارتے تھے۔ بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ایک اسلامی بنیاد پر‘‘ (۱۲) وہ اپنے گروہ کو ’’اہلِ جنت‘‘ اور باقی سب کو ’’اہلِ جہنم‘‘ کہتے تھے...... جو قبل از اسلام کے بدّو عقیدے کی عکاسی کرتا تھا، کہ فرد کی زندگی، صرف ایک محدود طبقے کی رُکنیت سے ہی اہمیت حاصل کرتی ہے۔ (۱۳)

یہ قبائلیت صحرائی عربوں کی ایک خصوصیت تھی، لیکن یہ بعض شہر کے رہنے والوں کو بھی کشش کرتی تھی، جو کسی ایسے ہی مضبوط جُڑے ہوئے گروہ کی تلاش میں تھے۔ لہٰذا، شہروں میں، خارجی، ’’غیر مطمئن عناصر کی توجہ کا مرکز بن گئے‘‘ اور ’’نوجوانوں غیر معروف لوگوں اور بہت سے سابقہ غلاموں اور نومسلموں‘‘ کو کشش کرنے لگے‘‘۔ (۱۴) خارجیوں کی اس بنیاد کی معاصر عسکریت پسند اسلامیت ...... دیہی علاقوں میں قبائلی طالبان کی طرح کے گروہوں اور بڑے شہروں میں مایوس نوجوانوں ...... کے درمیان یہ مشابہت ...... بہت قابلِ توجہ ہے۔

عالمی بمقابلہ علاقائی

باوجود، غیر مطمئن لوگوں کو کشش کرنے کے، خارجی، اسلام کی تشکیلی صدیوں میں ایک کمزور قوّت تھے۔ حقیقی اور حتمی قوت کی جنگ دلیل پرستوں اور روایت پرستوں کے درمیان تھی، جیسا کہ پچھلے باب میں تشریح کی گئی اور ان دونوں مکاتبِ فکر کے اپنے علیحدہ علیحدہ پس منظر تھے۔

دلیل پرست، صحرا سے تعلق رکھنے والے، قبائلی خارجیوں سے بالکل متضاد تھے۔ یہ یقیناً کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا کہ دلیل پرست پہلے شام اور پھر عراق کے بڑے شہروں میں پھلے پھولے جو کہ تجارت اور ثقافت کے متحرک مراکز تھے۔ مثال کے طور پر قدریہ تحریک...... جو کہ آزادانہ مرضی کے سب سے پہلے مدافعین تھے...... تاجروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے نئے طبقات کی شہری ثقافت‘‘ سے اُبھری تھی...... (۱۵) ان کے وارثین، معتزلہ بھی ایسے ہی تھے: خوب تعلیم یافتہ، دُنیا کے مختلف ملکوں کے دانشور، جو مختلف قوموں، روایات اور فلسفوں سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسی مربوط اور عقلیت پسندانہ اسلامی الٰہیات ترتیب دینے پر راغب ہوئے، جو عیسائیوں، یہودیوں، زرتشتیوں، اور مانویوں کے ذہنوں کو اپیل کر سکے، اور یونانی فلسفیوں کی تصانیف کا مقابلہ کر سکے۔

ایک اچھی مثال کے طور پر، ابو حنیفہ پر غور کیجئے، جو فقہ کے دلیل پرست مکتبِ فکر کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ آپ کا گہرا غور و فکر دلیل پرست معتزلہ اور تکثیری ملتوی کنندگان سے گہرے طور پر متوازی تھا...... یہی وجہ ہے کہ، آپ کے ناقدین آپ پر ’’تمثیلی استدلال کے حق میں سنت کو نظر انداز کرنے، اور اپنی رائے کا غیر متوازن استعمال کرنے کا الزام لگاتے تھے‘‘ (۱۶) وہ انسانی آزادی کے بھی حامی تھے۔ ’’نہ معاشرہ اور نہ ہی حکومت کو کسی فرد کی آزادی میں مداخلت کرنے کا حق ہے‘‘ ابو حنیفہ کا یہ نظریہ تھا، اُس وقت تک جب تک کہ فرد نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ (۱۷)

اور ان خیالات کا تعلق ابو حنیفہ کے تناظر سے تھا...... آپ کا تعلق کوفہ، عراق سے تھا جو کہ بغداد کی تخلیق سے پہلے عباسیوں کا دارالخلافہ تھا۔ کوفہ نہ صرف دانش وروں بلکہ تاجروں کا بھی مرکز تھا۔ اور ابو حنیفہ یہ دونوں ہی تھے۔ وہ زندگی بھر کے تاجر تھے، اور بہت اچھے دُنیادار تاجر تھے:

وہ مختلف فرقوں کے پرچارکوں کی آرا کے ساتھ مباحثہ کرنے کیلئے بصرہ بھی جاتے تھے،

MashalBooks.org

بلکہ دہریوں کے ساتھ بھی، جو کہ ملحد مادہ پرست تھے......اپنے شہر میں ابوحنیفہ کی مڈبھیڑ یونانیوں، ہندوستانیوں، ایرانیوں، اور عربوں سے ہوتی تھی، اور فکر کے بہت سے مختلف رُجحانات کے علاوہ، اُن کی رنگارنگ ثقافتیں بھی در آتی تھیں......ان پہلوؤں نے بھی آپ کی فکر پر ایک واضح اثر ڈالا۔ جیسا کہ، بلاشبہ، تجارت میں بھی اُن کا حصہ تھا۔ اُن کی قانونی فکر کا براہِ راست سامنا، رواجات، تجارت اور مالی معمولات سے تھا اور آپ کی فکر کا واسطہ عوام کے مفادات کو زیرِ غور لانے کی، اگر ناممکن سے نہیں......تو مشکل سے تھا۔ لہٰذا اُن کا [مذہبی] متون کا فہم فطری طور پر، لوگوں کی روزمرہ زندگی کے تقاضوں اور حقیقت سے بھرپور تھا۔ (۱۸)

اب، ہمارے دور کے ایک معروف مسلم اصلاح پسند طارق رمضان کے لکھے ہوئے اس بیان کا موازنہ، احمد حنبلؒ کی زندگی سے کیجئے، جو کہ بغداد میں ایک انتہا پسند مذہبی رہنما تھے۔ جنہوں نے تمام جدّت طرازوں کی مذمت کی۔ حنبلؒ جو ایک چھوٹے سے زمیندار تھے، نہ صرف مارکیٹ سے الگ تھلگ تھے، بلکہ اس کے شدّت سے مخالف تھے۔ (۱۹) آپ کے پیروکار دو چیزوں کیلئے مشہور تھے: حدیث کا گہرا علم اور ساتھ ہی ساتھ باہر کی دُنیا سے نفرت۔ آپ نے اپنے پیرکاروں کو بتایا کہ کوئی بھی شخص جو آپ کے روایت پرست طبقے سے باہر تھا، بدعنوان تھا۔ لہٰذا کوئی بھی چیز جو یہ باہر کے لوگ تعمیر کرتے تھے، جہاں رہائش پذیر ہوتے تھے، بناتے تھے، بیچتے تھے، یا تقسیم کرتے تھے وہ آلودگی پیدا کرتی تھی۔ حنبلؒ نے اپنے پیرکاروں کو حکم دیا کہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے کنوؤں سے پانی نہ پئیں اور گلیوں کے پھیرے والوں سے کوئی سامان نہ خریدیں اس کا مقصد...... اور اثر......''معاشرے کو بڑے معاشی دھارے سے الگ کرنا'' تھا۔ (۲۱)

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ حنبلؒ کے پیغام نے بغداد کے تاجروں اور دانشوروں میں کوئی پیروکار نہیں پائے البتہ کم تعلیم یافتہ طبقات میں پیروکار پائے۔ آپ کے مخالفین اس تحریک کو حشو یہ کہتے تھے، جس کا مطلب ہے ''اُجڈ آبادی'' (۲۲) اُن کا مذہبی ادراک ''ماضی کے ساتھ وفاداری پر زور دیتا تھا'' اور اپنی نوعیت میں ''فرقہ وارانہ'' تھا، جو اُن کے اپنے طبقے کا عکاس بھی تھا۔ (۲۳) یہ غالباً اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ حنبلی کیوں ایسے لوگ تھے ''جو مقرون اور مخصوص کا ذوق رکھتے تھے، اور نظریاتی اور مجرّد کو ناپسند کرتے تھے۔'' (۲۴)

یہاں تک کہ حنبلؒ اور آپ کے پیروکاروں کی انتہائی دینداری کا کھوج بھی، عوام کے

''عشرت مخالف'' رُجحانات میں لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر فن کی سب سے پُرتعیش شکل، سنگ تراشی، جو ''سب سے زیادہ رئیسانہ یا مذہبی پیشوایانہ ذوق اور وسائل'' کا تقاضا کرتی ہے، حنبلیوں کی طرف سے مکمل طور پر ممنوع تھی: اُس فن کی جس میں ''ہر طبقہ کے لوگ دلچسپی لے سکتے تھے''، یعنی شاعری کی تقریباً کبھی مذمت نہیں کی گئی۔ (۲۵)

الغرض، اسلام کی تشکیلی صدیوں میں دلیل پرستی اور روایت پرستی کے درمیان نظریاتی جنگ کا بہت تعلق ان دونوں گروہوں کے پیروکاروں کے پس منظروں اور تناظرات کے ساتھ تھا۔ اوّل الذکر شہری عالمی لوگوں کے اسلام کی نمائندگی کرتے تھے، جن کا واسطہ تجارت کی حرکیت کی وجہ سے مختلف خیالات ونظریات سے پڑتا تھا۔ موخرالذکر اُن لوگوں کے اسلام کی نمائندگی کرتے تھے جو علاقائی لوگ تھے۔ دونوں گروہ متشدّد مسلمانوں پر مشتمل تھے، لیکن وہ دُنیا کو، اور اپنے مذہب کو، بالکل مختلف تناظرات سے دیکھ رہے تھے۔

درحقیقت اسی طرح کی ثنویت دُنیائے عیسائیت میں بھی دیکھی جاسکتی ہے......اگرچہ سترھویں صدی تک ایسی کوئی ثنویت نہیں تھی۔ اُس وقت، یورپ میں مذہبی تنازعات میں سے ایک رواداری کا مسئلہ تھا، اور سب سے روادار نظریات میں سے کچھ اُن تاجروں کی طرف سے آئے، ''جن کے پیشوں نے تکثیریت کے فوائد سے آشنا کیا۔'' یہ وہ وقت تھا، جب ''ولندیزی جمہوریہ کی معاشی حرکیت نے'' ایک نئی داستان کو جنم دینے میں مدد دی، ''جس میں خوشحالی اور رواداری کو جڑواں بہنوں کے طور پر دیکھا گیا'' (۲۶) اس معاشی حرکیت نے مغرب میں ''اختراعات'' کو آگے بڑھانا جاری رکھا جو مذہبی تصوّرات میں تبدیلیوں کے ساتھ، فنون، سائنسوں اور فلسفہ میں ترقیوں پر منتج ہوئیں: یعنی جمہوریت کے ظہور اور آزادی کی پیشرفت پر۔ غالباً، پھر سوال یہ ہوگا: اسی طرح کی معاشی حرکیت اسلام میں کیوں حاوی نہ ہوسکی؟

یہ معیشت ہے، لزومت پسند

کیلیفورنیا سٹیٹ پولی ٹیکنک یونیورسٹی میں، تاریخ کے پروفیسر محمود ابراہیم کے پاس ایک قائل کرنے والا نظریہ ہے، جو ایک ممکنہ جواب پیش کرتا ہے۔ وہ آغاز وہ کچھ ثابت کرنے سے کرتا ہے جس کا ہم نے اب تک مشاہدہ کیا ہے: دلیل پرست، خاص طور پر معتزلہ، ایک معاشی طبقے

MashalBooks.org

پر مشتمل تھا۔ زیادہ تر تاجر تھے، دوسرے ''یا تو کاریگر تھے یا کاریگروں کے ساتھ منسلک تھے۔'' (۲۷) اُن کے مخالفین، روایت پرست، کی قیادت متضاد طبقے کے پاس تھی: زمینداروں کے پاس (۲۸) لہٰذا۔ ان گروہوں کے درمیان نظریات کی جنگ ''محض ایک مذہبی یا نظریاتی تنازعہ نہیں تھا، بلکہ ایک سماجی تنازعہ تھا۔ جو نظریاتی سطح پر لڑا گیا۔'' (۲۹)

سیاسی سطح پر بات کرتے ہوئے، اس تنازعے کا فیصلہ کُن موڑ، جیسا کہ سابقہ باب میں ذکر کیا گیا، المتوکل کی آمد تھی۔ وہ عباسی خلیفہ، جس نے اپنے سے براہ راست ماقبل لوگوں کی معتزلہ کی حامی مختصر پالیسی کو ختم کیا، اور روایت پرستوں کی حمایت کی۔ لیکن اس تبدیلی کا ایک معاشی پہلو بھی تھا۔ بالکل واضح طور پر، المتوکل نے ایک نیا معاشی نظام قائم کیا، جس نے زمینداروں کے کردار اور مالیات کو بلند کیا۔ یہ سسٹم، جس کا نام اقطاع تھا، زمین کے عطیات کی ایک شکل تھی۔ خلیفہ ایک ایسے زمیندار کو عارضی طور پر زمین کا ایک ٹکڑا عطیہ کرتا تھا، جو اس وقت ان کسانوں سے ٹیکس وصول کر سکتا تھا جو زمین پر رہ رہے ہوتے تھے۔ وہ زمیندار، اس بات کی یقین دہانی حاصل کرنے کیلئے کہ کسان اُس کیلئے فصلیں اُگا رہے ہیں، بہت سے سپاہیوں کو بھرتی کرتا تھا۔

اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا سسٹم اُن مالکانِ زمین اور سپاہیوں کی طاقت میں، جنہیں وہ ملازم رکھتے تھے، اضافہ کرتا تھا...... تاجروں کی قیمت پر۔ المتوکل کے بعد آنے والے خلفا نے اس سسٹم کو ترجیح دینا جاری رکھا، کیونکہ وہ زمین پر...... جو کہ ایک مرئی دولت تھی، تاجروں کے منافع کی نسبت زیادہ آسانی سے ٹیکس حاصل کر سکتے تھے۔ (۳۰) اس خطرے کے ہوتے ہوئے جو سامنے تھا، اور اُس تباہی کے ہوتے ہوئے جو بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں صلیبی جنگجوؤں اور منگولوں کی طرف سے مچائی گئی، سپاہیوں کا کردار اور بھی مضبوط ہو گیا۔

ڈاکٹر ابراہیم کے مطابق، دُنیائے اسلام میں ''تجارت پر مبنی سرمایہ دارانہ دور'' سے ''المتوکل کی خلافت کے ساتھ شروع ہونے والے زراعت پر مبنی نیم جاگیردارانہ دور'' میں یہ تبدیلی خاصی فیصلہ کُن تھی۔ (۳۱) یہ دلیل پرستی سے روایت پرستی کی طرف تبدیلی کا بنیادی ڈھانچہ تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے شرقِ اوسط میں محنت کا ایک مطالعہ، بھی اس ساختیاتی تبدیلی کا انکشاف کرتا ہے۔ آٹھویں اور گیارھویں صدیوں کے درمیان، جو کہ اسلامی قانون کا تشکیلی دور تھا، عراق سے سپین تک پھیلی ہوئی۔ عرب اسلامی اراضی ۲۳۳ واضح تجارتی پیشوں کو سہارا دیئے ہوئی تھیں۔

بعد میں، بارھویں اور پندرھویں صدیوں میں، اس تعداد میں معمولی سی کمی ہوئی، جبکہ نوکرشاہی اور فوج میں پیشوں کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہو گیا...... یقیناً فوجی اور ریاستی طاقت میں ایک اُبھار آیا ،لیکن ''تجارتی تنظیم کے سلسلے میں ایک جمود آیا۔'' (۳۲)

دُنیائے اسلام کی تاریخ میں ادوار کی یہ تقسیم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ، دُنیا کے اس حصے میں معاشی ترقی میں رُکاوٹ خود اسلام نہیں تھا، جیسا کہ بعض لزومت پسند یقین رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی آف لندن میں پروفیسر امریطس، سمیع زبیدہ بیان کرتی ہیں، ''یہ اسلام کے جُزوفطرت رویے اور نظریات نہ تھے، جنہوں نے سرمایہ دارانہ معیشت کے ارتقا میں رُکاوٹ پیدا کی، بلکہ اسلامی معاشروں میں، غالب فوجی نوکرشاہی طبقات کے حوالے سے تاجر طبقات کا سیاسی موقف تھا'' (۳۳)

بعد کی صدیوں میں (بارھویں صدی سے بعد)، جمود اور گہرا ہو گیا، کیونکہ دُنیائے اسلام زیادہ سے زیادہ تنہا ہو گئی، اور کیونکہ تجارت، جو کہ مشرق میں حرکیت کا بنیادی محرک تھی، بتدریج کہیں اور منتقل ہو گئی۔ پہلے پہل ''بحیرۂ روم کا نقصان'' ہوا...... اس تجارتی طور پر اہم سمندر کے تمام مشرقی اور شمال مشرقی ساحل پر صلیبی جنگجوؤں کے قبضے کی وجہ سے۔ عظیم فرانسیسی مورخ فرنینڈ براڈل (Fernand Braudel) یہ استدلال کرتا ہے کہ ''بارھویں صدی میں اسلام کی اچانک تقلیب'' کی غالباً سب سے بہتر توجیہہ ہے۔'' (۳۴) تیرھویں صدی میں منگولوں کا عذاب اس سے کہیں زیادہ اچانک اور الم انگیز تقلیب عائد کرنے والا تھا۔

آخری دھچکا، پندھرویں صدی میں ''عہد دریافت'' کی آمد کے ساتھ لگا، جس کے دوران مغربی یورپ کے لوگوں نے ہندوستان، چین اور دوسرے مقامات کیلئے راست سمندری راستے دریافت کر لئے۔ نتیجہ، دُنیا کے تجارتی راستے تیزی سے اُن سمندروں کی طرف منتقل ہو گئے، جنہوں نے مغربی یورپ کو مالا مال کیا۔ اس چیز نے نہ صرف شرقِ اوسط کو مزید غربت کا شکار کیا، بلکہ بحیرۂ روم کو ایک عقبی سمندر بنا دیا۔ بارھویں اور اٹھارویں صدیوں کے درمیان ''دُنیا کے سرمایئے'' کی مکمل شمالی مغربی سمت میں حرکت، براڈل کے ایک مضمون کے برمحل عنوان ''اسلام کی عظمت اور اس کا زوال'' کی توجیہہ کرتی ہے۔ (۳۵)

جب تجارت اس قدر بتدریج اور ڈرامائی طور پر زوال پذیر ہوئی، تو قرآنی متن

MashalBooks.org

مسلمانوں کی تفہیم کی تشکیل کیلئے صرف ایک ہی بڑا عامل باقی رہ گیا: شرقِ اوسط کی سرزمین ......بنجر شرقِ اوسط۔

گہرائی تک نیچے جائیں، لیکن یہ پھر بھی ماحول ہے

اس پوری کتاب میں میں نے ''دُنیائے اسلام'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ تصوّر میں لانے کیلئے کہ یہ اصطلاح دُنیا کے کس حصے کی تعریف کرتی ہے، انٹرنیٹ پر ''اسلامی دُنیا کا نقشہ'' تلاش کیجئے۔ پھر براہِ مہربانی ایک دوسری تلاش کیجئے ''دُنیا کے بنجر پن کا نقشہ'' کی۔ آپ ''اسلامی'' اور ''بنجر پن'' میں ایک حیرت انگیز باہمی تعلق پائیں گے۔

یہ ایک عجیب وغریب مظہر ہے، جس نے بعض مشاہدہ کاروں کو یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ اسلام، بطور مذہب، ایک خاص قسم کے ماحول کیلئے خاص طور پر موزوں تھا......صحراؤں اور خشک گھاس کے قطعات کیلئے۔ (۳۶) یہ غلط ہے، کیونکہ اسلام بارش والے اور زرخیز خطوں میں بھی پھلا پھول ہے......جیسا کہ مشرقِ بعید، بلقان، اور ترکی اور ایران کے بعض خطوں میں......لیکن وہ علاقے جہاں اسلام کی تشکیلی پیشرفتیں واقع ہوئیں، تقریباً تمام بنجر تھے۔ پس کیا اس قسم کے ماحول، اور اُن تشکیلی پیشرفتوں میں کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟۔

اسلامی قانون کے ایک سرکردہ مغربی دانشور، آنجہانی جوزف شاایکٹ (Joseph Schacht) ایسا ہی یقین رکھتے تھے۔ پیغمبرؐ کی سنت کے ساتھ روایت پرستوں کے جذباتی لگاؤ کی توجیہہ کرتے ہوئے، جو ہم دیکھ چکے ہیں، اُس نے اُن کی ذہنی ساخت کا حوالہ دیا، جو اُن کے طبعی ماحول سے تشکیل پذیر ہوئی:

> ''عرب، روایت اور نظیر سے بندھے ہوئے تھے، اور ہیں۔ جو کچھ بھی مروّج تھا وہ ٹھیک اور موزوں تھا: جو کچھ آباؤاجداد نے کیا، وہ تقلید کئے جانے کا مستحق تھا۔ یہ اُن عربوں کا سنہری اصول تھا، جن کی نامساعد ماحول میں عُسرت کی زندگی اُن کیلئے ایسے تجربات اور اختراعات کی گنجائش نہیں چھوڑتی تھی جو اُن کی زندگیوں کے توازن کو گڑبڑا سکتی تھی۔ نظیر یا روایت کے اس تصوّر میں عربوں کی کُل دقیانوسیّت نے اپنا اظہار پایا......

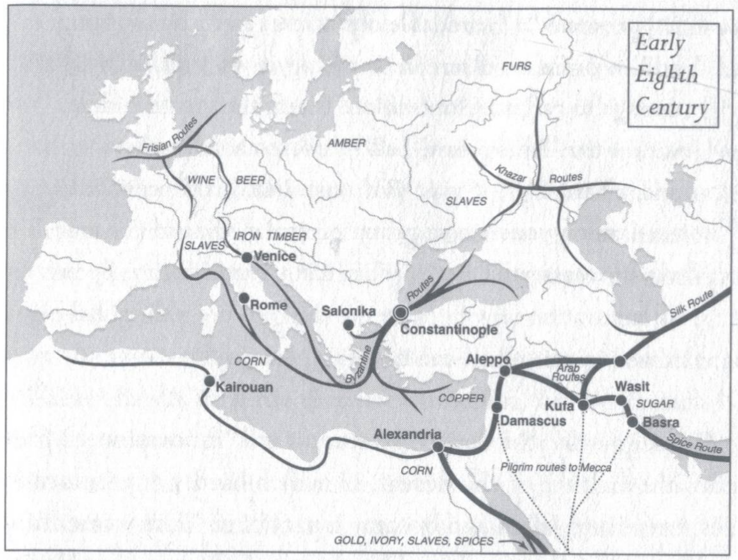

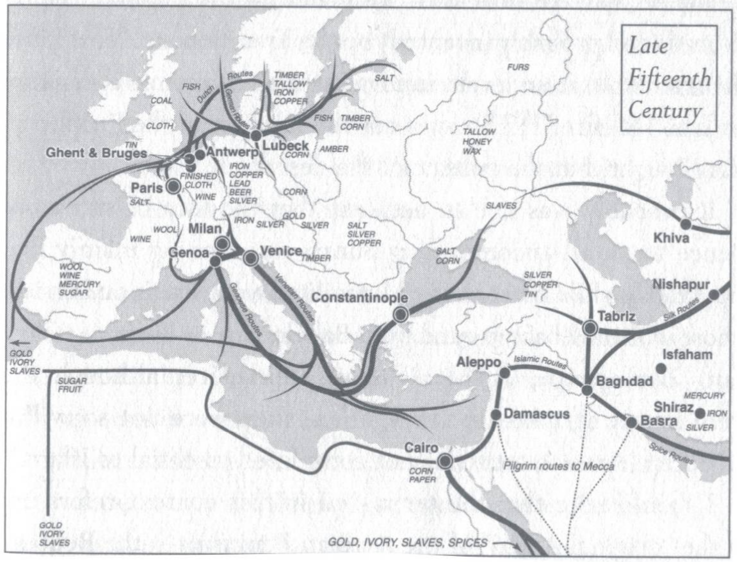

یہ دونوں نقشے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح دُنیا کی تجارت اور شہری عالمگیریت جس کو اس نے پروان چڑھایا، نے اپنا وزن اسلامی شرقِ اوسط سے، آٹھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان یورپ منتقل کیا۔

(ذریعہ، کولن مکیوڈی، دی پینگوین اٹلس آف میڈیول ہسٹری یو کے وینیوپارک پینگوئن بکس ۱۹۶۱) (صفحات ۴۳،۸۹)

[اس] نے ہر نئی چیز کیلئے ایک خوفناک رُکاوٹ پیدا کر دی، اور کسی بھی چیز کو بے وقعت کرنے کیلئے یہ کافی تھا اور کافی ہے، کہ اسے ایک جدّت کہہ دیا جائے۔ اسلام، جو کہ وہ سب سے بڑی جدّت تھی جو عرب نے دیکھی، کو اس رُکاوٹ پر قابو پانا تھا، اور یہ بہت سخت جنگ تھی۔ لیکن جب ایک دفعہ اسلام غالب آچکا۔ خواہ عربوں کے کسی واحد گروہ میں ہی سہی، تو پُرانی دقیانوسیت نے دوبارہ اپنا اظہار کرنا شروع کر دیا، وہی چیز جو تھوڑی دیر پہلے ایک جدّت تھی، ایک مقبولِ عام چیز بن گئی، ایک ایسی چیز جس کو نظیر اور روایت سے یعنی سنت سے تقدس مل گیا۔'' (۳۷)

نتیجۃً، ''جدّت'' کے بارے میں عربوں کی ناپسندیدگی، جو کہ صحرا کی ثقافت کی ایک پیداوار تھی، جس میں کوئی جدّت مشکل سے ہی زندہ رہتی ہے، اسلام میں در آئی اور اس کا ایک حصہ بن گئی۔ ''بدترین چیزیں وہ ہیں جو نادر ہیں'' احادیث میں سے ایک مقبولِ عام حدیث، جس کی روایت پرستوں کی طرف سے حمایت کی جاتی ہے (اور غالباً اُنہی کی ایجاد ہے) یہ کہتی ہے ''ہر نادر چیز ایک جدّت ہے، ہر جدّت ایک غلطی ہے، اور ہر غلطی جہنم کی آگ کی طرف لے جاتی ہے'' (۳۸) یہ، جیسا کہ سمجھا گیا، پیغمبرؐ کی دانش نہیں تھی، بلکہ صحرا کی ثقافت تھی۔

غالباً یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا، کہ ایک محیطِ کُل سنت کی اطاعت کا تصوّر بنیادی طور پر عربوں کی طرف سے آ رہا تھا جبکہ، زیادہ تر معتزلی عراقی یا ایرانی تھے، جن کا ثقافتی پس منظر بابلی یا فارسی، عیسائی، زرتشتی یا مانوی تھا۔ لہٰذا اگرچہ وہ قرآن کے ساتھ پُختہ وابستگی رکھتے تھے، لیکن وہ ''عربوں کے ایسے رویوں کو، جو اسلام میں ضروری خیال نہیں کئے جاتے تھے ماننے'' پر تیار نہیں تھے (۳۹)

مجھے اس بات کا ذکر کرنا چاہیے کہ، اس تناظر میں عرب کی اصطلاح، صرف جزیرہ نمائے عرب کے ''اصلی عربوں'' کی طرف اشارہ کرتی ہے...... یعنی بدوّوں کی طرف۔ آج کی وسیع تر عربی دُنیا، جو مراکش سے خلیج فارس تک پھیلی ہوئی ہے، زیادہ تر اُن ''بعد کے عربوں'' پر مشتمل ہے، جنہوں نے، اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ، عربی زبان کو اپنایا۔ مجھے یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ ہم یہاں، لوگوں کے کسی گروہ کی فطری خصوصیات کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے، بلکہ بعض خاص ثقافتی خصوصیات کی بات کر رہے ہیں، جو اُس طبعی خطہ زمین سے تشکیل پاتی ہیں جس میں وہ رہتے ہیں۔ چودھویں صدی کے مسلم دانشور، ابنِ خلدون وہ پہلے دانشور تھے جنہوں نے اس معاملے کا

منظّم مطالعہ کیا۔ اُنہوں نے لکھا ''عرب، تمام اقوام میں مہارتوں سے، سب سے کم آگاہ ہیں، [کیونکہ] اُن کی جڑیں صحرائی زندگی میں بہت مضبوطی سے گڑی ہوئی ہیں، اور متمکن تہذیب سے زیادہ دُور تھے'' (۴۰) (پھر، ابن خلدون کی زبان میں عرب کی اصطلاح کا اشارہ بدّوؤں کی طرف تھا)۔

اٹھارویں صدی میں، ابن خلدون کے تصوّر کو، غالباً کسی براہِ راست تعلق کی وجہ سے، فرانسیسی آزاد خیال مانٹیسکیو (Montesquieu) کی طرف سے بڑھاوا ملا۔ (۴۱) اُس کا آب وہوا کا نظریہ یہ کہتا تھا کہ طبعی ماحول کا ثقافتوں کی تشکیل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ برطانوی آزاد خیال آدم سمتھ نے بھی، ایسے ہی اشارات دیئے۔ (۴۲) یہ نظریہ جسے ''ماحولیاتی جبریت'' ...... یا زیادہ متوازن اور صحیح متن میں ''ماحولیاتی ممکنیت'' کہا جاتا ہے، اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں زیادہ مقبول ہو گیا، جس نے اسلام کی بعض مغربی تعبیرات کو بھی متاثر کیا۔ ایک امریکی عالم نے ۱۹۲۴ میں لکھا: ''قرآن اسلام میں فی نفسہٖ کوئی قدامت پسند قوّت نہیں ہے، بلکہ یہ قوت مسلمان کا اپنی مقدّس کتاب ...... اور عمومی طور پر چیزوں ...... کے بارے میں رویہ ہے۔ یا کیا ہم یہ نہ کہیں کہ حتمی سبب ''کوئی ایسی چیز ہے جو کہ انسانی ذہن کی نسبت زیادہ قابلِ اعتماد یا قابلِ انحصار ہے'' ...... یعنی لامتناہی صحرا، جو، نسلوں، رواجات، اور مذاہب کو ایسے محفوظ کرتا ہے جیسے قدیم اشیا کے کسی عجائب گھر میں چیزوں کو محفوظ کیا جاتا ہے، صدیوں کے آنے اور جانے کے باوجود غیر متبدّل۔ (۴۳)

مرحوم صابری اُلجیز (Sabri Ulgener) جو کہ جدید ترکی کی، معاشی تاریخ اور عمرانیات کی بہت ممتاز شخصیت تھے، نے بھی، مشرقِ وسطیٰ کے معاشروں کے کچھ ثقافتی رویّوں کی اصل کے بارے میں اسی طرح کی آرا کا اظہار کیا ہے ...... مثال کے طور پر اس نے یہ کہا کہ ''تقدیر پرستی مذہب کی، اور خاص طور پر اسلام کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ فطرت کے لڑکھڑا دینے والی مشکلات کے بالمقابل صحرا اور بنجر میدانوں کے انسان کی کمزوری کا اظہار تھا۔ تاہم یہ اسلام میں ضم ہو گئی اور [خُدا کی] اطاعت کے نام اور نقاب کے نیچے باقی رہی۔'' (۴۴)

جیرارڈ دستان ڈی برنیس (Gerard Destanne de Bernis) ایک فرانسیسی ماہر معاشیات، جس نے تیونس میں دیہاتی زندگی کا وسیع مطالبہ کیا، اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ اس نے

MashalBooks.org

استدلال کیا کہ اگر ''مسلمان ملکوں کے کاشتکار تقدیر پرست ہیں'' تو یہ اُن کی طرف سے کوئی غیر عقلی رویہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُن غیر محفوظ عوامل کا صحیح تخمینہ ہے، جو اُن کی کوششوں کے نتیجے کا تعین کرتے ہیں: ''کوئی بھی شخص جو اس حالت میں ہو، تقدیر پرست ہوگا۔'' (۴۵)

صحرا نے نہ صرف تقدیر پرستی، اور ہر قسمی ''جدّت'' سے متنفر انتہائی قدامت پسندی کو جنم دیا، بلکہ زبان کے ایک بہت زیادہ لفظ پرست تصوّر کو بھی، جس نے باریک معانی اور تمثیل کیلئے کھلے ذہن کیلئے کوئی زیادہ گنجائش نہیں چھوڑی (۴۶) بلکہ ''ذوقِ جمالیات کے فقدان'' کا بھی اظہار کیا۔'' (۴۷)

بعد میں، بیسویں صدی میں، اگرچہ، ثقافت اور ترقی کے بارے میں، ایسی موحولیاتی تشریحات نے علمی حلقوں میں اپنی معقولیت کھودی، کیونکہ اُنہیں الزامات کا سامنا کرنا پڑا ...... میرے خیال میں غلط طور پر...... کہ وہ نسل پرستی اور سامراجیت کو جواز بخشتے ہیں ...... لیکن یہ نظریہ غلط ثابت نہیں ہوا، بلکہ صرف ناپسند کیا گیا'' (۴۸) اس میں کوئی حیرت نہیں کی یہ نظریہ۔ علمی دُنیا میں اور مقبولِ عام ادب میں، دوبارہ اپنی واپسی کر رہا ہے، ایسی اہم کتب کے ساتھ جیسا کہ ڈیوڈ لینڈز کی The Wealth and Poverty of Nations اور پلیٹزر ونگ Guns, Germs and Steel (۴۹) دوسری کتاب کا مصنف جیرڈ ڈائمنڈ (Jared Diamond) لکھتا ہے، ''ماحول تاریخ کو ڈھالتا ہے'' (۵۰)

مشرقی آبائی میراث

ماحول نے شرق اوسط کی تاریخ کو ڈھالا ...... نہ صرف افراد کی ذہنی ساخت اور معاشروں کی ثقافتوں کی تشکیل کر کے، بلکہ ریاستوں کے سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل کر کے بھی، شرقِ اوسط کی زمین کے بنجر پن کا ایک واضح نتیجہ عدم زرخیزی، اور لہٰذا ''زائد کا فقدان'' تھا۔ (۵۱) اس چیز نے مقامی (یعنی جاگیردار) حکمرانوں کیلئے طاقت حاصل کرنا ناممکن بنا دیا۔ اس کی بجائے، طاقت اُن مرکزی حکومتوں میں مرتکز ہوگئی، جو آبپاشی کے نظام تعمیر کرنے کیلئے جبری مزدوری کا انتظام کر سکتے تھے۔ (۵۲) مزید برآں شرقِ اوسط کا مقامی جغرافیہ ''ہموار'' تھا، جس پر ''فوجیں بغیر رُکاوٹ کے مارچ کر سکتی تھیں'' ...... جیسا کہ منگولوں کی فوجوں نے الم انگیز طریقے پر کیا۔ (۵۳) نتیجے کے طور

پر، اسلام سے پہلے بھی، دُنیا کے اس حصے پر، ایک ہزار سال تک طاقتور مرکزی ریاستیں حکومت کرتی رہیں۔

اب اس زمینی سیاسی ڈھانچے کا موازنہ یورپ کے زمینی سیاسی ڈھانچے سے کیجئے، جو بخلاف شرقِ اوسط کے ایک بارشی اور زرخیز براعظم تھا، جس میں بہت سے علاقے ایسے تھے، جنہیں ''فتح کرنا مشکل'' جہاں کاشتکاری کرنا آسان تھا اور جن کے دریا اور سمندر بنے بنائے تجارتی راستے مہیا کرتے تھے'' اس مقامی جغرافیہ نے، فرید زکریا وضاحت کرتا ہے،

> ''مختلف حجموں کی قومیتوں کے اُبھرنے کو ممکن بنا دیا ...... شہری ریاستیں، نوابیاں، جمہورتیں، اقوام اور سلطنتیں۔ ۱۵۰۰ میں یورپ کے اندر ۵۰۰ سے زیادہ ریاستیں تھیں، جن میں بہت سی ایک شہر سے بڑی نہیں تھیں۔ اس تنوع کے دو حیرت انگیز اثرات تھے۔ اوّل اس نے اختلاف کی گنجائش پیدا کی۔ لوگ، تصوّرات، فن اور یہاں تک کہ تکنیکی علوم بھی، جو کسی خاص علاقے میں نامقبول یا توجہ ناپذیر ہوتے تھے، اکثر کسی دوسرے علاقے میں پھلتے پھولتے تھے۔ دوم، اختلاف ریاستوں کے درمیان مسلسل مقابلے کو ہوا دیتا تھا، جو کہ سیاسی تنظیم، فوجی ٹیکنالوجی اور معاشی حکمتِ عملی میں جدّت اور استعداد پیدا کرتا تھا۔ (۵۴)

یہ ہے وہ وہ طریقہ جس میں جاگیرداری نے آخرکار، یورپ میں، آزادی کے حق میں کام کیا، زرخیز زمین نے اس قدر دولت پیدا کی کہ اُس نے طاقتور جاگیرداروں کے اُبھرنے کی گنجائش پیدا کی، جو بادشاہوں کے ساتھ اقتدار کیلئے مقابلہ کر سکتے تھے اور اُنہیں ایسے آزادی کے متون پر دستخط کرنے پر مجبور کر سکتے تھے جیسا کہ عظیم منشور (Magna Carta) اور جب مارٹن لوتھر کا سماجی مقاطعہ پوپ کی طرف گیا، تو اس کو جرمنی نے طاقتور شہزادوں کی طرف سے حمایت مل گئی، جو روم کی نافرمانی کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔

لیکن شرقِ اوسط کی بنجر اور ہموار زمین صرف اِقطاع سسٹم کا ''نیم جاگیردارانہ'' نظام پیدا کر سکی۔ یہاں زمین مرکزی طاقت کی ملکیت میں ہی رہتی تھی، اور صرف عارضی طور پر زمیندار کے حوالے کی جاتی تھی، جو موخر الذکر کو ''عطا کی گئی زمین کی نجی ترقی کی بجائے محض مالِ غنیمت سمیٹنے کی طرف لے جاتی تھی'' (۵۵) اس کا حتمی نتیجہ ایک ''خود مختار'' ذمہ وار، اور بے گھر نہ کئے جانے

MashalBooks.org

والے طبقہ'' کے پیدا ہونے میں رُکاوٹ ......اور سیاسی تکثیریت کے راستے میں رُکاوٹ...... تھا۔(۵۶)

الغرض، جہاں، یورپ کے خوش قسمت ماحول نے، آزادی کو بڑھاوا دینے میں مدد کی، وہیں پر شرقِ اوسط کے بدقسمت ماحول نے اُس چیز کو مضبوط کیا جسے کارل مارکس نے ''مشرقی مطلق العنانیت'' کہا، اور میکس ویبر (Max Weber) نے اس کی تعبیر نوموروثیت کے طور پر کی ......یعنی حکمرانی کے ایک ایسے نظام کے طور پر جس میں تمام اختیارات براہِ راست قائد کی ذات سے پھوٹتے ہیں۔

اس آمرانہ نظام کے اندر کوئی چیز اسلام کا فطری حصہ نہیں تھی......اس میں کوئی حیرت نہیں کہ یہ روس اور چین جیسے غیر اسلامی ملکوں میں بھی حاوی تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مشرقی وراثت اور اسلام کے درمیان تعلق نے اوّل الذکر کے حق میں کام کیا، جبکہ اس نے موخر الذکر کے اوپر اپنا اثر چھوڑا۔(۵۷) اسلام کی عمرانیات کے ایک سرکردہ عالم بریان ایس ٹرنر (Bryan S. Turner) کے مطابق، یہی بنیادی وجہ تھی کہ مذہب نے کیوں اپنی ابتدائی صدیوں کے بعد ایک کم دلیل پرست اور کم تخلیقی شکل اختیار کر لی۔''

''یہ عباسیوں سے شروع ہونے والے، موروثی حکمران خاندانوں کے تحت شروع ہونے والے قرونِ وسطیٰ کے اسلام کے تحت تھا، کہ ایک موزوں ترغیب کے ساتھ منسلک نقطۂ نظر رکھنے والی ایک ثقافت، جس نے نظام وضبط، اطاعت اور تقلید پر زور دیا، اسلام پر غالب آ گئی۔ فوج اور علما کے درمیان ایک لازمی اتحاد کی تشکیل کے ساتھ، شریعت، بطور ایک رسمی اور غیر متبدل ضابطۂ حیات کے، طرزِ عمل کی واحد جائز زبان کی نمائندگی کرنے لگی......انہی حالات کے تحت اسلام کی خصوصیت ایک غلامانہ، تقدیر پرست مذہب کی بن گئی، ایک ایسے مذہب کی جو موروثی حکومت کی گنجائش اپنے اندر رکھتا تھا۔''(۵۸)

ٹرنر مزید کہتا ہے، کہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اسلام کے ہاں ''پروٹسٹنٹ اخلاق'' کی طرح کی کسی چیز کی کمی تھی، جس نے یورپ میں سرمایہ داری کو جنم دیا۔ کم از کم، قرونِ وسطیٰ کے شہری تاجر ''عقلیت پسندی کی واضح طور پر مسلم شکل کے ساتھ وابستہ رہے''(۵۹) جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، معتزلہ اور مُرجئین نے، تو اس عقلیت پسندی سے آزاد خیالی کے اصول بھی اخذ کئے۔ صرف

یہ ہے کہ وہ شرقِ اوسط کی پابندیوں پر قابو نہ پا سکے۔

آدمی کہہ سکتا ہے کہ، اسلام نے آزادی کے بیج تو پیدا کر لئے تھے: افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ بیج ایک زرخیز زمین میں جڑ نہ پکڑ سکے۔

اس پس منظر کے مدِّنظر، ایک اُمید افزا سوال پیدا ہوتا ہے: اگر ایک ہزاریہ قبل، معاشی حرکیت کی ناکامی، اسلامی عقلیت پسندی اور آزاد خیالی کے زوال پر منتج ہوئی، تو کیا معاشی حرکیت کی دوبارہ نشوونما اُنہیں دوبارہ زندہ کر سکتی ہے؟ اگر ایک دوسرے طریقے سے بیان کیا جائے، تو کیا مسلم معاشروں میں سماجی معاشی ترقی، مذہبی رویّوں، تصورات اور نظریات میں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے؟

ہم اس سوال کے جواب کا کھوج، جدید دور کے ترکی کو ایک نمونے کی مثال بناتے ہوئے اس پر نگاہ ڈال کر کریں گے۔ لیکن پہلے کچھ اور پتھر ہیں جنہیں راہ سے ہٹانا ہے۔

MashalBooks.org

حصہ دوم

دورِ جدید

جب حالات میں عام تبدیلی واقع ہورہی ہو، تو ایسے ہوتا ہے گویا کہ پوری تخلیق تبدیل ہوگئی ہو، اور پوری دُنیا کی قلب ماہیت ہوگئی ہو۔

......ابن خلدون، قرونِ وسطیٰ کا مسلم دانشور

MashalBooks.org

باب 6

عثمانی نشاۃِ ثانیہ

ہم نے ہمیشہ اس بات کی وضاحت کی کہ آئینی حکومت، شریعت کیلئے موزوں اور جائز ہے۔ اس کی طرف سے اس پر پابندی نہیں لگائی گئی، بلکہ اس کے برعکس ہماری شریعت نے آئینی حکومت کا حکم دیا...... ہم نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ آزادی اور بھائی چارے کے معنی کیا ہیں: مساوات کے معنی کیا ہیں۔

شیخ الاسلام موسیٰ کاظم آفندی، سلطنتِ عثمانیہ کے اواخر کا چوٹی کا مذہبی عالم (۱)

جب ایک مرتبہ، اسلام کے دلیل پرستوں اور روایت پرستوں کے درمیان نظریاتی جنگ، موخر الذکر کے غلبے کے ساتھ ختم ہوگئی، تو دُنیائے اسلام ذہنی طور پر ایک جمود کے دور میں داخل ہوگئی، جو کئی صدیوں تک برقرار رہا، اگرچہ وقتاً فوقتاً کچھ روشن مقامات آتے رہے، لیکن مسلم دُنیا میں، خاص طور پر سنیوں میں غالب رویہ کا تعین، روایت کی ایک سخت روایت اور جدّت کے خلاف شدید نفرت سے ہوا۔

اس ٹھہراؤ میں شگاف صرف ایک بیرونی طاقت کی مداخلت سے پڑا: جدید مغرب سے، جو، اٹھارویں صدی کے بعد سے، جدّت کی ایک بھاری بھرکم قوّت تھی، ایک ایسی قوت جسے نظرانداز کرنے کو مسلمان برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ مسلمانوں نے اس حقیقت کا سامنا

کیا۔ اور اپنے طور طریقوں میں اصلاح کرنے کا فیصلہ کرلیا، دوسروں نے تبدیلی کی مزاحمت کا فیصلہ کیا، بلکہ پیچھے مُڑ کر جنگ کرنے کا۔ اس کا نتیجہ نظریات کی ایک نئی جنگ تھا...... اس مرتبہ ایک جدید جنگ......

اس داستان میں ایک نمایاں لمحہ، حجاز میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف ۱۸۵۶ کی بغاوت تھی، جو کہ جزیرہ نمائے عرب کا مغربی ساحل تھا اور اسلام کے مقدّس ترین شہروں کی آماجگاہ تھی۔ اس وقت پر عثمانیوں نے پوری عرب دُنیا کو قابو کیا ہوا تھا، اکثر اوقات وہ مقامی سرداروں کے ذریعے بالواسطہ طور پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن ایک سردار، مکہ شریفِ عبدالمطلب، عثمانی حکمرانوں کے خلاف، اُن کے ''غیر مذہبی'' طور طریقوں کی جیسا کہ غلاموں کی تجارت پر سلطان عبدالمجید کی پابندی...... کی مذمت کرتے ہوئے، مخالفت کو ہوا دے رہا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سرکاری وقائع نگار احمد جودت پاشا کے مطابق، عبدالمطلب تو یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ، تُرک، عورتوں کو اپنے چہروں کو ننگا کرنے کی اجازت دے کر، اور اُنہیں اپنے شوہروں اور باپوں سے علیحدہ رہنے اور اُنہیں طلاق کا حق دے کر، مُرتد ہو گئے ہیں۔'' (۳)

شریفِ مکہ، اُن دوستانہ تعلقات سے بھی ناراض تھے، جو عثمانیوں نے ''کُفار'' کے ساتھ قائم کئے تھے، اور اُن قونصل خانوں سے بھی جو برطانویوں اور فرانسیسیوں نے قریبی شہر جدّہ میں کھولے تھے۔ (۴) ایک برطانوی ڈپلومیٹ نے بعد میں عبدالمطلب کو ایک ''جنوبی وہابی'' قرار دیا، جو یہ یقین رکھتا تھا کہ تمام عیسائی ''کُتے ہیں۔ جنہیں کرۂ ارض سے مٹا دینا چاہیے'' (۵)

اپنے وقائع میں، جودت پاشا نے، جو کہ اسلامی قانون کا عالم بھی تھا، یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ شریف ان تمام معاملات میں غلط تھا۔ غلامی پر پابندی لگانا شریعت کے خلاف نہیں تھا، عثمانی سلطان واقعی مقدس قانون کا بہترین محافظ تھا، اور کفار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا بھی لازمی طور پر اسلام کی طرف سے ممنوع نہیں تھا (۶) لیکن عبدالمطلب ایسے دلائل سے قائل نہ ہوا، اور جلد ہی اُس نے اپنی بغاوت کا آغاز کر دیا، یہ اعلان کرتے ہوئے،

''اے اہل مکہ، تُرکوں کے خلاف جہاد شروع کر دو کیونکہ وہ عیسائی اور فرنگی بن چکے ہیں! وہ لوگ جو آپ میں سے قتل ہوں گے جنت میں داخل ہوں گے: وہ جو اُن میں سے قتل ہوں گے جہنم میں داخل ہوں گے۔ (۷)

MashalBooks.org

اُس کے لوگوں نے عثمانی اہل کاروں پر حملے شروع کر دیئے۔ اُنہیں اور ساتھ ہی ساتھ کعبہ میں کچھ زائرین کو بھی قتل کر دیا...... لیکن جلد ہی اُنہیں عثمانی فوجوں کی طرف سے شکست دے دی گئی اور گرفتار کر لیا گیا۔(۸) لیکن یہ نہ تو پہلی اور نہ ہی آخری شورش تھی، جس کا سامنا عثمانیوں کو عرب میں کرنا پڑا۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی وہابیوں نے، صوفی ازم جیسی ''جدّتوں'' کی وجہ سے اُن کی مذمت کی تھی، جو کہ ایک ایسی صوفیانہ روایت تھی جسے وہ شریعت سے انحراف کے طور پر دیکھتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں، عثمانیوں نے اس سے بھی زیادہ پریشان کُن ''جدّتیں'' متعارف کروائیں۔ عورتوں کیلئے مزید حقوق، کفار کے ساتھ اور زیادہ تعلقات، اور غلامی کیلئے کم برداشت۔ وہابیوں کیلئے ایسی تمام اصلاحات ارتداد تھے، جن کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت تھی۔

اگرچہ۔ ہماری کہانی کیلئے یہ اصلاحات حوصلہ افزا ہیں...... کیونکہ وہ آزاد خیال جمہوریت کو قبول کرنے کیلئے سب سے زیادہ وسیع، اور مربوط اسلامی کوششوں کی تشکیل کرتی ہیں۔

یہاں، تُرکوں کی سرزمین میں......

عثمانیوں کی کہانی کا آغاز ماضی میں چودھویں صدی کے آغاز میں ہوتا ہے، جب مسلمان ترکوں کے ایک گروہ نے، جن کی قیادت عثمان نامی اُن کے رہنما کر رہے تھے، شمال مغربی اناطولیہ کی ایک چھوٹی سی عملداری میں اپنے قدم جمائے۔ (لفظ عثمانیہ (Ottoman) ترکی لفظ عثمان لی سے نکلا ہے، یا ''عثمان کے بیٹے'' یہ وہ وقت تھا جب بغداد میں عباسیہ خلافت تباہ ہو چکی تھی۔ اور عرب شرقِ اوسط وحشی منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں تاراج ہو چکا تھا۔ دُنیائے اسلام میں عربوں کے زوال نے دوسری اقوام، خاص طور پر ترکوں کیلئے راہ ہموار کی۔

صحرائی عربوں کی طرح، ترک بھی ایک بنجر علاقے کے خانہ بدوش...... اس دفعہ ایک گھاس کے میدان کے۔ لہٰذا اُن کے ہاں بھی، اپنے نئے مذہب میں شامل کرنے کیلئے، ایک شائستہ ثقافت کی کمی تھی۔ لیکن، صحرائی عربوں کے برخلاف، جو اپنی قبل از اسلام کی قدامت پسندی اور تقدیر پرستی کو اسلام میں ساتھ لے آئے تھے، خانہ بدوش ترک اپنے نئے جنم کے ایک انتہا پسندانہ تجربے سے گزرے۔ اُنہوں نے مکمل طور پر ''اپنے آپ کو اپنے نئے مذہب کے سپرد کر دیا''۔ اور ''اپنی قومی شناخت کو اسلام کے اندر مدغم کر دیا، جیسا کہ عربوں اور ایرانیوں نے کبھی نہیں کیا تھا''

...... یہاں تک کہ تُرک کا نام ہی ایک مسلمان کے تقریباً مترادف ہو گیا۔ اس کا نتیجہ مذہب کے ساتھ والہانہ لگاؤ تھا۔ برنارڈ لیوس کے بقول ''اسلام کے ساتھ وفاداری میں اپنی سنجیدگی اور خلوص میں، ترکوں کا مقابلہ کوئی اور قوم نہیں کر سکتی۔''(۹)

ترکوں کے پاس نہ صرف جذبہ تھا بلکہ، اسلامی دُنیا کی سرحدوں کو ۔ مغرب کی طرف پھیلاتے ہوئے اسلام کی خدمت کرنے کیلئے فوجی مہارت بھی تھی ...... پہلے سلجوق خاندان کے تحت، جس نے وسط ایشیا اور شرقِ اوسط کے کچھ حصوں پر، گیارھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک حکومت کی اور بعد میں عثمانیوں کے تحت۔ موخرالذکر نے بازنطینی سلطنت کی حدود کو بتدریج پیچھے کی طرف دھکیلا، اور ۱۴۵۳ء میں اس کے دارالخلافہ قسطنطنیہ (جو بعد میں استنبول کہلایا) کو فتح کر کے اسے اختتام تک پہنچا دیا۔

عثمانی ریاست بہت تیزی سے پھیلی اور سولھویں صدی کے اوائل میں ایک سلطنت بن گئی۔ جو بُڈاپسٹ سے یمن تک اور، الجیریا سے بصرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ دُنیا کی سُپر پاور بن گئی۔

اسلام کی طرف سے اہل کتاب کو تسلیم کرنے کی موافقت میں، سلطنت عثمانیہ ایک تکثیریت پسند ریاست تھی، جس نے غیر مسلم قومیتوں کو اپنی شناختوں اور مذہبی رسومات کو محفوظ کرنے کی اجازت دی۔ لہٰذا، سرب، یونانی، آرمینائی، اور بلغاری، عیسائی ہی رہے۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں، سلیم اوّل، سخت گیر، جو کہ خصوصی طور پر ایک بہت سخت سلطان خلیفہ تھا، نے اپنی تمام عیسائی رعایا کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے پر غور کیا تھا۔ محض یک جنسی کی خاطر لیکن اُسے اپنے شیخ الاسلام کی طرف سے، جو مذہب کے معاملات میں بالاترین سند تھے، اس بات پر قائل کیا گیا، کہ یہ چیز ناجائز ہوگی۔(۱۰)

قانون کی حاکمیت اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی تجربیت پسندی کی وجہ سے، عثمانیوں نے اپنے عیسائی رعایا اور یہاں تک یورپ سے بھاگ جانے والے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے حقوق کو تسلیم کرنا جاری رکھا...... اس پر عیسائی مصلح مارٹن لوتھر، اور فرانسیسی فلسفی ژاں بودن کی طرف سے تعریف کا اظہار کیا گیا۔(۱۱) سب سے زیادہ تعریف، سترھویں صدی میں، یروشلم میں یونانی بطریق کی طرف سے آتی، جس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے ''ان عثمانیوں کے سلطان کے دل

MashalBooks.org

میں، ہمارے قدامت پسند مذہب کے مذہبی عقائد کو آزاد رکھنے کا ایک رُجحان ڈال دیا'' (۱۲) (تاہم عثمانیوں کی ایسی مثبت تصویروں کی، جگہ، اُنیسویں اور بیسویں صدیوں میں کہیں زیادہ منفی تصویروں نے لے لی، جب دو دور جن سے زیادہ مابعد عثمانی قومی ریاستوں کو، اپنی پیدائش کی شان بڑھانے کیلئے ماضی میں ایک ''تاریکِ دور'' کا نقشہ کھینچنے کی ضرورت پیش آئی۔ (۱۳)

سلطنتِ عثمانیہ یہودیوں کیلئے اور بھی سکون کا باعث تھی، اُس وقت، جب عیسائی یورپ میں اُنہیں معمول کے مطابق اذیتیں دی جاتی تھیں۔ سولھویں صدی کے بعد سے، ہنگری، فرانس اور صقلیہ سے نکالے گئے یہودیوں نے، عثمانی سرزمین میں پناہ حاصل کی۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں، ربی یزاک صرفاتی (Rabbi Yitzhak Sarfati) جس نے جرمنی سے ایڈرین، جواب مغربی ترکی ہے، میں ہجرت کی، نے اپنے آپ کو اتنا محفوظ خیال کیا کہ وہ یورپ میں یہودی طبقات کو لکھنے کے قابل ہوگیا، جس میں اُس نے اُن سے درخواست کی کہ وہ جو اس عذاب کو جو وہ عیسائیت کے ماتحت برداشت کر رہے تھے پیچھے چھوڑیں اور سلطنتِ عثمانیہ میں محفوظ پناہ گاہ حاصل کریں، ربی نے کہا: ''یہاں تُرکوں کی سرزمین میں ہمارے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے جس کی شکایت کی جائے۔ ہم میں سے ہر شخص امن اور آزادی سے رہتا ہے'' (۱۴)

۱۴۹۲ میں، سپین، سے نکالے گئے سیفارڈک یہودیوں کے ایک بڑے حصے نے اس مشورے پر کان دھرا، اور ترکی کیلئے سمندری سفر پر روانہ ہوا۔ جہاں اُن کا سلطان بایزید دوم کی طرف سے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سلطان بایزید زیادہ دیندار تھا۔ یہودیوں کی عثمانیوں کی طرف سے مہمان نوازی جدید دور میں بھی جاری ہے: اُنیسویں صدی کے اواخر میں، روس اور اس کے بلقانی اتحادیوں کے حملے کے خلاف استنبول کے کینساؤں میں عثمانی افواج کی فتح کیلئے دُعائیں مانگی گئیں۔ (۱۵)

حنفی طریق

سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے قبول کی گئی اسلام کی شکل نے ایک اہم فائدے کو پروان چڑھایا۔ اس نے فقہ میں حنفی مکتبِ فکر اور دینیات میں ماتریدی مکتبِ فکر کو اختیار کیا ...... جو دونوں، جیسا کہ سابقہ ابواب میں ذکر کیا گیا، سُنی طیف کے دلیل پرست گروہ میں تھے۔

اس چیز نے شریعت کی تعبیر میں سلطنت عثمانیہ کو زیادہ آزادی مہیا کی۔ عثمانی علما نے اکثر استحسان (فقہی ترجیح) کے حنفی اصول سے کام لیا، جس نے عوامی مفاد کیلئے نئے معاملات و مسائل سے نمٹنے کیلئے، شریعت میں تبدیلیوں کی گنجائش پیدا کی۔ (۱۶)

مثال کے طور پر سولھویں صدی میں شیخ الاسلام ابوسعود آفندی (Ebussuud Efendi) نے، پاکیزہ اداروں کی طرف سے معقول سود کی وصولی کو جائز قرار دیا کیونکہ وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کی خدمت کرتے تھے، (۱۷) اُنہوں نے گانے، رقص کرنے، چکر کھانے، اور ہاتھ ہلانے...... جو تمام مختلف احادیث کی رو سے ممنوع ہیں...... کو جائز قرار دیا۔ (۱۸)

دوسری طرف، وقت کے ایک اور عالم محمد برگیوی (Mehmet Birgui) نے، جو سخت حنبلی مکتبِ فکر کو مانتے تھے، ان ''جدّتوں'' کی مذمت کی، اور ابن سعود آفندی کی، حنفی مسلک پر مبنی، لچک کی مذمت کی۔ (۱۹)

عثمانی نظام اس مفہوم میں بھی جدّت پسند تھا، کہ یہ ریاست کو یہ حق دیتا تھا کہ وہ دُنیاوی قوانین کو، جنہیں قانون کہا جاتا تھا، شریعت کے ساتھ ساتھ، وضع کرے۔ (۲۰) ایسا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ شریعت سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی اور لہٰذا ریاست کو نئے قواعد وضوابط کو متعارف کروانے کا مذہبی طور پر جائز اختیار حاصل تھا۔ (۲۱) اسی روایت کی بدولت، یہ سلطنت، اُنیسویں صدی میں بہت سے تجدیدی قوانین وضع کرنے کے قابل ہوئی۔

یہاں تک کہ خود شریعت بھی عثمانی قانون سے منضبط تھی۔ قسطنطنیہ کے فاتح، سلطان محمد دوم کے تحت، کچھ سخت جسمانی سزاؤں (جیسا کہ ہاتھوں کا کاٹنا) کو متروک خیال کیا گیا اور اُن کی جگہ مار پیٹ اور مالی جُرمانوں کو رائج کیا گیا، جن کا اندازہ، مجرم کی مالی حیثیت کے مطابق لگایا جاتا تھا۔ سنگساری کو لاگو کرنا بھی مشکل ہوگیا، اور یہ بات معلوم ہے کہ عثمانی حکومت کی چھ صدیوں کے دوران، یہ صرف دو مرتبہ واقع ہوئی۔ (۲۳)

عثمانویوں کی لچکداری کا کچھ نہ کچھ تعلق اس کے جغرافیے کے ساتھ بھی تھا، جو کہ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اسلام کے تصورات کی تشکیل میں موثر تھا: ''پچھلی اسلامی ریاستوں کے برعکس، سلطنتِ عثمانیہ کا عروج اناطولیہ اور بلقان میں ہوا، جو کہ ٹھوس اور پائیدار کاشتکاروں کے علاقے ہیں، بجائے خانہ بدوشوں سے آباد صحراؤں کے کنارے کے۔'' (۲۴) اس نے خود مختار انجمنوں

MashalBooks.org

اور علاقائی نمایاں شخصیات کے اُبھار کی گنجائش پیدا کی، اور اس طرح ریاست کو مرکزی اقتدار...... مرکزی طاقت کی طرف سے مطلق غلبہ...... سے بچالیا...... جو کہ اُس بحیرۂ شرقِ اوسط کے جغرافیے کا ایک امتیازی نشان تھا۔(۲۵)

دُنیائے اسلام کے مغربی کنارے پر

اس امر نے کہ عثمانیوں کی جڑیں اناطولیہ اور بلقان میں تھیں، اُنہیں دُنیائے اسلام کے مغربی کنارے پر، جو دُنیائے عیسائیت کی سرحد پر تھا ایک منفرد زمینی تزویراتی حیثیت دے دی۔ مغرب کے ساتھ اس قربت نے اُنہیں یورپ میں تبدیلی کو تسلیم کرنے کے قابل بنایا...... یعنی جدیدیت کے عروج کو...... دوسرے مسلمانوں یا مشرقی اقوام کی نسبت بہت پہلے۔

درحقیقت ایک طویل عرصے تک، عثمانی، جو کہ اپنی برتری کے بارے میں ضرورت سے زیادہ پُراعتماد تھے، صلیب کے لوگوں کے طور طریقوں کے بارے میں کوئی خاص طور پر متجسس نہیں تھے۔ لیکن جب ایک مرتبہ، اُنہوں نے عیسائی طاقتوں کے ساتھ جنگوں میں شکست کھانا شروع کی، اور اپنی مفتوحہ زمینوں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے، تو عثمانی طبقۂ بالا نے اس بات کا احساس کرنا شروع کر دیا کہ اُن کے ہاں کسی نہ کسی چیز کی کمی ہے۔ خاص طور پر، ۱۶۸۳ میں، وی آنا کے دوسرے محاصرے میں۔ اپنی تباہ کُن شکست کے بعد، جو واضح طور پر یورپی طاقتوں کی احیایافتہ برتری کی علامت تھی۔ عثمانی سیاسی دانشوروں نے اصلاح کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، ابتدائی طور پر اُنہوں نے اپنی توجہ بدعنوانی اور بدنظمی پر مرکوز کی، یہ اُمید کرتے ہوئے کہ اُن کے سابقہ موثر نظام کی بحالی کافی ہوگی۔ لیکن جلد ہی اُن پر یہ منکشف ہوا کہ، زوال صرف اُن کی اپنی طرف کے مسائل کی وجہ سے نہیں، بلکہ یورپی سمت میں جدتوں کی وجہ سے بھی تھا۔

لہٰذا، اوائل اٹھارویں صدی سے آغاز کرتے ہوئے، عثمانی حکومت نے سول ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد کو، مختلف یورپی دارالخلافوں میں، ''مغربی طور طریقوں'' کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیجا۔ یارمی سیکیز محمد چالبی کو (Yirmisekiz Mehmet Celebi) جو کہ ۱۷۲۰ میں لوئی چہاردہم کے دربار میں بھیجا جانے والا خصوصی سفیر تھا، خاص طور پر ''قلعوں، کارخانوں، اور فرانسیسی تہذیب کے نمونوں کو عمومی طور پر مشاہدہ کرنے، اور جدید فرانسیسی اداروں پر رپورٹ دینے، جو کہ ترکی میں

قابلِ اطلاق ہو، کی ہدایت کی۔ (فرانسیسی......اور خوش قسمتی سے اینگلوسیکسن نہیں...... جدیدیت کا وہ سب سے بڑا نمونہ رہے جس کا تجربہ بہت سے عثمانیوں اور مسلمانوں کو ہوا) ایک عثمانی سول ملازم، جس نے یورپ میں وقت گزارا، احمد ریسمی آفندی (Ahmed Resmi Efendi) نے ۱۷۷۰ میں لکھا کہ ''جہاد کا دور'' گزر چکا ہے، اور عثمانیوں کو سفارت کاری اور اصلاح کا پُرامن راستہ اپنانا چاہیے۔(۲۷)

یورپ کو بھیجی جانے والی مہمات نے، جلد ہی، نئے نصابوں کے ساتھ نئے سکولوں، اور بعض یورپی سائنسی کتب کے ترکی زبان میں ترجمے کی طرف رہنمائی کی۔ پھر اٹھارویں صدی کے اواخر میں سلطان سلیم دوم کا نظامِ جدید آیا، جس نے اہم فوجی اور انتظامی اصلاحات کو جنم دیا۔ اگلے سلطان، محمود دوم نے، اس سے بھی زیادہ وسیع نظامِ جدید کا آغاز کیا...... پہلے اُس فوجی انتظامیہ سے نجات حاصل کر کے جو اصلاحات کی مزاحمت کرتی تھی اور پھر یورپی طرز کے لباس، فنِ تعمیر، قانون سازی، اداراتی تنظیموں اور زمینی اصلاحات کو متعارف کروا کے۔ اُس نے گرینڈ کونسل آف سٹیٹ بھی قائم کی، جو کہ پارلیمان کی پیشرو تھی، جو چار دہائی بعد آئی۔

محمود دوم نے، تمام لوگوں کیلئے، بلالحاظ مذہب مساوی شہریت کا تصور بھی متعارف کر دیا۔ یہ چیز عثمانی ریاست کے غیر مسلموں کے دل و دماغ جیتنے کے نصب العین سے براہِ راست منسلک تھی، کیونکہ موخر الذکر، اور خاص طور پر بلقان میں رہنے والے جدید قوم پرستی کے تصورات سے متاثر تھے۔ سربوں، بلغاریاؤں، آرمینیاؤں اور دوسرے عیسائیوں کو سلطنت کا وفادار رکھنے کی غرض سے، سلطان اور اُس کے سرکاری ملازمین نے، تمام شہریوں کے درمیان ایک مشترکہ اور مساوی شناخت کے طور پر عثمانیت کی روح کو پروان چڑھانا شروع کیا،

فیض، سُرخ، چوڑی چوٹی والی وہ ٹوپی جو محمود دوم نے ایک نئے قومی سرپوش کے طور پر اختیار کی، اس نئی عالمگیریت کی علامت بن گئی۔ اُن مختلف ٹوپیوں اور پگڑیوں کے برعکس، جو اس سے پہلے مذہبی ترجیحات کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی تھیں، اب تمام عثمانی، فیض (ترکی ٹوپی) کے تحت ایک قوم بن جائیں گے...... مشہور ہے کہ سلطان نے ۱۸۳۰ میں یہ اعلان کیا، ''اب سے بعد میں اپنی رعایا میں، مسجد میں مسلمانوں، گرجا میں عیسائیوں، اور کنیساؤں میں یہودیوں کے درمیان امتیاز کروں گا، لیکن ان کے درمیان کسی اور طرح کا کوئی فرق نہیں ہوگا''(۲۸)

MashalBooks.org

کیا تمام عثمانی برابر پیدا کئے گئے ہیں؟

بتدریج اصلاح کی ان کوششوں نے ۳نومبر ۱۸۳۹ء کو آگے کی طرف ایک بڑی زقند لگائی، جب سلطان محمود کے نئے تخت پر بیٹھنے والے بیٹے عبدالمجید نے، تنظیمات (دوبارہ تنظیم) کے فرمان کا اعلان کیا، ایک ایسی دستاویز جسے اپنے مواد اور اہمیت کے حوالے سے عظیم منشور (Magna Carta) سے تشبیہ دی گئی ہے۔(۲۹) اس فرمان کی علامیت سلطنت کے، اپنے مذہب کے ساتھ وفادار رہتے ہوئے اپنے طور طریقوں کی اصلاح کے نصب العین کی عکاسی کرتی تھی۔ سفارت کاروں اور عثمانی سرکردہ لوگوں کے ایک موثر اجتماع کے سامنے ایک عوامی اعلان کے بعد، نوجوان سلطان اور اس کے اہل کار ایک ایسے کمرے میں جمع ہوئے جس میں حضرت محمدؐ کی چادر محفوظ کر کے رکھی ہوئی تھی، اور تنظیمات کے ساتھ وابستگی کا حلف اُٹھایا......اس کا متن ''قرآنِ کریم کے احکامات'' پر عمل نہ کرنے کو سلطنت کے زوال کا سبب قرار دے کر اُس پر تنقید کرنے سے ہوا۔ پھر اس نے جان، عزت اور نجی ملکیت کی حفاظت کا اعلان کیا: مسلح افواج میں باقاعدہ منظم سرکاری جبری بھرتی کا اور منصفانہ اور کھلی عدالتی کارروائی کا۔ سلطان جوان انفرادی حقوق کے احترام کا حلف اُٹھا رہا تھا، واضح طور پر قانون کی رُو سے اپنے اختیارات کو محدود کر رہا تھا۔ اس نے یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ ''ان شاہی مراعات کو ہماری تمام رعایا تک پھیلایا جائے گا، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔''

ان آزاد خیال اصولوں کی تحریک واضح طور پر یورپ کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن عثمانی طبقۂ بالا کی نگاہ میں، یہ اسلام کی بنیادی اقدار کی تصدیق نو تھی (۳۰) مثال کے طور پر سلطان کا اپنی مرضی سے کسی کی جائیداد کو ضبط کرنے کے اختیار کی تنسیخ محض ایک جدید آزاد خیالی کی اصلاح نہ تھی، بلکہ شریعت کی نجی املاک کے بارے میں بنیادی ضمانتوں کا دوبارہ قیام بھی تھا......جو جزوی طور پر مرکزی طاقت کے قرونِ وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں کی طرف سے مٹا دی گئیں، جو کسی حد تک عثمانیوں نے وراثت میں حاصل کیا۔(۳۱)

تنظیمات کے معماروں میں سے ایک صادق رفعت پاشا تھے کہ A Booklet on conditions of Europe کے مصنف تھے، جس میں یورپ کی کامیابیوں کی وجوہات کا تجزیہ کیا گیا

اور یہ نتیجہ نکالا گیا، کہ اس کی کُنجی ایک آزاد خیال ریاست تھی، جو شہریوں کے حقوق اور آزادیوں کو تحفظ دیتی تھی۔ اس نے لکھا ''حکومت عوام کیلئے ہے، لیکن عوام حکومت کیلئے نہیں ہیں'' اس نے پریس کی آزادی کے تصوّر کی بھی تعریف کی، اور انسانوں کے فطری ناقابلِ تبدل حقوق کے تصور کی بھی۔ (۳۲) زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، اُس نے ان خیالات کا اظہار سیکولر نہیں، بلکہ مذہبی ڈھانچے کے اندر کیا (۳۳)

۱۸۵۶ میں، حکومتِ عثمانیہ نے ایک اور فرمان جاری کیا، جس کا عنوان ''اصلاحات، تھا''۔ جس نے مسلمانوں اور دوسرے شہریوں کے درمیان، باقی ماندہ تمام امتیازات کو ختم کر دیا، اور موثر طور پر غیر مسلموں کے حقوق پر زور دیا۔ غیر مسلموں کو مقامی خدمات کے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا، اُنہیں حکومت اور فوج میں کام کرنے کا حق دیا گیا، اور عدالت میں کسی مسلمان کے خلاف شہادت دینے کا حق بھی دیا گیا۔ اسی دوران میں، سلطان کے فرمان نے ''ہر امتیاز اور لقب کو جو میری سلطنت کی رعایا کے کسی بھی طبقے کو کسی دوسرے طبقے سے مذہب، زبان اور نسل کی بنیاد پر کم تر بنادے'' کی ممانعت کر دی۔ مسلمانوں کی گلیوں میں اس کی گونج ایک عام مذاق بن گیا: ''اب کافروں کو کافر نہیں کہا جائے گا۔''

نفاذ فوراً شروع ہو گیا۔ کچھ عیسائیوں کو مقامی مشاورتی کونسلوں میں جو ہر صوبے میں قائم کی گئی تھیں اور گرینڈ کونسل آف سٹیٹ میں بھی تعینات اور منتخب کیا گیا، نئے قائم شدہ، گیلا تسارے کے شاہی ہائی سکول میں، ۱۸۶۷ میں عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو اکٹھے طالب علموں کے طور پر قبول کیا گیا۔ دو سال بعد عثمانیہ قومیت کے قانون کا اجرا کیا گیا، جس نے مساوی شہریت کے اصول کو مزید مستحکم کیا۔(۳۴)

اسی عرصے کے دوران، عثمانیہ افسر شاہی نے، بڑی تعداد میں غیر مسلموں کو ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام کے قریب، تقریباً تین ہزار آرمینیائی استنبول کی اہم وزارتوں اور قانونی اداروں میں کام کرتے تھے۔ دوسرے چھ ہزار، دیہات میں ریاستی اہلکاروں کے طور پر کام کر رہے تھے۔ (۳۵) دوسرے بہت سے غیر مسلموں کی تعیناتی بیورو چیف، سفیر اور یہاں تک کہ وزیر جیسے بااثر مناصب پر کی گئی۔ ایک مغربی مورخ تبصرہ کرتا ہے، ''مساوات پسندی نے عثمانی ذہنوں میں حقیقتاً جڑ پکڑنا شروع کر دیا تھا'' (۳۶)

MashalBooks.org

تمام شہریوں کی برابری کیلئے یہ اصلاحات مسلم دُنیا کی غالب قوّت کی طرف سے کلاسیکی اسلامی سیاسی نظام کے ترک کے برابر تھیں...... غالب مسلمان اور ''حفاظت یافتہ'' لیکن دوسرے درجے کے غیر مسلم......

آج اس کلاسیکی نظام...... ذمہ...... کے ناقدین، اکثر اوقات، اُنیسویں صدی کے وسط کی عثمانی اصلاحات، اور اس حقیقت کو کہ برابر کی شہریت، یورپ میں بھی اسی دور تک قائم نہیں ہوئی تھی، دونوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہاں ہمیں ایک ستم ظریفی کا اضافہ کرنا ہے: چونکہ سلطنتِ عثمانیہ میں غیر مسلم اپنے ''تحفظ یافتہ'' (ذمی) حیثیت میں کوئی زیادہ بُری طرح سے نہیں رہ رہے تھے، لہٰذا اُن میں سے کچھ لوگوں نے، تنظیمات اور اصلاحات کے فرمانوں کے تحت متعارف کروائی گئی مساوات کے خلاف مزاحمت کی۔ مساوات نے وہ زائد ٹیکس ختم کر دیا جو غیر مسلموں کو ادا کرنا پڑتا تھا، لیکن اس نے اُنہیں مسلح افواج میں خدمات سرانجام دینے کے اہل بنا دیا۔ جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ زیادہ تر عیسائی جبری فوجی خدمت کیلئے بھرتی ہونے کے بجائے زائد ٹیکس ادا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ علاوہ ازیں، غیر مسلم قومیتوں کے رہنما بھی اپنے لوگوں پر اپنا کنٹرول کھونا نہیں چاہتے تھے۔ جب ۱۸۳۹ میں تنظیمات کے فرمان کو عوام کے سامنے پڑھا گیا، اور دوبارہ سُرخ سائن کی پوٹلی میں ڈالا گیا، تو یونانی قدامت پرست بطریق خوش نظر نہیں آتا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اُس نے کہا ''خُدا کرے یہ دوبارہ اس تھیلی سے باہر نہ نکالا جائے!۔'' (۳۷)

بلقانی عیسائی بھی ان اصلاحات سے متاثر نہ ہوئے کیونکہ وہ آزادی چاہتے تھے نہ کہ مساوی شہریت۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود قانونی ضمانتوں کے، سلطنت کے عیسائیوں اور مسلمانوں کیلئے مساوات پوری طرح روبہ عمل نہ آسکی ...... ''سلطنتِ عثمانیہ کے سرکردہ سیاسی مفکرین پر عدم اعتماد کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ بہت سے عیسائی چاہتے تھے کہ یہ (مساوات) ناکام ہو جائے۔'' (۳۸)

مزید برآں، جبکہ مساوات کے استحکام میں ایک رُکاوٹ ''برتری کا وہ پیدائشی رویہ تھا جو مسلمان ترک رکھتا تھا'' (۳۹)، دوسری رُکاوٹ، ستم ظریفانہ طور پر، یورپی ریاستوں اور روس کی طرف سے، سلطنت کے عیسائیوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کیلئے مسلسل مداخلت تھی۔ عثمانیوں

کے ہاں اس مداخلت کا مفہوم یہ تھا کہ اگرچہ وہ تمام شہریوں کو برابر خیال کرتے تھے۔ لیکن غیر ملکی طاقتیں ایسا خیال نہیں کرتی تھیں۔ مسلم آبادی ''ہزاروں متوسلین کو، عیسائی سفرا اور کونسلوں کی طرف سے دی جانے والی حمایت [سے اُکتا چکی تھی]...... جنہیں عام طور پر ٹیکسوں اور اپنی ریاست کی عدالتوں کے خلاف تحفظ حاصل تھا، اور اکثر اوقات اُنہیں غیر ملکی پاسپورٹ دیئے جاتے تھے'' (۴۰) ایک غلطی تھی جو مغربی طاقتوں نے اُس وقت کی، اور ایک ایسی غلطی جو وہ مسلسل آج تک کئے جا رہے ہیں: مسلمان ملکوں میں زیادہ مذہبی آزادی کی اُن کی پُکاریں، صرف عیسائیوں کے حقوق پر توجہ مرکوز کرتی تھیں، نہ کہ مسلمانوں کے حقوق پر۔

''مسلمان اب...... آزاد ہے...... عیسائی بننے کیلئے''

تنظیمات کی اصلاحات کی برکتوں میں سے ایک، وسیع تر مذہبی آزادی تھی۔ اُس وقت تک، غیر مسلموں کو اپنا مذہب اختیار کرنے اور اُس پر عمل کرنے کی آزادی تھی، لیکن اسلام سے عیسائیت میں تبدیلی، جیسا کہ شریعت کا حکم تھا، موت کی سزاوار تھی۔

اس سخت سزا کے نفاذات میں سے ایک، استنبول میں اکتوبر ۱۸۴۳ میں واقع ہوا، لیکن اس پر ہونے والے ردِ عمل ملے جُلے تھے۔ ایک امریکی مشنری سائرس ہیملن (Cyrus Hamlin) نے کہا ''بوڑھی مسلمان جماعت انتہائی ذلّت آمیز طریقے سے کامیاب ہوگئی'' دوسری طرف ''نوجوان ترک جماعت نے اس کی مذّمت ''یورپ کی بلاوجہ توہین اور پُرانے احمقوں کی انتہائی حماقت'' کے طور پر کی۔ (۴۱)

موخر الذکر نقطۂ نظر تنظیمات کے زیادہ موافق تھا۔ لہٰذا اگرچہ ارتداد پر شرعی قوانین سرکاری طور پر متروک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن، ۱۸۴۴ کے بعد ذاتی طور پر ترکِ اسلام عملاً آزاد ہو گیا (۴۲) اس سال ایکر میں ایک واقعے کے بعد، ایک عدالت نے فیصلہ دیا، ''اعلیٰ [عثمانیہ] ریاست کے کسی شہری کو کسی کی طرف سے، اُس کی خواہش کے برعکس، اسلام میں داخل نہیں کیا جائے گا۔'' (۴۳) اس سے مضبوط تر ضمانت ۱۸۵۶ کے اصلاحات کے فرمان کے ساتھ آئی، جس میں سلطان نے یہ اعلان کیا: ''جیسا کہ میری سلطنت میں مذہب کی تمام اقسام کا ادّعا آزادی سے کیا جاتا ہے اور کیا جائے گا، لہٰذا سلطنت کے کسی شہری کو اُس مذہب پر عمل کرنے سے جس کا وہ ادّعا کرتا ہے، نہیں

MashalBooks.org

روکا جائے گا، نہ ہی اُسے اس بنیاد پر، کسی بھی طرح تنگ کیا جائے گا۔ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔'' (۴۴)

اگلے سال، اسلام سے عیسائیت میں تبدیلی مذہب کے ایک مقدّمے میں تحقیقات کرنے والے سرکاری کمشن نے اسے جائز پایا۔ ''اب ایک مسلمان بھی عیسائی بننے کیلئے اتنا ہی آزاد ہے، جتنا کہ ایک عیسائی مسلمان بننے کیلئے''، اس فیصلے میں کہا گیا۔

''حکومت ان دونوں معاملات میں کوئی فرق نہیں کرے گی'' (۴۵)

نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۰ میں دمشق میں عیسائی مخالف فسادات کے دوران، عثمانی حکام نے اس بات کی حمایت کی، جو عیسائی اسلام قبول کرنے پر مجبور کئے گئے تھے، دوبارہ اپنے اصلی مذہب کی طرف لوٹائے جائیں۔ (۴۶) ''مرکز کی طرف سے احکامات ہمیشہ اسی مزاج میں ہوتے [تھے]''، ایک ترکی مورخ، جس نے اس دور کے ارتداد کے معاملات کا مطالعہ کیا تھا، یہ نتیجہ نکالتا ہے، ''تبدیلی مذہب کے معاملات میں کسی جبر یا زبردستی کی اجازت نہیں ہے۔'' (۴۷)

لیکن یہاں پھر، ریاست میں مغربی مداخلت کے ادراک، اور اس کے ردِّعمل نے، اس کے ایک حقیقی آزادانہ رویے میں ارتقا پانے، میں رُکاوٹ ڈالی۔ ''ایک طرف، ریاست نے خلوص سے مرتدین کے قتل کو روکنے کی کوشش کی، لیکن دوسری طرف، یہ اپنے لوگوں کو غیر ملکی (مشنری، سفارتی) حملوں کے خلاف تحفظ دینے میں سخت مشکل میں تھی۔'' (۴۸) لہٰذا ''تبدیلی مذہب کرنے والا یا مرتد، بین الاقوامی وقار کی جنگ میں، جنگ کی بنیادی وجہ بن گیا، جس میں عظیم طاقتوں نے، واحد باقی بچ جانے والی غیر عیسائی طاقت پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی۔'' (۴۹) مسئلہ صرف مذہب کا نہیں، بلکہ اقتدارِ اعلیٰ کا تھا۔

مذہبی وابستگی سے منسلک یہ سیاسی مفہوم، ہم عصر دور تک بھی چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ، آج کے تُرکی میں، وہ لوگ جو تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں سب سے زیادہ رجعت پسند ہیں، وہی لوگ ہیں جو اقتدارِ اعلیٰ کے بارے میں بہت زیادہ پُر جوش ہیں: قوم پرست، جن میں سے کچھ، حیرت انگیز طور پر بالکل سیکولر ہیں (۵۰) غالباً یہ واضح تضاد، قرونِ وسطیٰ کے اسلام میں ارتداد پر پابندی کی سیاسی نہ کہ مذہبی اصل پر بھی کچھ روشنی ڈالتا ہے...... ایک ایسا نکتہ جس کی طرف ہم آنے والے ابواب میں رجوع کریں گے۔

اسلامی آزادی پسندی اور اس کے علمبردار

اگرچہ تنظیمات کی اصلاحات، زیادہ تر انتظامی عہدیداروں کی طرف سے چلائی جا رہی تھیں، لیکن اُنہیں دو، دوسرے عناصر کی طرف سے استحکام دیا جا رہا تھا: نیا متوسط طبقہ، اور نیا اُبھرنے والا آزاد خیال طبقہِ دانشوران۔

اُنیسویں صدی تک، عثمانیوں نے ایک ایسے زمین کے پٹے کے نظام پر بھروسہ کیا، جسے اقطا سسٹم (جس پر پہلے بحث ہوچکی ہے) سے تشکیل دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ریاست تمام زمین کی مالک تھی، اور زمین کا کوئی عطیہ عارضی ہوتا تھا، اور اُسے زمینداروں اور کسانوں کے درمیان مشروط طور پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں زمین کی کوئی نجی ملکیت نہیں تھی۔

لیکن تنظیمات کی اصلاحات نے اقطاع سسٹم کو ختم کر دیا۔ تنظیمات کے فرمان نے ''[اس] زمین کے پٹے کے طریقِ کار کی مذمت کی، جو اس معاملے میں انتہائی تباہ کُن ہتھیاروں میں سے ایک ہے، اور جس کا کوئی مفید ثمر کبھی نہیں دیکھا گیا۔'' جلد ہی دوسرے قوانین نے نجی ملکیت کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اُسے پروان چڑھایا یہ پوری اصلاح ''معاشی آزادی پسندی کو جذب کرنے'' پر مبنی تھی، اور اس کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا تھا، جو معاشی زندگی میں مختارِ کاروبار کے طور پر حصہ لیتے'' (۵۱) اس نے کام کیا...... کم از کم ایک حد تک۔ عثمانیہ تاریخ کے پروفیسر کمال کے الفاظ میں:

> ''[نجکاری کے] نتیجے کے طور پر، پُرانے اہم لوگوں نے، اپنا امتیاز کھو دیا، اور نئے متوسط طبقے میں شامل ہوگئے، جس کی قیادت بنیادی طور پر، نئے اُن صاحب جائیداد اور تجارتی گروپوں کے ہاتھ میں تھی، جو پورے اناطولیہ، اور رومیلی (بلقان)، عراق، شام اور فلسطین سے اُبھرے۔
>
> نئے انفرادیت پسند اور اصلاح کا ذہن رکھنے والے متوسط طبقے نے بیک وقت تبدیلی کا دفاع کیا، اور روایت اور ثقافت کے احترام کا بھی مطالبہ کیا، کیونکہ وہ جدیدیت اور اسلام کو مکمل طور پر قابلِ مصالحت سمجھتے تھے...... اصول پرست بادشاہت کو، کسی نہ کسی طرح کی شراکت پر مبنی ایک آئینی نظام میں تبدیل کرتے ہوئے۔ اپنے اسلامی عقیدے کا تحفظ کرتے ہوئے اور سیاسی طاقت حاصل کرنے اور اُسے جائز

MashalBooks.org

بنانے کے طریقے تلاش کرتے ہوئے [یہ] جدید دور میں داخل ہوگیا......آزادی کی شروعات کے بیج اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بو دیئے گئے۔" (۵۲)

اصلاح کا ایک دوسرا عامل تنظیمات کے آخری دور کا ایک دانشور گروہ تھا، جنہیں نوجوان عثمانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ......انہیں اُن نمایاں نوجوان ترکوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے، جو کئی دہائیاں بعد میں آئے اور وہ زیادہ سیکولر، زیادہ قوم پرست اور زیادہ انقلابی تھے۔ نوجوان عثمانی سیکولر کی بجائے اسلامی، قوم پرست کی بجائے عثمانیہ پرست، اور انقلابی کی بجائے ترقی پسند تھے۔ وہ اصلاحات کی حمایت کرتے تھے، اور حکومت پر صرف اُنہیں نافذ کرنے میں ثابت قدم یا اصول پرست نہ ہونے کی وجہ سے تنقید کرتے تھے۔ جب سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۶۸ء میں ایک تقریر کی، اور نئے قائم شدہ قانونی حقوق کے بارے میں ایسے بات کی، گویا کہ وہ اس کے عوام کیلئے اس کی فیاضی کا ایک حصہ تھے، تو سب سے نمایاں نوجوان عثمانی، نامک کمال، نے درجِ ذیل لکھا:

> "اگر اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے لوگ آج تک سلطان کے غلام تھے۔ جس نے اپنے دل کی اچھائی کی وجہ سے، اُن کی آزادی پر مہر تصدیق ثبت کی، تو یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم کبھی اتفاق نہیں کرسکتے، کیونکہ ہمارے اعتقادات کے مطابق، لوگوں کے حقوق، الوہی انصاف کی مانند، ناقابلِ تبدیل ہیں۔" (۵۳)

نامک کمال نے، شوریٰ کے قرآنی اصول میں نمائندہ حکومت کی بنیاد بھی پالی تھی، جس کا تقاضا یہ ہے کہ قومیّت کے بارے میں معاملات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے ہونا چاہیے۔ آج تک، یہ دلیل، حوالے کے اسلامی ڈھانچے میں، جمہوریت کا دفاع کرنے کیلئے بنیادی ہتھیاروں میں سے ایک ہے۔ کمال کے مطابق ۱۸۳۹ کا تنظیمات کا فرمان اچھا تو تھا لیکن بہت اچھا نہیں تھا۔ سلطنت کو ایک "اسلامی خلافت کے منشور" کی ضرورت تھی جو مکمل طور پر "سوچ کی آزادی، لوگوں کے اقتدارِ اعلیٰ، اور باہمی مشاورت سے حکومت کے نظام کو قائم کرے" (۵۴)

۱۸۶۸ میں، نوجوان عثمانیوں نے حُریت نامی ایک اخبار نکالنا شروع کیا، اس میں اُنہوں نے "حکومت کے اقدام پر ایک راست آزادانہ تنقید اور آئینی اصلاح کے ایک پروگرام کا اظہار

کیا" (۵۵) قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُنہوں نے ایسی تجاویز ایک سیکولر ایجنڈے کیلئے نہیں بلکہ ایک اسلامی ایجنڈے کیلئے تیار کیں۔ ان نوجوان عثمانیوں نے یہ استدلال کیا کہ اسلام کی اوّلین دہائیوں نے جمہوریت کی ابتدا اور آزادی پسندی کی ابتدا دیکھی۔ یورپ کی ترقی انہیں تصوّرات کو ترقی دینے سے ہوئی، جبکہ مسلمانوں نے غلطی سے انہیں نظرانداز کردیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اب وقت تھا کہ یورپ سے درآمدات، اور اسلام کے ابتدائی خاصی سے جذبہ حاصل کرکے، آگے بڑھا جائے۔

نوجوان عثمانی، اسلامی دُنیا میں، اسلام سے متاثر ہوکر ایک جدید نظریہ وضع کرنے والی پہلی تحریک بن گئی۔ اور لیجئے، دیکھئے، اُن کا نظریہ ایک آزادی پسندانہ نظریہ تھا۔

سڑک پر جھٹکے

آزادی پسندوں کے خواب نومبر ۱۸۷۶ء میں سچ ہوگئے، جب نئے تاجپوشی شدہ سلطان عبدالحمید دوم نے ایک "بنیادی قانون" یا آئین کو تسلیم کرلیا۔ اس میں کہا گیا کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہے،" لیکن اس نے شہریت کی جدید سیکولر تعریف کو بھی قبول کیا، "ریاست کے تمام شہری عثمانی کہلاتے ہیں"، ایک شق میں کہا گیا، اور دوسری میں اعلان کیا گیا: ہر عثمانی، دوسروں کی آزادی میں مداخلت نہ کرنے کی شرط پر ذاتی آزادی حاصل کرتا ہے" ایک اور شق نے یہ ضمانت دی کہ "تمام عثمانی قانون کے آگے برابر ہیں: اُن کے ایک ہی حقوق ہیں ......بغیر مذہب کے کسی تعصب کے۔"

سلطان کا اقتدار ابھی بھی مضبوط تھا، لیکن نئے آئین نے کچھ قانون سازی کے اختیارات کے ساتھ ایک پارلیمنٹ بھی قائم کردی تھی۔ ۱۸۷۷ میں عام انتخابات منعقد ہوئے ......عثمانیہ اور بلاشبہ اسلامی تاریخ میں بھی پہلا انتخاب۔ پہلی عثمانیہ پارلیمان کا اجلاس ۱۹ مارچ ۱۸۷۷ کو ہوا، جس میں اس کی نشستوں کی ایک تہائی تعداد غیر مسلموں کی طرف سے پُر کی گئی تھیں ......آرمینیاؤں یونانیوں، یہودیوں اور بلغاریوں کی طرف سے ......پہلی اسلامی آزاد جمہوریت وجود میں آ گئی۔ لیکن جلد ہی اسے ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

روس......جس کے، طویل عرصے سے عثمانی علاقوں کے بارے میں بُرے عزائم تھے......

MashalBooks.org

نے سلطنت کے مشرقی قدامت پرست لوگوں کی مشتعل کیا، جنہیں وہ فطری اتحادی خیال کرتا تھا۔

۱۸۷۶ میں، اُس سال میں جس میں عثمانیوں نے نئے آئین کو بے نقاب کیا، بلغاریہ میں ایک شورش بپا ہوگئی: جلد ہی اس میں سرب اور مانٹی نیگرن شامل ہوگئے۔ روس جلد ہی تصویر میں آ گیا، اور عثمانیوں نے اچانک اپنے آپ کو روسیوں، سربوں، مانٹی نیگروں، رومانیوں اور بلغاریوں کے ساتھ برسرِ پیکار پایا۔ بڑی لڑائیاں بلقان اور کاکیشیا میں ہوئیں، اور عثمانی فوج اور مسلمان آبادیوں کو بہت بڑے نقصان برداشت کرنا پڑے۔

صرف بلغاریہ میں، کوئی ایک چوتھائی ملین مسلمان، زیادہ تر ترک، یا قتل کئے گئے یا جنگ کے نتیجے میں لقمۂ اجل بن گئے: نصف ملین دوسروں کو، جس میں ہزاروں بلغاری یہودی بھی تھے، اپنی جان بچانے کیلئے بھاگ کر ترکی جانا پڑا۔ جنوری ۱۸۷۸ میں، روسی افواج استنبول کے مضافات میں پہنچ گئیں۔ سلطنت کیلئے اب تک کا بدترین خطرہ پیدا کرتے ہوگیا۔

پھر یورپی طاقتوں نے مداخلت کی اور ایک سفارتی عمل شروع ہوگیا۔ یہ برلن کی کانگریس میں ایک معاہدے پر دستخط کرنے سے اختتام پذیر ہوا (جولائی ۱۸۷۸) مانٹی نیگرو، سربیا، اور رومانیہ آزاد ریاستیں بن گئیں اور بلغاریہ ایک خودمختار ریاست بن گیا۔ اناطولیہ کے مشرق میں، چار شہر بشمول کارز کے روس کو دے دیئے گئے۔ آخر کار، عثمانیوں کو اپنی ۲/۵ زمین کھونا پڑی، اُنہیں تاوانِ جنگ کی ایک بھاری بھرکم رقم روس کو ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور بلقان اور کاکیشیا سے آنے والے ایک ملین تباہ حال مہاجرین کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ یہ پوری اُنیسویں صدی میں، عثمانیوں کیلئے سب سے زیادہ تباہ کُن لمحہ تھا۔

اس بیرونی خطرے کا اندرونی اثر اُس بات کی یاد دہانی کرواتا تھا جس کے خلاف جیمز میڈیسن نے تنبیہ کی تھی جب اُس نے جنگ کی تعریف ''آزادی کا سب سے خطرناک دشمن'' اور ''انتظامیہ کے صوابدیدی اختیارات کا توسیع کنندہ'' کے طور پر کی تھی۔ (۵۶) جب سلطان عبدالحمید دوم نے، جو جمہوریت پر کبھی بھی حقیقی یقین نہیں رکھتا تھا روسی فوجوں کو اپنے دارالخلافہ کے باہر چند میل کے فاصلے پر دیکھا، تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس وقت سلطنت کو اور کسی بھی چیز سے زیادہ نظم اور ضبط کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ''جنگی اختیارات'' حاصل کرتے ہوئے اُس نے آئین کو معطل، اور پالیمان کو کالعدم کر دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا پہلا آئینی دور، جیسا کہ بعد میں مورخین نے

اسے قرار دیا محض ایک سال سے کچھ اوپر قائم رہا۔

یہ اُس بوجھ کی بہت سی مثالوں میں سے صرف ایک تھی، جس کا سامنا عثمانیوں (اور بعد میں دوسرے مسلمانوں) کو مسلسل کرنا پڑا جبکہ وہ اصلاح کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ وہ اُس وقت آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ وہ غیر ملکی خطرے کی زد میں تھے، دوسری طرف، مغرب، سولھویں صدی کے بعد سے، کسی مخالف تہذیب کے دباؤ، یا اپنی سرحدوں کے عدم تحفظ کے بغیر، سیاسی اور معاشی آزادی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہاں تک کہ مغرب کے اندر بھی، زیادہ تر آزادی پسندانہ خیالات نے، اُن ممالک میں پرورش پائی، جو جغرافیائی طور پر زیادہ الگ تھلگ اور اس طرح دوسروں کی نسبت زیادہ محفوظ تھے...... برطانیۂ عظمیٰ اور ریاست ہائے متحدہ۔

دوسری طرف، مسلمان مسلسل مصیبت میں تھے، اپنی بقا کے خوف سے (جیسا کہ عثمانی دور میں) یا آزادی کے فقدان سے (جیسا کہ پس عثمانی نوآبادیاتی دور میں)...... ایک اضافی بوجھ مغرب کے طور طریقوں کو اپنانے کی نفسیاتی مزاحمت کا بھی تھا، جبکہ مغرب دھمکیاں دیتا اور خوفزدہ کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ، آزادانہ خیالات مسلمان معاشروں میں اُن ادوار میں زیادہ مقبول ہوئے جب اُنہوں نے اپنے آپکو زیادہ محفوظ اور معزز محسوس کیا، اور اُن ادوار میں کم مقبول ہوئے جب اُنہوں نے اپنے آپ کو غیر محفوظ اور ذلّت میں محسوس کیا۔ (۵۷)

خلیفہ کیا کرے گا؟

سلطان عبدالحمید کا تیس سالہ اصول پرست اقتدار، جو ۱۹۰۸ء میں دوسرے آئینی دور تک برقرار رہا، عثمانیہ تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اُس آزادہ جمہوری روح کو، جو ۱۸۳۹ء میں تنظیمات کے ساتھ وجود میں آئی، اور نوجوان عثمانیوں کے ساتھ اسلامی۔ آزادی پسندانہ نظریاتی ملاپ کے ساتھ عروج کو پہنچی، یقیناً ایک دھچکے کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سلطان ایک تنگ نظر دقیانوسی ہونے سے بہت دور تھا۔ اُس نے جدّت طرازی جاری رکھی، تعلیم، قانونی اصلاحات، اور معاشی ترقی، بشمول ریلوے اور ٹیلیگرافی کی لائنوں کی تعمیر کے اندر مثبت پیشرفتیں

MashalBooks.org

کرتے ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں، اُس کی سرپرستی میں، دیکارت کی ڈسکورس آن میتھڈ (Discourse on Method) کا ترجمہ تُرکی زبان میں کیا گیا، اُسی دور میں مغربی کلاسیک اور ساتھ ہی ساتھ وقت کے یوروپی سیاسی موضوعات، عثمانی دانشورانہ زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ ایک دیندار مسلمان، عبدالحمید نے مغربی تہذیب کی بھی تعریف کی اور اپنے ساتھی مسلمانوں کو، عیسائیوں سے اپنے مذہب سے کٹڑ پن اور جہالت سے نجات حاصل کرنے کی کامیاب کوششوں کے بارے میں سیکھنے کا مشورہ دیا (۵۸)

اُس کی حکومت کے تحت، ایک اہم تبدیلی عثمانیت پرستی سے اُس چیز کی طرف دقیق تبدیلی تھی، جسے بعد میں اسلام پسندی کا نام دیا گیا۔ (۵۸) تاہم، موخرالذکر کو بیسویں صدی کے نظریے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے، جس کا یہی نام تھا۔ عبدالحمید کی اسلام پسندی ایک عملی پالیسی تھی، جس کی ضرورت اُس نئی سیاسی حقیقت سے پیدا ہوئی، جس کا سامنا سلطنت کو تھا۔ بلقان کی اُن بغاوتوں نے، جو کانگریس آف برلن میں چار نئی ریاستوں کی تخلیق پر منتج ہوئیں، عثمانی طبقۂ بالا کی غلط فہمی دور کردی تھی، جنہوں نے یہ اُمید باندھ لی تھی، کہ آزادانہ اصلاحات، تمام شہریوں کے درمیان، بلالحاظ عقیدہ، قومی وحدت پیدا کردیں گی۔ عیسائی قومیں، ایک ایک کرکے، اس تصوّر کو چکنا چور کررہی تھیں۔

لہٰذا برلن کی کانگریس کے بعد، مسلمانوں کو سلطنت کا وفادار رکھنا، ٹوٹ پھوٹ کے خطرے کے خلاف عثمانیوں کی دفاع کی دوسری صف تھی۔ عبدالحمید نے سلطنت کے اسلامی کردار اور تمام مسلمانوں کے خلیفہ کے طور پر اپنے مذہبی امتیاز پر زور دیا...... پوری دُنیا کے مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ نمٹتے ہوئے اور اُنہیں اپیل کرتے ہوئے...... اُس نے خلیفہ کی قدیم بدعنوانی کے تصوّر کو تبدیل کردیا...... اُمویوں اور کچھ عباسی حکمرانوں کے ورثے کو...... اور اس ادارے کو نیا احترام اور اختیار عطا کیا۔ یوروپی سیاسی مفکروں نے، اُس کے ''بین الاسلامی'' پیغام پر بھنویں سیکڑیں، لیکن سُلطان کو مسلمانوں اور مغربی طاقتوں کے درمیان کوئی نئی کشیدگی پیدا کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ درحقیقت، وہ حقیقتاً دونوں کے درمیان امن قائم کرنے میں مدد دینا چاہتے تھے...... ایسے دور دراز مقام پر بھی، جیسا کہ جنوب مشرقی ایشیا۔

یہ اُس وقت واقع ہوا، جب ۱۸۹۸ء میں امریکیوں نے فلپائن پر قبضہ کرلیا، اور سولو میں

ایک تکلیف دہ بغاوت کا سامنا کیا، جو کہ جنوبی مسلمان سلطنت ہے، ایک سال بعد، ترکی میں امریکی سفیر، آسکر ایس سٹراس (Oscar S. Straus) کو سیکرٹری آف سٹیٹ جان ہے (John Hay) کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ جس میں اُس نے حیرت کا اظہار کیا کہ آیا [عثمانی] سلطان کو ان حالات کے تحت اس بات پر راضی کیا جاسکتا ہے کہ وہ فلپائن کے مسلمانوں کو، جنہوں نے ہمیشہ سپین کی مزاحمت کی ہے، رضاکارانہ طور پر ہمارے کنٹرول میں آنے کی ہدایت کریں۔'' پھر سٹراس نے سلطان عبدالحمید سے ملاقات کی، اور ترپیولی اور ریاست ہائے متحدہ کے درمیان اٹھارویں صدی کے ایک معاہدے کی دفعہ ۱۱ دکھائی، جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ موخرالذکر، کا ''مسلمانوں کے سکون، مذہب اور قوانین کے خلاف دشمنی کا کوئی کردار نہیں تھا''۔

''اس دفعہ سے خوش ہوکر'' عبدالحمید نے زور دیا کہ ''زیرِ بحث مسلمان اُسے مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کرتے تھے، اور اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کے مشورہ پر عمل کریں گے۔'' اس وقت مکہ میں، دوسو سرداروں نے جلد ہی استنبول سے ایک خط وصول کیا ''اُس وقت تک امریکیوں کے خلاف کسی قسم کی دشمنی میں نہ اُلجھیں، جب تک، امریکی اقتدار کے تحت اُن کے مذہب میں کسی مداخلت کی اجازت نہ دی جائے۔''

یہ پیغام موثر ثابت ہوا، اور سولو کے مسلمانوں نے بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔ جلد ہی صدر ولیم میکن لے نے اپنے سفیر کا، اُس کے ''شاندار کام'' کرنے کیلئے شکریہ ادا کیا اور اُسے یہ اعزاز دیا کہ اُس نے ''ریاستہائے متحدہ کی میدان میں موجود کم از کم بیس ہزار افواج کو بچالیا تھا'' (۶۰)

یہ عبدالحمید کے امن قائم کرنے کی صرف ایک مثال تھی۔ اُس نے ''مقبولِ عام اسلامی بنیاد پرستی کی تحریکوں کو روکنے میں بھی بہترین کوششیں کی تھیں'' (۶۱) درحقیقت، اُنیسویں صدی کے اختتام تک یوروپی سیاسی مفکرین اُسے ایک ایسا اتحادی خیال کرنے لگے تھے، جس نے مسلمان عوام میں یورپ مخالف جذبات کو ٹھنڈا کیا تھا۔ (اُس کے والد، عبدالمجید نے بھی، ۱۸۵۷ کی سپاہیوں کی بغاوت کے دوران، ہندوستان کے مسلمانوں کو خاموش کرکے برطانویوں کی مدد کی تھی) (۶۲)

MashalBooks.org

''تبدیل ہوتا ہوا دور قانون کی تبدیلی کو جائز بنا دیتا ہے''

سلطان عبدالحمید نے، جو کہ ایک امن کار اور ایک مصلح تھا، اسلامی روایت میں بھی ''جدّت طرازیاں'' کیں۔ اس کی حکومت میں اصلاحات کے سب سے بڑے کام کی ذمہ داری اُس کے ایک وزیر، احمد جودت پاشا کی طرف سے سنبھالی گئی۔ یہ متبحر عالم، جس کے وہابی بغاوت پر وقائع کا اس باب کے آغاز میں حوالہ دیا گیا، سلطنت کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر سیاسی مفکرین میں سے ایک تھا۔ پُراعتماد طور پر آگے بڑھنے والے کی خواہش رکھنے والے اس شخص نے، شریعت کی اصلاح جدید طرز کے ایک قانونی ضابطہ جسے مجلّہ (Mecelle) کہا جاتا تھا، لکھ کر کی، جسے شرقِ اوسط کی بہت سی مسلم اقوام نے بیسویں صدی کے وسط میں نافذ کیا، اور اسرائیل نے ۱۹۸۰ کی دہائی تک استعمال کیا۔ (۶۳)

مجلّہ (Mecelle) سے پہلے، شریعت غیر مدوّن تھی...... اسلامی قانون کا کوئی ایک ذریعہ ایسا نہ تھا، جس کا آدمی، ایک کتاب کھول کر حوالہ دے سکتا۔ اس کی بجائے مختلف قانونی آرا کی بے شمار تعداد تھی۔ ایک مخصوص اسلامی منصف (قاضی)، اُس خاص مقدمے میں اپنی صحیح قانونی رائے دینے کیلئے، جو اس کے سامنے لایا جاتا تھا، اپنی مہارت کو استعمال کرتا تھا۔ یہ ہنگامی روایت تکثیریت پسند تھی اور ایک مفہوم میں جمہوری تھی، لیکن یہ جدید ہوتے ہوئے عثمانی معاشرے کے تناظر میں نااہل ہوتی جا رہی تھی۔ جس میں قانونی معاملات بہت زیادہ پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ پس، پوری سلطنت میں قابلِ استعمال واحد دیوانی ضابطہ ناگزیر تھا۔

اس ضرورت کے تحت، کچھ عثمانی سیاستدانوں جیسا کہ علی پاشا، نے مجموعی طور پر پورے یورپی قانونی نظام کو شامل کرنے کی تجویز پیش کی، بلکہ اُنہوں نے فرانسیسی دیوانی ضابطے کے مکمل ترجمے کی ترجیح اختیار کی...... وہ تصور جس کا بعد میں بیسویں صدی کے سیکولر پسندوں کے ہاتھوں اطلاق ہوا۔ دوسرے رہنما بشمول جودت پاشا کے روایت کو مکمل طور پر ترک کرنے کی حمایت نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف اس کے ڈھانچے اور مواد میں اصلاح کی حمایت کرتے تھے۔ بعد والا خیال غالب آیا، اور ۱۸۶۸ میں جودت پاشا کو، شریعت کو جدید بنانے کیلئے، شریعت کی ضابطہ بندی کرنے اور اسے جدید بنانے کے کمیشن کے سربراہ کے طور پر متعین کیا گیا۔

دس سال کی باریک بینی کے کام کے بعد، یہ کمشن ایک سولہ جلدوں کا شاہکار لے کر آیا، جو بنیادی طور پر فقہ کے حنفی مکتبِ فکر پر مبنی تھا، لیکن اس نے اس کے کچھ پہلوؤں کو جدید بنا دیا تھا اور انتہائی آسان متبادلات کا انتخاب کرنے کیلئے دلیل پرست مکتبِ فقہ کے طریقوں کو استعمال کیا تھا۔ اپنے تعارف میں، جودت پاشا نے ایک دلیل پرست مقولہ کا حوالہ دیا تھا: ''تبدیل ہوتا ہوا دور قانون کی تبدیلی کو جائز بنا دیتا ہے۔''

زیادہ قدامت پرست علما کو اپنی اصلاح کے جواز کا قائل کرنے کیلئے، جودت پاشا نے جلال الدین الدّاوانی کی کتب کا حوالہ دیا، جو کہ پندرھویں صدی کا ایک حنفی عالم تھا، جس نے یہ استدلال کیا کہ سیاسی حاکمہ کو ایسے نئے قانونی احکام کو متعارف کروانے کا جائز حق حاصل ہے، جو شریعت میں موجود نہ ہوں، لیکن معاشرے کیلئے فائدہ مند ہوں۔ الداوانی نے غیر شرعی عدالتوں کی تشکیل کو بھی جائز قرار دیا، جس نے جودت پاشا اور دوسرے عثمانی اصلاح پسندوں کو ایسی سیکولر عدالتوں کا نقشہ تیار کرنے میں مدد دی، جو سلطنت نے تنظیمات کے دور میں، نئے فوجداری اور تجارتی قانونی ضابطوں کے تحت فیصلہ کرنے کیلئے کھولی گئیں۔ (۶۴)

اس کے ساتھ ہی ساتھ، یہ تبدیلیاں، اسلامی روایت کے اندر اصلاح کے مترادف تھیں، تا کہ اس کے خلاف، جو کچھ جودت پاشا نے کیا وہ ''اصلاح اور تبدیلی کے نئے انفرادی تصوّرات کی وضاحت کرنا اور اُنہیں اسلامی مفاہیم میں جائز قرار دینا'' تھا، (۶۵) یہ درحقیقت پوری عثمانیہ جدّت طرازی کی روح تھی۔ اسی وجہ سے، سوائے چند غیر اہم رجعت پسندوں کے، جیسا کہ عرب کے وہابی، اور استنبول میں کچھ انفرادی واقعات کے، عثمانی اصلاحات کو کسی اسلامی بڑے ردِّعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ (۶۶)

آج کے سیکولر تُرک اکثر یہ یقین رکھتے ہیں کہ مذہبی حکام نے جدّت طرازی کی ساری کوشش کی مزاحمت کی، لیکن یہ ایک ایسی فرضی حکایت ہے جو جمہوری دور میں، قدیم حکومت کو بدنام کرنے کیلئے وضع کی گئی۔ تاریخی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ مذہبی طبقے نے جدّت طرازی کے پروگرام میں تعاون کیا۔ درحقیقت۔ کچھ مذہبی علما تو خود ہی مصلح تھے۔ ''جبکہ سیکولر پسندانہ اصلاحات کے خلاف احتجاج کا اظہار، بنیادی طور پر مذہبی طبقے کے نچلے درجوں کی طرف سے کیا گیا'' (۶۷) علاوہ ازیں، جدّت طرازی کی زیادہ تر مزاحمت دُنیاوی، ذاتی مفاد کی وجہ سے

MashalBooks.org

ہوئی۔ مثال کے طور پر چھاپہ خانوں کی درآمد میں تاخیر کی وجہ، مذہبی کٹڑ پن نہیں تھا، جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے، بلکہ کاتبوں کی مخالفت تھی، جو اس وقت ایک طاقتور طبقہ تھا، جنہیں اپنے کام کے کھو جانے کا ڈر تھا۔(٦٨)

نئے تصوّرات، نئے مذہبی نظریات

عثمانی جدّت طرازی ١٩٠٨ میں ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ جب ''نوجوان ترکوں'' نے، جو کہ سلطان عبدالحمید کے خلاف افسروں اور دانشوروں کی طرف سے قائم شدہ ایک تحریک تھی، سلطان کو آئین کو بحال کرنے اور پارلیمان کو دوبارہ بُلانے پر مجبور کیا۔ ''نوجوان تُرک'' ایک اتحاد پر مشتمل تھی۔ جن کے ہاں سیاسی رُجحانات کا ایک وسیع دائرہ تھا۔ اگرچہ کچھ آمرانہ حکومت کی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے حقیقی آزادی پسند تھے۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ دوسرے آئینی دور کو، جس کا آغاز اُنہوں نے کیا، پوری سلطنت میں حُریّت کے آغاز کے طور پر بنایا گیا۔

آنے والی دہائی، بلاشبہ، آزادیِ خیال کے مفہوم میں اُن تمام وہائیوں میں سے جو ترکی نے آج تک دیکھی ہیں، سب سے زیادہ آزاد خیال تھی۔ اُن متعدد دانشورانہ انجمنوں میں سے، جو استنبول میں قائم ہوئیں، دو نسائیت پسند کلب تھے۔ اُن کی رطب اللسان ترجمانوں میں سے ایک، فاطمہ نصیب، اپنے عوامی خطبات میں جان سٹورٹ مِل (John Stuart Mill) کے حوالے دیتی تھیں۔ ایک دوسری ممتاز نسائیت پسند، فاطمہ عالیہ، جو کہ احمد جودت پاشا کی بیٹی تھیں، نے کثرتِ ازدواج کی مخالفت کی، اور ایک قدامت پسند مصنف، محمود ایساط آفندی، کے ساتھ ایک جاندار مجادلے میں شریک ہوگئیں۔ لیکن ان لسائیت پسندوں میں سے کوئی بھی مسلم مذہب سے دور نہیں تھا بلکہ اُنہوں نے نسائیت پسند ایجنڈے کی تائید، قرآن اور ''غیر مسخ شدہ اسلام'' کے دنوں میں سے مثالوں کو اُجاگر کر کے، کی ......وہ دور جو اس سے پہلے تھا، جب زن بیزاری کو کچھ قرونِ وسطیٰ کے علمانے مذہبی متون میں شامل کیا۔(٦٩)

درحقیقت، عورتوں کے حقوق پر پیشرفت، تنظیمات کے فرمان سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ عورتوں کیلئے جدید اسکول اُنیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوگئے تھے، اور ایک زیادہ جدید نسوانی طرزِ زندگی ارتقا پا چکا تھا۔ جس نے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک سرکردہ مصری نسائیت

پسند کو ''استنبول کی ترک خواتین کے پردے اور گھر کے باہر والے لباس کو اپنانے'' کی پکار دینے پر مجبور کر دیا۔(٧٠) ١٩١٧ کا عثمانی خاندان کا قانون، عورتوں کی آزادی کو ایک قدم اور آگے لے گیا۔ جس میں طلاق کے عورتوں کے حق، اور کثرتِ ازدواج کے موثر خاتمے کو متعارف کروایا گیا(٧١)

سلطنت عثمانیہ کی آخری دہائی کا ایک قابلِ ذکر مظہر، سیکولر یورپی فکر کا بہاؤ تھا، بشمول الحاد اور مذہب مخالف فلسفوں کے۔ سماجی ڈارون پسندی، کے مبلغ ارنسٹ ہیکل (Ernst-Haeckel)، اور لڈوِگ بگنر (Ludwig Buchner) جو کہ سائنسی مادہ پرستی کا حامی تھا، کی مقبولِ عام کتب کا زیادہ سیکولر ''ینگ ٹرکس'' (نوجوان ترکوں) کی طرف سے ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا، جو مذہب کو ''ترقی کی راہ میں ایک رُکاوٹ'' کے طور پر دیکھنے لگے تھے، جس کی جگہ سائنس کو لانے کی ضرورت ہے۔

زیادہ مذہبی دانشوروں کی طرف سے جواب، ان خیالات کو طاقت سے خاموش کرانا نہیں تھا، بلکہ دلیل کے ذریعے ان کا رد کرنا تھا......جیسا کہ معتزلہ نے، ایک ہزاری قبل، یونانی فلسفے کی طرف سے چیلنج کی موجودگی میں کیا تھا، شہ بن درزادے احمد حلمی (Sehbenderzade Ahmet Hilmi) نے ایک کتاب بعنوان 'کیا خُدا سے انکار ممکن ہے؟ [Is It Possible to Deny God?] لکھی، اور اسماعیل فینی ارتوعزول نے ''مادہ پرست مکتبہ فکر کا رد'' (Refutation of the Materialist-School) تحریر کی۔ ان اسلامی جدّت پسندوں میں ایک اور نام اسماعیل حقی ازمیری لی جس نے ریاست کے کلاسیکی اور جدید دونوں مکاتب میں تعلیم حاصل کی تھی، نے ایک ''نیا مذہبی نظریہ'' پروان چڑھایا، جس نے نئے فلسفوں کو اپنے اندر کھپایا۔(٧٢) اُس نے یہ ذکر کیا اور استدلال کیا ''[اسلامی] دینیات کی قدیم کتب اکثر طالیس، سقراط، افلاطون، ارسطو اور زےنون کا ذکر کرتی تھیں۔''

''اسی طرح، آج بیکن، ڈیکارٹ، سپائی نوزا، لائبنز، لاک، میلے برانچے، ہیوم، کانٹ، ہیگل، آگسٹ کامٹے، ہملٹن، سٹوارٹ مِل، سپنسر اور برگسان پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ...... یونانی فلسفیوں کو قدیم دینیاتی کتب میں آسانی سے تسلیم کر لیا گیا تھا: آج اُن کی جگہ فرانسیسی، برطانوی اور جرمن سائنسدانوں کو لینی چاہیے۔''(٧٣)

اِزمیری نے اسلام میں آزادی کی قدر و قیمت پر زور دیا، یہاں تک کہ موخرالذکر کو

MashalBooks.org

''مساوات اور آزادی کا مذہب'' قرار دیا، (۷۴) یہ رویہ عثمانی دور کے اواخر میں اسلامی جدیدیت پسندوں کے ہاں عام تھا۔ اُن کے مغربی آزادی پسندی کے ساتھ آگاہی کی وجہ سے، آزادی کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہوئے، اُنہوں نے کتاب مقدس کا مطالعہ اس نئے تناظر سے کیا۔ لہٰذا قرآنی آیت ''ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے'' کی تعبیر اب فردی آزادی کے جواز کے طور پر کی گئی۔ (۷۵) اس آیت کو ''آدمی صرف وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کیلئے وہ کوشش کرتا ہے'' نجی کاروبار اور منڈی کی معیشت کی حوصلہ افزائی کے طور پر دیکھا گیا۔ (۷۶) ''مشاورت'' کیلئے قرآن کی نصیحت کو پارلیمانی جمہوریت کی بنیاد کے طور پر لیا گیا، اور ''منکر کو روکو'' کے حکم کی تعبیر سلطان کے اختیارات پر حد بندی کے طور پر کی گئی۔ (۷۷)

ایک مسلمان مفکر جس نے ان تعبیرات کی حمایت کی، ڈاکٹر حاذق تھے اُس آزادی پسندی سے مسحور جو اُس نے اسلام میں دریافت کی۔ اُس نے اپنی ۱۹۱۶ کی کتاب دین وحُریت (Din ve Hurriyet) میں لکھا ''جب آپ ہمارے مذہب کو عقلمندی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے آزادی کے میدان کتنے وسیع ہیں۔'' اس نے مزید لکھا ''اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے آدمی مسرت سے اپنا دماغ کھو دیتا ہے۔ (۷۸) ایک اور جدّت پسند اسلام پسند، احمد نعیم بے، فرانسیسی انقلاب کا ناقد تھا، لیکن وہ بھی اس بات کا قائل تھا، کہ وہ اصول جن کی یہ تعریف کرتا تھا......آزادی، مساوات اور دوستی......اُن لوگوں کیلئے بیّن طور پر سچے تھے جو اسلامی خیالات کے ساتھ پلے بڑھے۔'' (۷۹)

مسلمان آزادی پسند بعض اوقات کتاب مقدس میں وہ کچھ پڑھ رہے ہوتے تھے، جو وہ سننا چاہتے تھے۔ لیکن قرون وسطیٰ کے مسلمان بھی، کتاب مقدس میں اپنے وقت اور ماحول کے معیارات کو پڑھتے تھے۔ مذہبی ادراکات میں اس تبدیلی، جسے سماجی تبدیلی نے مہمیز دی، کا جائزہ عثمانی طبقہ ''دانشوران نے بھی لیا۔ اُن میں سے ایک، ضیا گوکلپ (Ziya Gokalp) نے، مغربی عمرانیات کو اسلامی فقہ کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ایسا علمی شُعبہ تیار کیا، جسے اُس نے ''قانون کی سماجی جڑوں کی سائنس'' کہا گوکلپ کے مطابق، شریعت کا تقاضا، وسیع جدّت طرازی تھا، جس کیلئے ماہرین عمرانیات اور اسلامی علما کو اکٹھے کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ایک اور ممتاز عثمانی صباحتیں بے جو کہ پارٹی آف لبرلز (احرار) کا بانی تھا، کی بیسویں صدی

کے آغاز پر ایک اپنی ''آہا'' تحریک تھی، جب وہ فرانسیسی مصنف ایڈمنڈ ڈی مالنز (Edmond Demolins) کی کتاب A quoi tient a la Superiorite des Anglo Saxons? یا The Anglo-Saxon Superiority: to what it is due. پڑھ رہا تھا اُس نے ترقی کے راز کی وضاحت بطور ''انفرادی کاروبار اور غیر مرکزیت'' کی کے، اور ان خیالات کو عثمانی طبقہ بالا میں پروان چڑھایا۔ ایک مرتبہ، ایک اُس وقت کی نوزائیدہ انتہائی سیکولر تحریک کے جواب میں، جو مذہب کی مذّمت کرتی تھی، کہا: ''ہماری ترقی میں رُکاوٹ مذہب نہیں ہے۔ رُکاوٹ ہمارے معاشرے کا ڈھانچہ ہے۔'' (۸۰)

اسی دوران میں، مشہور شاعر محمد عاکف ارسائے (Mehmet Akif Ersoy) جو کہ ترکی کے قومی ترانے کے مصنف بھی ہیں، مسلمانوں سے یہ تقاضا کرتے ہوئے کہ وہ روایت کی اندھی اطاعت چھوڑ دیں، اور مقدّس کتاب کو سمجھنے کیلئے اپنی عقل کو استعمال کریں: موثر نظمیں لکھ رہے تھے۔ اُس نے ایک مشہور مصرعے میں کہا: ''ہمیں براہِ راست قرآن سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، اور اسلام کو [جدید] دور کے ذہن سے مخاطب ہونے دینا چاہیے۔'' (۸۱)

ایک المناک اختتام......اور تمام امن کا انجام

اُن تمام تصوّرات، قوانین اور اداروں کے باوجود، جو عثمانیوں نے اپنی آخری صدی میں اختیار کیں، سلطنت یورپ کی صنعتی اقوام کے ساتھ چلنے میں ناکام ہوگئی، اور اُس وقت اپنے آپ کو پھندے میں گرفتار محسوس کیا، جب برطانیہ اور فرانس نے، جو اس کے سابقہ دوست تھے، ۱۹۰۷ میں اپنے آپ کو اُبھرتی ہوئی جرمنی قوت کے ہوتے ہوئے روس کے ساتھ، جو کہ اس کا ابدی دشمن تھا، وابستہ کرلیا۔ عثمانی طبقۂ بالا کیلئے، اب واحد ترجیح اپنے آپ کو برلن کے ساتھ وابستہ کرنا تھی......ایک فیصلہ کُن فیصلہ جس نے اُنہیں پہلی عالمی جنگ میں ہارنے والی سمت میں لا کھڑا کیا۔

اگر چہ سلطنت کے کفن میں سب سے مہلک کیل وہ تھی جس نے اس کے تکثیری نظام قوم پرستی، کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک ایک کر کے بلقان کی عیسائی اقوام نے آزادی حاصل کرنے کیلئے بغاوتیں شروع کر دیں۔ ہر بغاوت نئی قوم کیلئے ایک پُر مسرت لمحہ تھا، لیکن اُن قوموں کیلئے جو اقلیت میں تھیں، یہ ایک ڈراونا خواب تھا۔ ''سربیا سربوں کیلئے، بلغاریہ بلغاریوں کیلئے، یونان یونانیوں

MashalBooks.org

کیلئے''اوائل اُنیسویں صدی کا مقبول عام نعرہ تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ اہم تنبیہ: ''ترک اور یہودی باہر!'' (۸۲)

ترکوں اور یہودیوں کا مقدر آپس میں مل گیا...... کیونکہ موخر الذکر، جن کے کوئی علاقائی دعوے نہیں تھے، سلطنت کے اس اختتام تک وفادار رہے۔ اتنے بعد تک جتنا کہ ۱۳-۱۹۱۲ کی بلقانی جنگیں، ترک یہودی محور روبہ عمل تھا، ''یونانیوں کے خوف سے، یہودی امداد کی درخواست کرتے ہیں''، ۱۹۱۳ کے نیویارک ٹائمز کی ایک سُرخی کی عبارت یہ تھی۔ یونانی قوم پرست، ''یہودیوں کو ترکوں کے دوست ہونے کی سزا دے رہے ہیں۔'' (۸۳)

سلطنت کے خلاف ایسی قوم پرست مہمات کے دوران، عثمانی یہودی اور بہت زیادہ تعداد میں تُرک...... ایک ایسی اصطلاح جو اُس وقت تمام عثمانی مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتی تھی...... نے بلقان، کاکیشیا اور کریمیا میں نسلی صفائی کی لہروں کا سامنا کیا۔ کچھ اندازوں کے مطابق، ۱۸۲۱ اور ۱۹۲۲ کے درمیان، ان علاقوں میں پانچ ملین سے زیادہ عثمانی مسلمان تباہ ہوگئے۔ (۸۴) اُن میں سے کچھ لڑائی میں مرگئے، اور دوسرے فاقہ کشی اور بیماریوں سے مرگئے۔ وہ لوگ جو خود ترکی پہنچ پائے (بشمول میرے اپنے داداجان کے جو شمالی کاکیشیا سے آئے) اپنے ساتھ روسیوں اور اُن کے اتحادیوں کے ظلم کی بہت سی کہانیاں اپنے ساتھ لائے۔

قوم پرستی سلطنت کی مسلم اقوام کے ذہنوں میں بھی آہستہ آہستہ گھر کرنے لگی۔ درحقیقت، اُنیسویں صدی کے آغاز تک عثمانی نظم ونسق کو سلطنت کے کسی مسلمان صوبے میں اجنبی حکومت نہیں سمجھا جاتا تھا...... لیکن دو دہائیوں سے بھی کم عرصے میں، آزادی کی خواہش نے پہلے پہل البانویوں کو اور پھر کچھ (بہت سوں کو نہیں) عربوں کو متاثر کیا۔ لہٰذا جنگِ عظیم اوّل کے موقع پر عثمانی فوجوں نے اپنے آپ کو ایک وسیع خطے میں جو میسڈونیا سے یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ مایوس کُن جنگوں میں اُلجھا ہوا پایا۔ ایک صدی کے اندر سلطنت کے سکڑنے اور اُس بے پناہ مصیبت نے جو اس نے ترکوں کو پہنچائی، عثمانی طبقہ بالا کے اندر ایک گہرا خوف پیدا کردیا، اور اُنہیں مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی قوم پرستی کو پروان چڑھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان ترک پارٹی جس نے اس رُجحان کو اپنایا اس سے ۱۹۱۳ میں ایک فوجی انقلاب کے ساتھ عثمانی ریاست پر قبضہ کرلیا، وہ ملک کے باقی ماندہ حصے...... ایشیائے کوچک...... کو بچانے پر آمادہ تھی، کسی بھی ممکنہ ذریعے سے۔ جب اکتوبر

۱۹۱۴ء میں ترک جنگِ عظیم میں داخل ہوئے، تو انہیں، ایک مرتبہ پھر مشرق سے روسی حملے کا سامنا تھا، اور اُنہوں نے دیکھا کہ آرمینیائی قوم پرستوں نے، دشمن کی مدد کرنے کیلئے نیم فوجی یونٹ قائم کرلئے تھے۔ اس حیثیت نے اُس تباہ کُن فیصلے کی بنیاد رکھی، جو (cup) سی یو پی کی حکومت نے اپریل ۱۹۱۵ میں کیا، جب اس نے تمام آرمینیائی باشندوں کو جو مشرقی ترکی میں موجود تھے شام میں دھکیلنے کا فیصلہ کیا۔ لاکھوں لوگ، راستے میں، قتلِ عام، دوسری زیادتیوں، قحط اور بیماری کی وجہ سے تباہ ہوگئے۔ یہ خوفناک نسلی تطہیر یقیناً عثمانیہ تاریخ پر سب سے بڑا دھبہ ہے، اور ناقابلِ معافی ہے، لیکن یہ عثمانی سسٹم کی وجہ سے واقع نہیں ہوا۔ بلکہ یہ عثمانی سسٹم کے سقوط کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا۔

سلطنت کی شکست وریخت کے اور بھی المناک نتائج ہوں گے جن کا انکشاف وقت کرے گا۔ لیکن آرچی بالڈ ویول (Archibald Wavell)، جو کہ ایک برطانوی افسر تھا، وہ اس قدر پہلے جتنا کہ ۱۹۱۸ میں، اُنہیں دیکھنے کی پیش بینی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ فاتح یورپی طاقتوں کو، ''جنگ کو ختم کرنے کی جنگ'' کے بعد سلطنت عثمانیہ کو خوشی خوشی آپس میں تقسیم کرتے دیکھ کر اُس نے رجائیت پسندی کو جھٹک دیا۔ اس کی بجائے اُس نے کہا، جو کچھ یورپیوں نے حاصل کیا وہ ''امن کو ختم کرنے کیلئے امن'' تھا۔ (۸۵)

عثمانیوں سے آگے

عثمانی جدّت طرازی، اُنیسویں اور ابتدائی بیسویں صدیوں میں بہت اہم مسلم پیش قدمی تھی، لیکن یہ واحد پیشِ قدمی نہیں تھی۔ ''عثمانیہ سے متعلقہ تمام علاقوں میں، ایک عمومی نمونہ تھا، جس کی جگہ مقامی تنوعات نے لے لی تھی'' جو کہ لازمی طور پر، ''اسلامی تصوّرات اور مغربی تکنیکوں کو باہم ملانے کی ایک کوشش'' تھی۔ (۸۶) مصر، جو کہ سرکاری طور پر ایک عثمانی علاقہ تھا لیکن اُنیسویں صدی کے آغاز سے ایک خودمختار ریاست تھی، کے پاس اس کے متبادل، محمد علی پاشا (۴۹-۱۸۰۵) کے زیرِ نگرانی ایک وسیع جدّت طرازی کا پروگرام تھا۔ العطار اور الطحطاوی جیسے مصری مذہبی علمانے، اسلام کی ابتدائی دلیل پرستی کی اور تجدید اور فرسودہ روایات کی پابندیوں سے آزادی کی علمبرداری کی۔

تیونس میں، جو کہ سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھا لیکن بہت حد تک ایک خودمختار ریاست تھی،

MashalBooks.org

۱۸۴۶ء میں تنظیمات کے نمونے پر مبنی ایک اصلاحی پروگرام اور اس کے ساتھ غلامی کے خاتمے جیسی اہم اصلاحات، روبہ عمل لائی گئیں۔ جلد ہی تیونسیوں نے اپنے آپ کو اس قدر ترقی یافتہ خیال کیا کہ ۱۳۱ اکتوبر ۱۸۶۳ کو تیونس کے میئر، حسین پاشا نے، امریکی کونسل جنرل ایماس پیری (Amos Perry) کو ایک خط لکھا، جس میں امریکیوں کو ''انسانی رحم اور ہمدردی'' کے نام پر اپنے رویے پر نظرثانی کرنے کی ترغیب دی۔ (۸۷) یہ پندرہ ماہ پہلے تھا، جب تیرھویں ترمیم یوایس کانگریس کی طرف سے منظور کی گئی۔ جس میں غلامی کو ختم کر دیا گیا۔

ایک دہائی بعد، ایک اور تیونسی سیاستدان خیرالدین پاشا نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا ''ممالک کے حالات کے بارے میں علم کا سب سے یقینی راستہ'' اُس نے لکھا ''خُدا تعالیٰ کی مدد سے، میں نے، معاشی اور انتظامی پالیسیوں سے متعلقہ یورپی ایجادات کے بارے میں تمام ممکنہ معلومات اکٹھی کی ہیں'' (۸۸) پھر، قرآن، احادیث، اور کلاسیکی مسلم مفکرین، ساتھ ہی ساتھ مانٹیسکیو (Montesquieu) اور جان سٹورٹ مِل (John Stuart Mill) سے اقتباسات کے ساتھ، اُس نے ''انصاف اور آزادی پر مبنی سیاسی اداروں'' کے حصول کیلئے استدلال کیا۔ اُس نے یہ نتیجہ نکالا:

> ''فرد کی آزادی، پریس کی آزادی، حکومت میں شرکت کرنے کی آزادی: اس کے بغیر مادی ترقی ممکن نہیں ہے۔ آزادی انسانوں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اُنہیں یہ یقین دہانی کروا کر کہ وہ اپنے کام کا صلہ پائیں گے: معاشی ترقی، اشیا اور لوگوں کی آزادانہ نقل وحرکت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور وہ آزادانہ معاشی تنظیم بھی جس کا جدید یورپ اپنی مادی کامیابیوں کیلئے مرہونِ منت ہے (ممکن نہیں ہے) ......آزادی کے بغیر علم کا کوئی پھیلاؤ بھی نہیں ہو سکتا۔ (۸۹)

پیشِ لفظ میں، خیرالدین پاشا نے ''عام مسلمانوں میں سے اُن لوگوں کو، جو قابلِ تعریف چیزوں سے اپنی آنکھیں بند رکھنے کیلئے اپنی ہَٹ پر قائم ہیں...... محض اس وجہ سے کہ اُن کے ذہنوں میں یہ خیال نقش ہو چکا ہے، کہ اُن لوگوں کے جو مسلمان نہیں ہیں، تمام اعمال اور اداروں سے گریز کرنا چاہئے، اُن کی ہٹ کے خلاف تنبیہہ کی'' (۹۰) (یہ تنقید آج بھی بالکل برمحل ہے)۔ خیرالدین پاشا کے مطابق، جدید مغرب کے آزادی کے اصول، اسلام کے سنہری دور کے دوران

بھی موجود تھے، لیکن اس دور کے بعد انحطاط آ گیا، اور اب یہ وقت تجدید کا ہے۔

۱۸۷۳ء میں خیرالدین، تیونس کا وزیرِ اعظم بن گیا۔ چار سال بعد، سلطان عبدالحمید دوم نے، جس نے اُس کی کتاب پڑھی تھی اور ظاہراً طور پر اُس کی تعریف بھی کی تھی، اُسے استنبول آنے کی دعوت دی اور اُسے بڑا وزیر بنا دیا۔ بدقسمتی سے، تیونس کا یہ سرکاری ملازم استنبول کی پیچیدہ سیاست میں اپنے آپ کو جذب نہ کر سکا، لہٰذا وہاں اُس کا دور بہت مختصر تھا لیکن اُس کے خیالات باقی رہے، خاص طور پر اُس کے آبائی وطن میں، جہاں ''قرآن کی آزادی پسندی کی روح''، جیسی کتابیں بیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہوئیں۔ (۹۱)

اُسی دور میں، جمال الدین افغانی (1838-97)، جو کہ ایران کا ایک عالم اور فعالیت پسند تھا، مسلمانوں کو جہالت سے ''جگانے'' اور مغربی سائنس اور عقلیت پسندی کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے، جسے وہ سمجھتا تھا کہ قرآن میں پہلے ہی سے فطرتاً موجود ہے، کے حوصلہ مندانہ مشن پر روانہ ہوا۔ مصری عالم محمد عبدہٗ، جو کہ قاہرہ میں مصری یونیورسٹی الازہر میں پروفیسر تھا، نے افغانی کے افکار کو قبول کیا، اور ایک اصلاح پسند اسلامی نقطۂ نظر پروان چڑھایا، جو واضح طور پر اسلام کی اوّلین صدیوں کے معتزلہ سے متاثر تھا۔ عبدہٗ نے کچھ مسلمہ احادیث پر بھی تنقید کی، جن میں وہ احادیث بھی شامل تھیں جو زن بیزاری کو پروان چڑھاتی ہیں، اور اُس نے مسلمان عورتوں کی آزادی کیلئے استدلال کیا۔ (۹۲)

یہ نو معتزلہ رُجحان، عرب دانشوروں میں بیسویں صدی کے اوائل میں اُبھرا، جو اہم مصری مصنف اور دانشور احمد امین کی، ۱۹۳۶ء میں اس رائے پر منتج ہوا کہ ''معتزلیت کی موت وہ سب سے بڑی بدقسمتی تھی جس نے مسلمانوں پر ضرب لگائی: اُنہوں نے خود اپنے خلاف جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔'' (۹۳)

یہ اصلاح پسند مسلمان، دُنیائے اسلام کے بارے میں یورپ کے سامراجی عزائم کے خلاف تھے، لیکن وہ مغرب مخالف ہرگز نہیں تھے مشہور بات ہے کہ عبدہٗ جس نے یورپ کا سفر کیا، نے کہا کہ اُس نے پیرس میں ''بغیر مسلمانوں کے اسلام'' دیکھا، اور مصر واپسی پر اُس نے ''اسلام کے بغیر مسلمان دیکھے۔'' اُس نے محسوس کیا کہ وہ تمام اچھی چیزیں جو مسلمانوں کے ہاں ہونی چاہئیں تھیں، مغرب میں تھیں لیکن دُنیائے اسلام میں نہیں تھیں۔

وہ اور اُس کے پیروکار محض اس بات پر نازاں تھے کہ وہ یورپ کی زہر آلود یہود دشمنی

MashalBooks.org

مخالفت میں شریک نہیں تھے۔ فرانس میں بدنامِ زمانہ ڈرے فَس معاملے کے دوران، مسلم پریس کے ایک حصے نے، ترکی اور عربی دونوں میں غلط طور پر متہم یہودی کپتان کے ساتھ ہمدردی کی، اور عبدہٗ کے ایک پیروکار، راشد رضا نے، فرانس میں یہودیوں کی ستم رانی پر تنقید کی۔ (۹۴)

البرٹ حورانی، غالباً عرب تاریخ کا سب سے ممتاز عالم، اس اصلاح پسندانہ رُجحان کو، عرب فکر میں ایک ''آزادی پسند کے دور'' کے طور پر بیان کرتا ہے، جو اُنیسویں اور اوائل بیسویں صدی کو محیط رہا۔ (۹۵) اور صرف عرب دُنیا میں نہیں۔ جدیدیت کے ساتھ باہمی تعامل نے، غیر عرب ممالک سے بھی مسلم دانشوروں کو یہ نتیجہ نکالنے پر آمادہ کیا کہ روایت میں ایک مسئلہ ہے اور یہ کہ اصلاح ضروری ہے۔ بہت حیرت انگیز بات نہیں کہ ان دانشوروں نے پیچھے اسلام کی اوّلین صدیوں کی طرف دیکھا، اور محسوس کیا کہ معتزلہ دلیل پرستوں کو روایت پرستوں کی طرف سے گہنا دیا گیا تھا۔ لہٰذا، روایت پسند مکتبِ فکر اور حدیث کے لٹریچر پر تنقید (اور کبھی کبھار اس کی سُستی کی وجہ سے صوفی ازم پر بھی) مصلحین کا امتیازی نشان بن گیا۔

ہندوستان میں، سید احمد خان ......جن کے حد سے بڑھے ہوئے برطانویوں کے حامی موقف نے ان کے جواز کو قدرے نقصان پہنچایا...... نے یہ استدلال کیا کہ حدیث کے زیادہ تر ذرائع ''پچھلی صدیوں کے تحریف شدہ الفاظ ہیں۔'' ہندوستان میں ایک ''مسلم کیمبرج'' بنانے کی اُمید پر، اُنہوں نے ایک جدید یونیورسٹی قائم کی اور ایسے اشاعتی مواد کا آغاز کیا جس نے لاکھوں لوگوں میں جذبہ پیدا کیا۔ یہ جدّت پسندی کی روایت برِصغیر میں بعد میں بھی جاری رہی اور علامہ اقبال کی طرف سے، جو اوائل بیسویں صدی کے ذہین فلسفی شاعر تھے، جنہوں نے انفرادیت اور تجربیت کی ایک اسلامی شکل کا اظہار کیا، بہت زیادہ بہتر بنائی گئی۔

سلطنت روسیہ کے مسلمان ترکوں میں بھی، اُنیسویں صدی کے اواخر میں جدیدیت نام کی ایک ذہنی تحریک اُبھری۔ یہ اصطلاح عربی لفظ ''جدید'' سے نکلی، جس کا مطلب ''نیا'' ہوتا ہے۔ جدیدیوں میں ایک ممتاز عالم۔ مُوسیٰ جاراللہ بی گیف (Musa Jarullah Bigiev) جو کہ ایک کا ذان ترک تھے، جنہوں نے قرآن کا ترجمہ تاتاری زبان میں کیا، نے صنفی مساوات کو پروان چڑھایا، اور یہ استدلال کیا کہ اگلی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا رحم مسلمانوں سے آگے بڑھ کر تمام مذاہب کے لوگوں کا احاطہ کرے گا...... ایک ایسا تصور، جسے زیادہ تر انتہا پسند روایت پرستوں نے مذموم قرار دیا۔ (۹۶)

ان تمام اصلاح پسند مسلمان مفکرین کو عمومی طور پر اسلامی ''جدت پسند'' کہا جاتا ہے۔ اُن کے اپنے اختلافات تھے، لیکن اُن کا مشترکہ خیال یہ تھا کہ مغربی آزادی پسندی کی اقدار، اسلام کے اصلی پیغام سے موافق تھیں بلکہ اس کی فطرت میں موجود تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان معاشروں کو اجتہاد کے دروازے دوبارہ کھولنے کی، اور آزادی، انصاف اور خوشحالی حاصل کرنے کیلئے اپنے روایت پسندانہ طور طریقوں میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات خاصی قابلِ توجہ ہے، کہ مسلم دُنیا میں، بیسویں صدی کے اوائل میں یہی غالب ذہنی رُجحان تھا۔ مورخ کیرن آمسٹرانگ بیان کرتی ہے کہ ''اسلامی دُنیا میں تقریباً ہر سرکردہ دانشور آزادی پسند تھا'' (۹۷) اور بہت کم قابلِ ذکر اسلامی بنیاد پرست تھے۔

تو پھر اس آزادی پسند رُجحان کے ساتھ کیا واقع ہوا؟ اور کس چیز نے ہمیں وہ ساری عسکریت پسندی اور آمریت دی، جو اس وقت مسلم دُنیا کے بہت سے گوشوں میں موجود ہے؟

اس اہم سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ اسلامی جدیدیت ایک ایسا تصور تھا، جس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ اس محرک طبقہ بالا کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا، اور زیادہ تر معاشرے جن کو اُنہوں نے اپیل کی، ابھی تک قبل جدید تھے۔ وہ متوسط طبقہ، جس میں آزادانہ خیالات پنپنے کا رُجحان رکھتے ہیں، ابھی تک خاصا کمزور تھا...... اور بعض جگہوں پر تو عنقا تھا۔

لیکن یہ ممکن توجیہہ نہیں ہے۔ جدّت پسند طبقہ بالا اصلاح کیلئے آگے بڑھنا جاری رکھ سکتا تھا، اور مسلمان معاشرے آزادی پسندی کی طرف منتقل ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کی بجائے جو کچھ واقع ہوا یہ تھا کہ جدّت پسند طبقہ بالا آہستہ آہستہ غائب ہو گیا...... جس کی جگہ ایک زیادہ رجعت پسند مغرب مخالف اور غیر آزادی پسند طبقے نے لے لی۔ یہاں تک کہ چند ایک آزادی پسند، جیسا کہ ڈرے فَس کے حامی راشد رضا، بھی آہستہ آہستہ زیادہ کرخت گروپ میں منتقل ہو گئے۔

اجتہاد سے جہاد تک

اس واضح تبدیلی کی وجہ اُس وقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب ہم اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ چند ہی دہائیوں میں، تقریباً پوری اسلامی دُنیا پر غیر مسلم اقوام کی طرف سے حملے کئے گئے۔ یورش کی گئی اور اُن پر قبضہ کر لیا گیا۔

MashalBooks.org

سلطنتِ عثمانیہ، آخری بڑی مسلم طاقت، کو جنگِ عظیم اوّل میں تباہ کر دیا گیا، اور تقریباً تمام مسلم ریاستوں کو جو اس کی راکھ سے اُبھریں، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی طرف سے غلام بنالیا گیا۔ ان یورپی ممالک کو، جن کی آزادی پسندی کی اقدار نے اسلامی جدّت پسندوں کو متاثر کیا اور اُن میں جذبہ پیدا کیا، اب ایسی قوموں کے طور پر دیکھا گیا، جو مسلم اقوام کی عزت کو پامال کر رہی تھیں، جن کی سرحدیں بھی ان نئے آقاؤں کی طرف سے اپنی مرضی کے مطابق بنائی گئی تھیں۔

روس اور بعد میں سوویت یونین نے بھی، بسماقی بغاوت (۱۹۱۶ء۔۲۳)، جو کہ روس اور پھر کمیونسٹ راج کے خلاف ایک ترک اسلامی شورش تھی، کو کچلنے کے بعد، جدیدیت پسند تحریک سمیت، پوری اسلامی آبادی کو کچل کر اپنا کردار ادا کیا۔

غیر ملکی حملوں نے، دُنیائے اسلام کے پورے ذہنی نقشے کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اب مغرب ایسا نمونہ نہیں رہا تھا جس کی تقلید کی جائے، بلکہ ایک ایسا مداخلت کار تھا جس کو ختم کروانا ضروری تھا۔ اس سوال کہ ''ہم مغرب کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں؟'' کی جگہ جلد ہی یہ سوال آ گیا ''ہم کس طرح مغرب کی مزاحمت کر سکتے ہیں؟'' اور اجتہاد کیلئے دباؤ اب جہادی تحریک کے آگے ماند پڑ گیا۔

شرق اوسط کی تاریخ کی امریکی پروفیسر، نکی آر کیڈی (Nikki R.Keddie)، اپنے جامع مضمون دا ریوالٹ آف اسلام (The Rivolt of Islam) میں واضح طور پر، اس عسکریت پسندی کے اُبھار کے اسباب کا نقشہ کھینچتی ہیں۔ وہ ذکر کرتی ہیں کہ، وہابیت کے عجیب و غریب استثناء کے ساتھ، جدید دور میں عسکریت پسند جہادی تحریکیں زیادہ تر مغربی سامراجیت کے جواب میں شروع ہوئیں اور پھلی پھولیں۔ ابتدائی تحریکیں، اٹھارویں صدی میں سماٹرا اور مغربی افریقہ میں ''مغرب سے متاثرہ تباہ کُن معاشی تبدیلی'' کا کیشیا، اور لبیا میں، جہادی تحریکوں کی ایک وسیع تر لہر'' فرانسیسی برطانوی، روسی اور اطالوی سامراجی فتح کے براہِ راست جواب'' کے طور پر اُبھریں۔ (۹۸)

یہاں تک کہ اسلامی جدّت پسندی کے مراکز بھی مغربی خطرات سے منفی طور پر متاثر ہوئے۔ ''مغرب'' زدہ جدّت پسندی کے خلاف گاہے گاہے ردِعمل مغربی جارحیت کے جواب میں پیدا ہونے کا رُجحان رکھتے تھے، جیسا کہ...... سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں اور برطانیہ اور فرانس کی طرف سے مصر اور تیونس کے قبضے میں۔'' (۹۹)

۱۹۲۲ میں لکھی جانے والی کتاب دا نیو ورلڈ آف اسلام (The New World Of

Islam) (اسلام کی نئی دُنیا) میں امریکی سیاسی سائنسدان لوتھراپ سٹوڈرڈ (Stoddard Lothrop) اس بھنور کو محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے لکھا ''اسلام کی پوری دُنیا اس وقت ایک گہرے ہیجان میں ہے مغربی راج پر بے اطمینانی اور آزادی کی خواہش کے ساتھ۔'' اُس نے مزید کہا ''اس سب کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ کیا ہوگا، کوئی بھی اعتماد سے پیش گوئی نہیں کر سکتا'' (۱۰۰)

اس کا نتیجہ، جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں، مغرب اور آزادی پسندی جیسے مغربی تصوّرات کے خلاف گہری بداعتمادی بلکہ دشمنی تھی۔ موخرالذکر، انفرادی روح کی بجائے اشتراکی روح کے اُبھار سے مزید گہنا گیا، جیسا کہ پاکستانی عالم نسیم احمد جاوید وضاحت کرتے ہیں:

''اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم دانشور طبقہ میں آزادی پسندانہ جمہوری اقدار کی مقبولیت کے مختصر دور کے بعد، مسلم دُنیا میں ہر جگہ آزادی پسندی کمزور پڑنے لگی، کیونکہ ارتکاز توجہ فرد کی آزادی سے معاشرے کی آزادی کی طرف منتقل ہو گیا، جس کا حصول سلبیت کا تقاضا کرتا تھا۔'' (۱۰۱)

اس چیز نے تقریباً پوری عرب دُنیا کو قوم پرستی اور اشتراکیت کے امتزاج کی طرف دھکیل دیا...... جو دلچسپ بات یہ ہے کہ، مغربی تصورات ہی تھے، لیکن بہر حال ایسے تصوّرات تھے جن کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ مغرب کی مزاحمت کے طریقے مہیا کرتے ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد مغرب مخالف رُجحان، اسرائیل کی ریاست کے قیام اور زیادہ اہم بات، اس کے بعد کی توسیع اور عرب علاقوں پر قبضے کے خلاف ردِعمل سے اور مزید مستحکم ہو گیا اس ردِعمل نے یہود دشمنی کی شدید لہر کو پروان چڑھایا، ''یورپ سے یہودی مخالف خیالات کی برآمد کے ساتھ، لیکن اسلام کے ساتھ بطور مذہب نہیں'' (۱۰۲) وہ نظریہ جو مشرقِ وسطیٰ میں سب سے اخیر پر نمودار ہوا، شدت پسندی، ان تمام غلط اقدامات کے مجموعی ورثوں پر مبنی تھا۔ (۱۰۳)

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پس عثمانی دور میں صرف تین سابقہ عثمانی ریاستیں سامراجیت سے بچ سکیں، پہلی، مفلس اور سیاسی طور پر غیر اہم ریاست شمالی یمن تھی، جس پر سامراجی حکومت قائم کرنے کی کسی نے زحمت ہی نہ کی۔ دوسری سعودی عرب تھی، جو کہ وہابیت کا مرکز تھی، جو اسلام کی سب سے کٹڑ تعبیر ہے۔

تیسری ریاست ترکی تھی، جو کہ سابقہ سلطنت عثمانیہ کا اصلی مرکز تھا، لیکن یہ بہت جلد اُس ترکی سے بہت مختلف ترکی بننے والا تھا، جو یہ کبھی ہوا کرتا تھا۔

باب 7

رومن، ہیروڈین، اورزیلٹس

بنیاد پرستی محاصرے میں آیا ہوا مذہب ہے...... بنجامن آر۔ باربر، امریکی سیاسی نظریہ ساز

۷ دسمبر ۱۹۲۵، کو ایک موسم سرما کے سرد دن، پولیس کے سپاہیوں کے ایک جتھے نے، فاتح میں ایک معمولی سے مکان کے دروازے پر دستک دی، جو کہ استنبول کے ایک قدیم ترین ضلع میں واقع تھا۔ ایک بوڑھی خاتون نے دروازہ کھولا، جو وردی میں ملبوس لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ان میں سے ایک نے کہا ہم عاطف خوجہ کو تلاش کررہے ہیں۔ اُسے صرف ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہے۔''

عاطف خوجہ، ایک پچاس سالہ اسلامی عالم، جس کی سفید داڑھی اور سفید پگڑی تھی، بہت پاکیزہ زندگی گزارتا تھا، وہ بنیادی طور پر، وسطی اناطولیہ کے ایک چھوٹے قصبے اسکیلپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے وعظوں اور کتب نے اُسے نیک لوگوں میں ایک رہنما بنادیا تھا، اور وہ فاتح میں ایک مدرسے میں اسلامی علوم کا ایک استاد تھا۔

عاطف خوجہ اور اُس کے خاندان نے سوچا کہ پولیس کسی معمولی معاملے کے لئے آئی ہوگی۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اُستاد کو کئی ہفتوں تک پولیس کی حفاظت میں رکھا گیا، اُسے اپنے خاندان سے ملنے کی ممانعت تھی۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو صدمہ ہوا، جنہیں یہ یقین نہیں تھا کہ کیا ہوگا

۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کرنے والا ایک فرقہ (مترجم)

۲) یہودیوں کا ایک فرقہ جو دُنیا پر یہودی غلبے کا آرزومند ہے اور جنہوں نے ۷۰ تک رومنوں کے ساتھ لڑائی کی۔ (مترجم)

یا کیا کیا جائے۔ پھر عاطف توجہ کو عدالت لے جایا گیا، جہاں اُسے اور اُس کے خاندان کو معلوم ہوا کہ اُس کا ''جُرم'' دو سال پہلے ایک کتابچہ شائع کرنا تھا...... ایک کتابچہ جس کا عجیب سا عنوان تھا:

''چھجے دار ہیٹ اور فرنگیوں کی تقلید''

''فرنگی'' وہ نام تھا، جو مسلمان صلیبی جنگوں کے دور سے عمومی طور پر یورپیوں کی طرف منسوب کرنے کیلئے استعمال کرتے تھے: عاطف خوجہ کے نزدیک چھجے وار ہیٹ فرنگیوں کا نشان ......لہٰذا غیر اسلامی ......طرزِ زندگی تھا۔ اس کی طرح کے قدامت پسند مسلمان، اپنے کچھ ہم وطنوں کو اس طرزِ زندگی کو اپناتے اور روایتی ترکی ٹوپی یا پگڑی کی بجائے غیر ملکی سرپوش پہنتے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں چھجہ آدمی کو اپنا سر زمین پر ٹکانے سے روکتا ہے، جیسا کہ مسلمان نماز میں ٹکاتے ہیں، لہٰذا یہ پیغام دیتا ہوا محسوس ہوتا تھا: ''میں خُدا کے سامنے سر نہیں جھکاتا'' اپنے کتابچے میں، عاطف خوجہ نے ایسے تمام اعتراضات کا اظہار کیا تھا اور اپنے مسلمان ساتھیوں کو یورپیوں کی ''تقلید'' سے روک دینے کی پکار دی تھی۔ اُس نے استدلال کیا کہ مسلمانوں کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل کرنا چاہئے، لیکن اپنے تشخص کو محفوظ کرنا چاہیے۔

لیکن، جس چیز کی مخالفت عاطف خوجہ نے اپنے کتابچے میں کی، وہ اچانک نومبر ۱۹۲۵ میں، لازمی ضابطۂ لباس کا ایک حصہ بن گئی، جب ترکی کے نئے حکمران، مصطفیٰ کمال نے چھجے دار ہیٹ کو نئے قومی سرپوش کے طور پر متعارف کروایا اور تمام روایتی اسلامی سرپوشوں پر پابندی لگادی۔ عاطف خوجہ کا کتابچہ واضح طور پر، اس ثقافتی انقلاب کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا ''جرم'' نظریاتی تھا۔

تاہم، اہم تفصیل یہ ہے: عاطف خوجہ نے کتابچہ، ہیٹ ریفارم سے ڈیڑھ سال پہلے لکھا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن بک چکا تھا، اور اس کے دوبارہ، چھاپنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ لہٰذا جہاں اُس کے نظریات کی وجہ سے اُس پر مقدمہ چلانا ناجائز تھا، وہیں اُس پر اُن نظریات کی وجہ سے مقدمہ چلانا جو اس نے انقلاب سے پہلے ظاہر کئے تھے، احمقانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی عدالت نے اُس بے گناہ پایا اور اس کی رہائی کی منظوری دے دی۔

لیکن نئی حکومت کو، جو چھجہ ہیٹ کے تمام مخالفین کچلنے کیلئے بے تاب تھی، ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت تھی تاکہ تمام منحرفین کو سبق سکھایا جاسکے۔ لہٰذا عاطف خوجہ کی دوبارہ گرفتاری اور

MashalBooks.org

آزادی ٹریبونل میں دوبارہ مقدمہ چلانے کیلئے، نئے دارالخلافہ، انقرہ سے، ایک حکم آ گیا ...... ٹریبونل ایک من مرضی کی عدالت تھی، جو انقلابِ فرانس کے ٹریبونل ریوولیوشنیر (Tribunal Revolutionnaire) کی طرز پر سیاسی مخالفین کو ختم کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ ایک مختصر مقدمے کے بعد، انڈی پنڈنس ٹریبونل نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا، جو تقریباً ہر شخص کیلئے ایک صدمہ بن کر آیا۔ عاطف خوجہ اور علی رضا نامی ایک مذہبی عالم، جو کہ اس کا ایک ''معاون'' تھا، کو سزائے موت دے دی گئی تھی۔ دونوں کو ۴ فروری ۱۹۲۶ کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا، دوسرے نام نہاد معاونین کو قید کی مدتوں کی سزائیں دی گئی تھیں۔

ہیٹ ریفارم کے شکار صرف یہی لوگ نہیں تھے۔ مصطفیٰ کمال کے اگست ۱۹۲۵ کے اعلان، کہ تمام تُرکوں کو چھجے دار ہیٹ پہننے چاہئیں، کے فوراً بعد، اناطولیہ کے بہت سے حصوں میں بے اطمینانی پھیل گئی۔ ۱۹۲۵ کے اواخر اور ۱۹۲۶ کے اوائل میں احتجاجوں کو ظالمانہ طریقوں سے دبایا گیا۔ ماراش میں، لوگوں نے گلیوں میں مارچ کیا یہ نعرے لگاتے ہوئے ''ہمیں ہیٹوں کی ضرورت نہیں ہے'' اور بیس احتجاج کرنے والوں کو پھانسی دے دی گئی، جبکہ دوسروں کو تین سے دس سال تک کی قید کی سزائیں سُنا دی گئیں۔ (۲)

ارض روم کے شہر میں، ایک مقامی شیخ اور اُس کے حامیوں نے، گورنر کو، روایتی سرپوش پہننا جاری رکھنے کی اجازت دینے کیلئے درخواست دی...... جسے نہ صرف ثقافتی طور پر ترجیح دی جاتی تھی، بلکہ مشرقی اناطولیہ کی سخت سردی کیلئے بہتر طور پر موزوں تھا...... گورنر کی طرف سے درخواست کی نامنظوری کے بعد اور اس کے اس حکم کے بعد کہ ترجمان کو گرفتار کر لیا جائے، احتجاج شروع ہو گئے سپاہیوں نے ہجوم پر فائر کھول دیا اور تئیس کے قریب لوگوں کو مار دیا۔ (۳)

رائز میں، جو کہ بحیرۂ اسود کے ساحل پر ایک قصبہ تھا، اسی قسم کا ایک احتجاج پھوٹ پڑا، جو کہ جلد ہی ایک بھرپور شورش کی شکل اختیار کر گیا، اس کے جواب میں، حکومت نے باغی گاؤں پر بمباری کرنے کیلئے ایک جنگی جہاز بھیجا۔ ایک برطانوی کونسلر کی دستاویز یہ رپورٹ دیتی ہے کہ حکومتی دستوں کو، بغاوت کو دبانے کے دوران ایک سو یا اس کے لگ بھگ جانوں کا نقصان اُٹھانا پڑا (۴) شہریوں کی اموات، جو غالباً اس سے بہت زیادہ تھیں، کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

دو جدّت طرازیوں کی کہانی

ٹوپی کی اصلاح، کمالی انقلاب کے بہت سے اجزا میں سے صرف ایک جزو تھا۔ کمالی انقلاب کا نام مصطفیٰ کمال کے نام پر تھا، جو کہ وہ جنگی ہیرو تھا جس نے جنگِ عظیم اوّل میں سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد تُرکی کو غیر ملکی حملے سے بچایا۔ جب کمال نے ۱۹۲۳ میں جمہوریہ ترکی کا اعلان کیا، تو اس کا نصب العین اس کے عثمانی ماضی سے مکمل نجات دلانا، اور ایک مکمل نئی قوم بنانا تھا، جو یورپ کی ''ترقی یافتہ'' اقوام کا نمونہ ہو۔ اُس نے پہلا جرأت مندانہ قدم مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ کر کے اُٹھایا، جو اگر دوسروں کی نہیں تو کم از کم تمام عثمانی مسلمانوں کی وحدت کی علامت تھی ...... اگلے چند سالوں میں، اُس نے تمام اسلامی مکاتب کو خلافِ قانون قرار دیا، تمام صوفی سلسلوں پر پابندی لگا دی۔ اور کسی بھی ایسی تنظیم کو بند کر دیا جس کا کوئی اسلامی تشخص تھا۔ ثقافتی تبدیلی کو نمایاں کرنے کیلئے، اُس نے اسلامی کیلنڈر کی جگہ گریگورین، کیلنڈر کو متعارف کروایا، اور عربی حروف تہجی کی جگہ لاطینی حروف تہجی متعارف کروائے۔ عربی کی تدریس پر پابندی لگا دی گئی، جیسا کہ ۱۹۳۰ کی دہائی میں کچھ عرصے کیلئے ترکی موسیقی بجانے پر لگا دی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کو ''جدید'' (یعنی مغربی) دھنوں سے لطف اندوز ہونے پر لگایا جائے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ترکی مورخ کے مطابق یہ ایک ایسا ثقافتی انقلاب تھا جس کی حدود اور جذبہ کمیونسٹ چین کے ماوزے تنگ کے متوازی تھا۔ (۵)

افسوس، یہ اُس طرح کی جدّت طرازی نہیں ہے جو ہم نے سلطنتِ عثمانیہ میں دیکھی۔ چیزیں کس طرح اتنے ڈرامائی طریقے سے بدلتی ہیں؟

یہ کہانی پیچھے کی طرف اُنیسویں صدی تک جاتی ہے، اُس وقت جب یورپ میں سیاسی نظریات خاصے متنوع تھے، اور ایک آزادی پسندانہ رُجحان کے ساتھ ساتھ ایک خاصا مضبوط غیر آزادی پسندانہ رُجحان بھی چل رہا تھا، اور دونوں رُجحانات اُن مسلمانوں کو متاثر کر رہے تھے جو نئے خیالات کیلئے مغرب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مورخ برنارڈ لیوس (Barnard Lewis) کے الفاظ میں:

''اُنیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں اور سرگرمیوں میں [مسلم دُنیا میں]،

MashalBooks.org

> دو مختلف رُجحانات دیکھے جاسکتے ہیں، جن کے درمیان ایک مسلسل جنگ تھی۔ ایک رُجحان کا ماخذ وسطی یورپ کی خرد افروزی تھی، اور یہ ایسے خیالات لے کر آئی جو، آمریت پسند اصلاح کاروں کے ہاں مانوس اور خوش آئند تھے۔ وہ بھی اپنے وسطی یورپی مثالی نمونوں کی طرح جانتے تھے کہ لوگوں کیلئے کیا بہترین ہے اور وہ نام نہاد مقبولِ عام حکومت سے، اس تصور کا اطلاق کرنے سے توجہ ہٹانے کیلئے تیار نہیں تھے... دوسرے نقطۂ نظر نے اپنا جذبہ وسطی کی بجائے مغربی یورپ سے حاصل کیا، اور یہ سیاسی اور ایک کم تر حد تک معاشی آزادی پسندی کے اصولوں سے متاثر تھا۔ اس رُجحان کے پیروؤں کیلئے، پہلے ترکی میں اور بعد میں دوسرے ممالک میں، لوگوں کے حقوق تھے جنہیں محفوظ کیا جانا تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی عمومی ترقی کی جانی تھی، ایک نمائندہ اور آئینی حکومت کے ذریعے سے۔ آزادی کو مغربی طاقت، دولت اور عظمت کی حقیقی بنیاد کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ (۶)

سلطنتِ عثمانیہ میں، ''نوجوان عثمانی'' آزادی پسندی کی بہترین مثال تھے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں دیکھا، اُنہوں نے ایک ایسا نظریہ وضع کیا جو بہ یک وقت آزادی پسندانہ اور اسلامی تھا، لیکن ''نوجوان ترکوں'' کے ہاں، جو ''نوجوان عثمانیوں'' سے کوئی تین دہائیاں بعد اُبھرے، دوسرا رُجحان جس کی طرف لیوس اشارہ کرتے ہے، اُبھرنا شروع ہو گیا۔

یہ چیز خاص طور پر ''نوجوان ترکوں'' کی تحریک کے ایک دھارے جسے گارپ سیلر (یعنی مغرب نواز) کہا جاتا تھا میں واضح تھا۔ تقریباً تمام عثمانی دانشور ایک یا دوسرے طریقے سے مغرب سے متاثر تھے۔ لیکن گارپ سیلر اس لحاظ سے منفرد تھے، کہ اُن کے تحریک کے ذرائع فرانس اور جرمنی کے مادہ پرست اور مذہب مخالف مفکرین تھے...... جیسا کہ بیرن ڈی ہولباخ (Baron d'Holbach)، اٹھارویں صدی کا الحاد کا پُرجوش مبلغ، اور لڈوِگ بکنر (Ludweg Buchner)، ''سائنسی مادہ پرستی'' کا شارح...... یہ یورپی سیکولر پسند عیسائیت پر حملہ کرتے تھے، جبکہ اُن کے ''نوجوان ترک'' مدّاح یہ استدلال کرتے کہ عیسائیت اور اسلام دونوں ''ایک ہی بکواس ہیں'' (۷) عبداللہ جودت، گارپ سیلر کی سرکردہ شخصیت، اس بات کا قائل تھا کہ مذہب انسانی ترقی میں سب سے بڑی رُکاوٹوں میں سے ایک ہے اور اسے ہٹا کر اس کی جگہ پر سائنس کو لانا چاہیے۔

اگرچہ گارپ سیلر سلطنتِ عثمانیہ کے دوران ایک کمزور تحریک ثابت ہوئی، لیکن اس کے ارکان کو، ترکی جمہوریہ کے قیام کے ساتھ اپنے فلسفے کو پروان چڑھانے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ مصطفیٰ کمال، جو کہ اُن کا ایک پیروکار تھا، نئی حکومت کو اُن کے ایجنڈے کی بنیاد پر تشکیل دینے پر پُرعزم تھا۔ اس نے ۱۹۲۵ میں عبداللہ جودت کو لکھا، جیسا کہ موخر الذکر نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے، ''ڈاکٹر، اب تک تم نے بہت سی چیزوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اب ہمیں اُن کو تعبیر دینی چاہیے''(۸)

سیکولر طبقے کی آمریت

اگرچہ مصطفیٰ کمال اپنے سیکولر مقاصد کو حاصل کرنے میں پُرعزم تھا، اس کا تخیل، ترکی جمہوریہ کا اس کی پیدائش کے دوران، واحد متبادل نہیں تھا۔ آزادی کی گزشتہ جنگ (۲۲-۱۹۱۹) کی قیادت ایک جمہوری پارلیمان نے کی، جو انقرہ میں بُلائی گئی تھی، جس میں متنوع نظریات اور پس منظروں والے نائبین بھی شامل تھے۔ جنگ کے فوراً بعد۔ اُن نائبین نے جنہوں نے مصطفیٰ کمال کے نظریات اور شخصیات کی حمایت کی تھی ......یعنی کمالیوں نے ...... ریپبلکن پیپلز پارٹی (آر پی پی) کی بنیاد رکھی۔ دوسرے نمایاں ناموں، بشمول جنگی ہیروؤں کے، کاظم کاربکر (Kazim Karbekir) اور علی فواد سیبی سوئے (Ali Fuat Cebesoy) نے، اس کے مقابلے میں پروگریسو ریپبلکن پارٹی (پی آر پی) کی بنیاد رکھی۔

دونوں جماعتوں کے درمیان فرق ٹھیک ٹھیک وہی تھا، جس کی طرف برنارڈ لیوس نے، اُنیسویں صدی کی اصلاح تحریکوں کے ضمن میں اشارہ کیا تھا: ایک آزادی پسند تھی دوسری غیر آزادی پسند تھی...... کمالی ایک محیطِ کُل اور مختارِ کُل ریاست پر یقین رکھتے تھے، جو ''سائنس'' کی مہربانی سے یہ جانتی ہے کہ معاشرے کیلئے بہترین کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں پی آر پی یہ یقین رکھتی تھی کہ حکومت کو محدود ہونا چاہیے اور معاشرے کو متنوع نظریات کو اپنے اندر جذب کرنے کیلئے آزاد ہونا چاہیے۔ ایرک جان زورکر (Erik Jan Zurcher) وہ ڈچ مورخ جس نے پی آر پی کے بارے میں ایک کتاب لکھی، بیان کرتا ہے کہ ''یہ مغربی یورپی آزادی پسندانہ سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک جماعت تھی''، جس نے کمالیوں کے ''مرکز پسندانہ اور آمرانہ رُجحانات'' کی مخالفت کی۔ اس

MashalBooks.org

کی بجائے اس کے پروگرام میں ''غیر مرکزیت، اختیارات کی علیحدگی، اور انقلابی کی بجائے ارتقائی تبدیلی...... [اور] ایک زیادہ آزادی پسندانہ معاشی پالیسی'' کی وکالت کی گئی'' (۹)

چونکہ پی آر پی آزادی پسند تھی، اس نے کمالیوں کے انتہا پسندانہ سیکولرازم میں شرکت نہ کی۔ لہٰذا پارٹی کے منشور میں ایک شق نے ''مذہبی عقائد اور نظریات کے احترام'' کا اظہار کیا۔ زیادہ تر ارکان خلافت کو بچانے کے بھی حق میں تھے......ایک مذہبی حکومت کی حاکمیت کے طور پر نہیں، بلکہ اتحاد کی ایک علامت کے طور پر......اور وہ برطانیہ عظمیٰ کے مماثل ایک آزادانہ جمہوریت حاصل کرنے کی اُمید رکھتے تھے۔ (۱۰) اگر یہ جماعت زندہ رہتی، تو یہ عثمانیوں کے مماثل جدّت طرازی کے تصور کی نمائندگی کرتی۔

لیکن افسوس، یہ صرف چھ ماہ چلی۔ جون ۱۹۲۵ میں، مشرق میں کُرد بغاوت کو ایک عذر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، کمالی حکومت نے اپنے آزادی پسند رقیب کو ہمیشہ کیلئے بند کر دیا۔ اس کے رہنماؤں پر انڈی پنڈنس ٹریبونل میں مقدمہ چلایا گیا، اُسی ظالمانہ عدالت میں جس نے عاطف خوجہ کو سزائے موت دی، اس کی بندش کی بیان کردہ وجہ، پی آر پی کے منشور میں، ''مذہبی عقائد اور نظریات کے احترام کی شق تھی کمالیوں نے استدلال کیا کہ یہ شق ''مذہبی قدامت پسندوں کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔''

پی آر پی کی سرکردہ شخصیات، ۱۹۳۸ میں مصطفیٰ کمال کی وفات تک پولیس کی نگرانی میں رہیں۔ اور جنگِ عظیم دوم کے خاتمے تک، کسی دوسری جماعت کو ترکی میں اقتدار کیلئے مقابلہ، کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ترکی کی سرکاری تاریخ میں، ۴۶-۱۹۲۵ کے اس دور کو خوش تعبیری سے ''واحد جماعتی دور'' کہا جاتا ہے۔ اُس وقت کے کمالیوں کی طرف سے استعمال کیا جانے والا معنی خیز نصب العین اُن کے فلسفے کا لُبِ لباب بیان کرتا ہے: ''حکومت لوگوں کیلئے لوگوں کے باوجود۔''

یہاں پیش کیا جانے والا تصوّر، قدرے لینن کی مشہور ''پرولتاریہ کی آمریت'' کی یاد دلاتا تھا۔ بولشویک رہنما نے کمیونزم کے حتمی نصب العین کے طور پر آزادی اور جمہوریت دونوں کا وعدہ کیا، لیکن اُس نے استدلال کیا کہ، پہلے لوگوں کو اُس ''غلط شعور'' سے بچانا ہوگا، جس میں اُنہیں مذہب، روایت اور سرمایہ داری کی طرف دھکیلا گیا تھا۔ لہٰذا، لوگوں کی رہنمائی کرنے اور اُنہیں تعلیم دینے کیلئے، جب تک کہ وہ ''صحیح انقلابی طبقاتی شعور'' حاصل نہیں کر لیتے، کمیونسٹ پارٹی کی

نمائندگی میں پرولتاریہ کو حکومت کرنا ہوگی۔

کمالیت کو بھی، قوم کی رہنمائی کرنا اور اُسے تعلیم دینا تھی، جب تک کہ یہ ایک صحیح انقلابی سیکولر شعور حاصل نہیں کر لیتی۔ اس نصب العین کا اظہار ''لاترکی کمالسٹ'' (کمالی ٹُرکی) میں، جو کہ انقرہ سے شائع ہونے والا، غیر ملکی قاری کیلئے فرانسیسی زبان کا ماہوار رسالہ تھا، ہوا۔ اس کے آنکھوں کو خیرہ کرنے والے جلد پوش اکثر اوقات مضبوط پٹھوں والے ترک کارکنوں کی تصویریں پیش کرتے تھے، جو بڑے بڑے صنعتی کمپلیکسوں کا انتظام کر رہے ہوتے تھے جو کہ سوویت یونین کی سوشلسٹ حقیقت پسندی سے قریبی مشابہت رکھتے تھے۔ دوسرے مناظر، جو بڑی بڑی یادگاروں والے خالی مربعوں کو ظاہر کرتے تھے، جو مصطفیٰ کمال کے نام معنون ہوتے تھے۔ اٹلی کے فاشسٹ فن کی یاد دلاتے تھے۔ رسالے میں انسانی تصاویر، جو ایسے مناظر پیش کرتی تھیں، جیسا کہ کسان خوشی سے آسمان کی طرف تک رہے ہیں، تمام بناوٹی انداز اور تماشا تھا۔ کوئی ایک بھی برجستہ منظر ایسا نہیں ہوتا تھا، جو ترکی معاشرے کی حقیقی زندگی کو اور اس کی روایتی تصویر کو، جیسا کہ مساجد، دکھاتا ہو، بلاشبہ، ''لاترکی کمالسٹ'' میں مذہب کا کوئی حوالہ، ''نمایاں طور پر غیر موجود'' ہوتا تھا۔ (۱۱)

آنے والی دہائیوں میں، کمال ازم، سیاسی حالات کے مطابق اختلاف پذیر ہوتا رہا۔ لیکن مذہب کے بارے میں اس کا رویہ ''بداعتمادی جمع نفرت [کا رہا] بالکل اُسی طرح جس طرح والتیسر کی چرچ سے نفرت'' (۱۲) یہی وجہ ہے کہ سیکولرازم کی وہ منفرد شکل جو ترکی نے قائم کی......''لیک لِک'' (Laiklik)، جو فرانسیسی کے ''لے کی تے'' Laicite) یونائیٹڈ سٹیٹس میں چرچ اور ریاست کی علیحدگی سے قطعی مختلف تھا۔ اور ابھی تک ہے۔

جہاں مذہب کی آزادی امریکی نمونے کا بنیادی پتھر ہے، وہیں پر ترکی نمونہ، ریاست کے آمرانہ اقدامات سے، مذہب سے آزادی پر توجہ مرکوز کرتا ہے......جیسا کہ مذہبی اداروں کو بند کرنا، مذہبی علامات پر پابندی لگانا، اور مذہبی رہنماؤں کو دبا کر رکھنا۔ مذہب کے خلاف ریاستی جوش و خروش، صرف اُن اوقات میں، نرم پڑ گیا اور جابر کی بجائے، جوڑ توڑ والا ہو گیا، جب اسے ریاست کے دشمنوں، جیسا کہ مارکسی بائیں بازو اور کُرد علیحدگی پسندی، کے خلاف ایک مفید ہتھیار پایا گیا۔

MashalBooks.org

انتقام کے دھوکے کا دُور ہونا

یقینی بات ہے کہ، کمالی انقلاب نے ترکی میں کچھ مثبت اصلاحات بھی کیں۔ ترکی خواتین نے قانون کے آگے مکمل برابری حاصل کرلی، اوراُنہیں ۱۹۳۵ میں ووٹ کا حق مل گیا، اس سے بہت پہلے کہ یوروپی اقوام نے یہ حاصل کیا۔ تعلیم کو مزید جدید بنایا گیا اور پورے ملک میں نئے اسکول کھولے گئے۔ فنون اور سائنس کو ترقی دی گئی، اور ترکی نے دوسو جرمن پروفیسروں کو، جو زیادہ تر یہودی تھے، جنہیں ۱۹۳۳ میں نازیوں کی طرف سے ''پڑھانے کیلئے غیر موزوں'' قرار دیا گیا تھا، خوش آمدید کہا گیا (اور ملازمت دی گئی)۔ مصطفیٰ کمال کا یہ اعزاز بھی ہے کہ، اس نے ایک عقلمندانہ خارجہ پالیسی اپنائی، جس نے ترکی کیلئے، ایک خطرناک دُنیا مین، امن اور استحکام کی ضمانت دی۔

کمالی انقلاب کے ساتھ بڑا مسئلہ اس کا حد سے بڑھا ہوا سیکولرازم تھا۔ جس نے قدامت پسند مسلمانوں کو اجنبی بنا دیا اور عثمانی جدّت طرازی کے پروگرام کو کاٹ کر مختصر کردیا۔ علاوہ ازیں، معاشرے میں روایتی مذہب کے اثر کو ختم کرتے ہوئے اس کی جگہ ''سائنس اور عقلیت پسندی'' کو لانے کیلئے، کمالیوں نے درحقیقت خلا کو ایک نئے تخلیق شدہ نقلی مذہب سے پُر کیا: تُرکیّت کے عقیدے سے۔

ترکی تشخص کا کثیر نسلی سلطنتِ عثمانیہ میں زیادہ سے زیادہ ''برابر لوگوں میں اوّل'' کا درجہ تھا۔ لیکن جمہوری ترکی میں یہ واحد قابلِ قبول تشخص بن گیا۔ مصطفیٰ کمال نے ۱۹۳۲ میں کہا ''ترک ہر خلا کو پُر کرتا ہے'' ''اُس کا چہرہ ہر جگہ جگمگاتا ہے۔'' (۱۳) اُس نے، ترکی نسل کی اصل کے، قبل تاریخ کے وسطی ایشیا میں مفروضہ ''برتر ترکی تہذیب'' میں پیوست ہونے کے بارے میں غلوآمیز نظریات کو بھی پروان چڑھایا۔ (۱۴) اسی اثنا میں، غیر ترکی گروپوں، زیادہ قابلِ ذکر طور پر کرُدوں پر تُرکیانے کی حکمت عملی نافذ کی۔ مثال کے طور پر، دیہاتیوں کو کُرد زبان کے ہر بولے ہوئے لفظ کے بدلے میں ایک جُرمانہ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا'' (۱۵) کچھ کُردوں نے ان پابندیوں کے خلاف شدید ردِّعمل ظاہر کیا، اوراُنہوں نے ایک جوابی قومی تحریک کی تشکیل کردی، اوراس طرح ترکی کے کبھی نہ ختم ہونے والے ''کُرد مسئلے'' کو جنم دیا۔

تُرکیت کے عقیدے کے ساتھ ساتھ ''ترکوں کے باپ'' کا عقیدہ یا اتاتُرک بھی وجود میں

آیا، وہ قابلِ احترام لقب جو ۱۹۳۴ میں قانون کی طرف سے مصطفیٰ کمال کو دیا گیا۔ (۱۶) ایک مشہور شاعر نے اُسے ''ایک دیوتا جو زمین پر اُترا'' کے طور پر بیان کیا، اُس شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں اُس نے آزادی کی جنگ شروع کی۔ (۱۷) ایک اور شاعر نے اتاترک کی رہائش گاہ (جس کا نام سنکایا تھا) کو قوم کے نئے کعبہ (اسلام کا ''خُدا کا گھر'') کے طور پر بیان کیا۔ (۱۸) اتاترک کی یہ تصویر بطور ایک حاضر و ناظر نیم دیوتا کے، سرکاری پروپیگنڈے اور قومی تعلیم کے ذریعے زندہ رکھی گئی۔ آج بھی، ہر ترکی پرائمری سکول کا طالب علم ہر صبح کا آغاز، سرعام ''بالاترین رہنما اتاترک، جس نے ہمیں یہ دن دکھایا'' کی شخصیت سے وفاداری کا اعلان کرنے سے کرتا ہے، اور پھر یہ حلف اُٹھاتا ہے ''ترکی کے وجود پر اپنے معبود کو قربان کردوں گا'' (میں نے بھی، یہ حلف اُٹھائے تھے، لیکن بالکل نیم دلی سے، خاص طور پر اپنے باپ کو ایک فوجی قید خانے میں دیکھ کر جو اتاترک کی تصویروں اور مقولوں سے بھرا ہوا تھا)۔

لیکن یہ ترکی کے اپنے مسائل ہیں جو کچھ باقی ماندہ مسلم دُنیا کیلئے زیادہ اہم تھا، وہ وہ خفیہ پیغام تھا، جو کمالی انقلاب کی طرف سے دیا گیا یعنی: اسلام اور جدیدیت ایک دوسرے کیلئے ناموافق ہیں، اور مسلمانوں کو ان دونوں کے درمیان انتخاب کرنا ہوگا۔ جدّت طرازی کے عثمانی طرز کو...... جو نہ صرف اسلام کا احترام کرتا تھا، بلکہ اُس سے جواز بھی حاصل کرتا تھا...... ایک طرف پھینک دیا گیا، اتاترک نے سرعام یہ اعلان کیا ''ہم اپنے محرکات آسمانوں اور نامعلوم ذرائع سے حاصل نہیں کرتے'' اُن لوگوں کیلئے جو آسمانوں اور نامعلوم ذرائع'' پر ابھی تک یقین رکھتے تھے، یہ مذہب کی بے حُرمتی تھی۔

لہٰذا، کمال ازم پوری دُنیا کے نیک مسلمانوں کیلئے ایک عظیم صدمہ لیکن درحقیقت مصطفیٰ کمال کیلئے بڑی تعریف تھی، بطور ایک بہادر جرنیل کے، جس نے سامراجی طاقتوں کی شکست دی تھی اور ترکوں کو آزادی کی راہ دکھائی تھی۔ یہ بات خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک کچھ اور تھی، جنہوں نے تحریکِ خلافت تشکیل دی، جس نے برطانوی راج کے خلاف پُرامن مزاحمت کی تبلیغ کی اور جنگِ عظیم اوّل سے لے کر عثمانی خلافت کی حمایت کی تھی۔ تحریک کے رہنما مہاتما گاندھی کے قریبی دوست تھے، جس نے اُن کے بعض اجلاسوں میں شرکت کی، جس کے دوران قرآن کی تلاوت کی جاتی تھی، اور ترکی کے مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی کا اعلان

MashalBooks.org

کیا جاتا تھا۔(۱۹) خلافت کے حامی یہ اُمید کرتے تھے کہ عثمانی خلافت، اتحادی طاقتوں کے قبضے سے بچ جائے گی، اور پوری دُنیا میں، مسلمانوں کے حقوق کا دفاع کرے گی اور اُن کے ایجنڈے کی رہنمائی کرے گی۔

خلافت واقعی ترکی کے قبضے سے بچ گئی، جو ۱۹۲۲ میں ختم ہوا، اور صرف مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں دو سال بعد اچانک ختم کر دی گئی۔ دھوکے سے باہر آئی ہوئی تحریکِ خلافت جلد ہی تحلیل ہوگئی، اور اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں سے زیادہ انتہا پسند آوازوں کو جگہ دی۔ انتہا پسند اسلام پسندی کے دو بنیادی باپوں میں سے ایک، سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۳۰ کی دہائی میں زیادہ کرخت آواز کے ساتھ اُبھرے۔ مورخ اِران لرحینن (Eran Leronan) بیان رکتا ہے "تحریکِ خلافت کی موت نے لگتا ہے کہ مودودی کو اُس رومانی اور دُھندلی اسلام پسندی سے علیحدہ کر دیا، جس پر اس کے بہت سے رہنما یقین رکھتے تھے۔"(۲۰)

"اسلام سے ترکی کے اس انحراف" کی مذمت کرتے ہوئے، مودودی نے یہ ایک بالکل متضاد ایجنڈے کا دعویٰ کیا: "مسلمانوں کیلئے واحد ریاست......اسلامی مذہبی ریاست ہے"(۲۱)

اسلامی آزادی پسندی، جو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کا راستہ تھا، دھندلا ہو گیا۔

"ترکی نمونہ" جو اتنا زبردست مددگار نہیں ہے

مسلم دُنیا پر کمال ازم کا ایک اور اثر، دوسرے آمرانہ سیکولر پسندوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اُبھرتے ہوئے جدید عرب طبقہ ہائے بالا میں مصطفیٰ کمال کی توصیف نے، جدیدیت کے غیر آزادی پسندانہ نقطہ نظر کو اُبھرنے میں مدد دی، جس میں معاشرہ کو ریاست کی طرف سے کنٹرول کیا جاتا ہے، جو خود فوج سے کنٹرول کی جاتی ہے۔

یہ اثر، نظریاتی عرب قوم پرست تنظیموں کی سب سے اہم پیشرو تنظیم، دا نیشنل ایکشن لیگ، اور عراق میں عرب نیشنلسٹ بعث کی پیشرفت کو طاقت ور طریقے سے متاثر کرتے ہوئے، لیگ نے "ریاست کے [کردار] کو قومی ارادے کے پاکیزہ نمائندہ اور مِلٹری کو بطور قوم کے نجات دہندہ" ہونے کے کردار پر زور دیا۔(۲۲) وردی والے آمروں کا دور شروع ہو گیا تھا۔

اس نئی روحِ عصر کا ایک جراُتمندانہ اعلان وہ مضمون تھا، جو شامی فوج کے سرکاری میگزین

"عوام کی فوج" میں شائع ہوا۔ اس میں اسلام کو "تاریخ کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی حنوط شدہ لاش" کے طور پر بیان کیا گیا، اور "نئے سوشلسٹ عرب انسان" کے آغاز کا تقاضہ کیا گیا۔(۲۳)

اتاترک کا سب سے زیادہ پُر جوش مدّاح غالباً ایران کا رضا شاہ تھا۔ وہ قاچار خاندان کے خلاف برطانیہ کے حمایت یافتہ فوجی انقلاب کے ذریعے ۱۹۲۵ میں اقتدار میں آیا، کمالسٹ انقلاب سے حوصلہ پا کر، شاہ نے اتاترک کی طرح ایک جدّت طرازی کا پروگرام شروع کیا، لیکن وہ اس کے نفاذ میں اتاترک سے بھی زیادہ انتہا پسند تھا، اور اُس نے تمام خواتین کو جبری پردہ اُتارنے کا حکم دیا۔ نتیجہ تہران پولیس نے بُرقع پوش خواتین پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور اُن کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ پورے مُلک میں مقامی حکام کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ بُرقع پوش خواتین کو دُکانوں، سینماؤں، اور عوامی غسلخانوں میں داخل ہونے سے روکیں: ایرانی لکھاری رضا براہنی یاد کرتا ہے کہ کسی طرح اُس کا باپ اُس کی ماں اور بیوی کو غسل خانے ایک بوری میں خفیہ طور پر لے کر جاتا تھا، اس دن تک جب اُنہیں ایک پولیس کے سپاہی نے پکڑ لیا۔(۲۴) بُرقع پوش خواتین کو ڈپلوے وصول کرنے، سرکاری تنخواہیں وصول کرنے، گھوڑا گاڑیوں یا کاروں میں سفر کرنے، اور عوامی ہسپتالوں میں علاج کروانے سے روک دیا گیا۔ اگر سرکاری ملازمین اپنی بغیر پردہ بیویوں کو سرکاری تقریبات میں لے کر نہ آتے، تو اُنہیں گولی ماردی جاتی تھی۔ ستم ظریفانہ طور پر، یہ پابندی بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ سفارتی تناؤ پیدا کرنے پر منتج ہوئی، جس نے ہندوستانی خواتین کے، روایتی لباس میں ایران کا سفر کرنے کے حق کا دفاع کیا(۲۵)

رضا شاہ، پردے پر اس پابندی سے جو کچھ حاصل کرنے کی اُمید رکھتا تھا، وہ معاشرے کو مغرب کے رنگ میں رنگنا اور صنفی رُکاوٹوں کو ختم کرنا تھا لیکن اُس کے ظالمانہ طریقے منفی اثرات کے حامل ثابت ہوئے۔ بجائے مردوں کے ساتھ گھلنے ملنے کے "بہت سی مشاہدہ کار خواتین گھروں پر رہنے لگیں"، اپنے آپ کو معاشرے سے مزید الگ کرتے ہوئے۔(۲۶) بہت زیادہ مایوس خواتین نے خودکشی تک بھی کر لی۔(۲۷)

جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے، ایران کے طاقتور مذہبی پیشوا شیعی علما، اپنی روایات پر اس سامنے کے حملے سے خوفزدہ ہو گئے۔ اس چیز نے اُن کے احتجاجوں کو ہوا دی، جو چیز مزید اذیت رسانی کا موجب بنی۔ عوامی مذہبی تہواروں اور تقاریب پر پابندی لگا دی گئی اور علما کو عوام میں تبلیغ

MashalBooks.org

کرنے سے روک دیا گیا۔ ایک واقعہ میں، مارچ ۱۹۲۸ء میں، رضا شاہ ذاتی طور پر گاڑی چلا کر تہران سے قُم پہنچا، جو کہ آیت اللہ کا شہر ہے۔ وہ شہر کے مقدس مزار میں اپنے بوٹوں کے ساتھ داخل ہوا...... جو کسی بھی مسلم عبادت گاہ کی توہین ہے...... اور سیمینار کے متعدد شرکا کو مارا پیٹا، اس سے پہلے کہ وہ اس مذہبی پیشوا کو کوڑے مارنے کا حکم دیتا جس نے اُس پر تنقید کی تھی۔ (۲۸) جولائی ۱۹۳۵ میں، مشہد میں، ایک ناراض لیکن پُرامن احتجاج کاروں کے گروہ کو، گوہر شادہ مسجد پر گھیرے میں لے لیا گیا، بلا امتیاز گولیاں مار کر مار ڈالا گیا، اور پھر اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ (۲۹)

خُدا کے بندے محاصرے میں...... تب اور اب

۱۹۲۰ء کی دہائی کے اواخر میں زندہ رہنے والے کسی قدامت پرست مسلمان کیلئے، دُنیا افسردہ نظر آتی ہوگی۔ سلطنت عثمانیہ تباہ ہوچکی تھی، اور زیادہ تر مسلمان اقوام یا تو یورپیوں کی، یا اس سے بھی بدتر، کمیونسٹ حکمرانوں کی غلام ہوچکی تھیں۔ چند آزاد اقوام، جیسا کہ ترکی اور ایران، پر آمریت پسندانہ حکومتوں کا قبضہ تھا، جنہوں نے اپنے ہی لوگوں کے مذہب کو دبایا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں، ''کافرانہ'' ثقافت بذریعہ سیکولر پسندوں کی عائدہ کردہ چیزوں کے اور مغربی مادہ پرستانہ طور طریقوں کی ترغیب کے، مسلمان معاشروں میں نفوذ کر رہی تھی۔

یہ غالباً وہ سب سے بڑا بحران تھا، جس کا سامنا اُمت کو کبھی ہوا۔ اب کچھ مسلمان یہ سمجھتے کہ یہ وقت ہے کہ مزاحمت کی جائے بلکہ پلٹ کر لڑائی کی جائے۔ یہاں ہیں بنیادیں بیسویں صدی کی اسلام پسندی کی، اُس رجعت پسندانہ نظریے کی جو اسلام کے نام پر تخلیق ہوا، اور جہاد پسندی کی، جو اس کی دہشت پسند شاخ ہے۔

مرحوم ترک سماجی نفسیات دان ایرول گنگور (Erol Gingor) نے اس صدمے کی تعبیرات میں سے ایک بہترین تعبیر پیش کی۔ برطانوی مورخ آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) سے متاثر ہوکر گنگور نے، بیسویں صدی کے اسلام کے بحران کو اُس بحران سے تشبیہ دی جو دو ہزاری قبل واقع ہوا تھا: عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے دوران یہودیوں کی حالتِ زار۔ (۳۰) یہودی، مسلمانوں کی طرح، یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ خدا کی چہیتی قوم ہیں، اور ان کے اندر فطری طور پر ودیعت شدہ غیر یہودیوں پر برتری کا احساس موجود تھا۔ لیکن 'کیا ہونا چاہیے' پر یہ یقین شدّت سے اُس سے متصادم تھا جو کچھ ہے، کیونکہ یہودیوں نے بتدریج مقدّس سرزمین میں اپنا اقتدار

کھو دیا، اور کلی طور پر کفار کی غلامی میں آ گئے سلطنت رومانے، جو اس وقت کی سُپر پاور تھی، پہلی صدی قبل مسیح میں اسرائیل کی سرزمین پر قبضہ کر لیا، نہ صرف یروشلم میں صومعے کے اندرونی حرم کی بے حُرمتی کرتے ہوئے، بلکہ اس کے لوگوں کی عزتِ نفس کی بھی...... نتیجتاً، اسرائیل ایک رومی صوبے میں تبدیل ہوگیا جس پر ہیروڈین خاندان کی طُفیلی سلطنت کی حکومت تھی...... جو کہ کافر رُوم کے سیکولر معاون تھے، جو اپنے لوگوں پر ظلم ڈھاتے تھے۔

ہر اس بغاوت کو جو یہودیوں نے غیر ملکی راج سے نجات حاصل کرنے کیلئے اُٹھائی، ظالمانہ طور پر کچل دیا گیا۔ اس سے بھی بدتر، ان حملہ آور کفار کی سیاسی اور فوجی برتری کے ساتھ اُن کی ثقافتی ترغیب بھی شامل تھی۔ وہ لوگ جو رومی طور طریقوں کی کشش میں گرفتار تھے، جنہیں یونانیت زدہ یہودی کہا جاتا تھا۔ یونانی رومی طرزِ گفتار، طور اطوار، اور عادات بشمول ''عیاشی اور پُرفساد زندگی کے'' اختیار کرتے تھے (۳۱) زیادہ دقیانوسی یہودیوں کی نگاہ میں، یونانیت زدہ یہودی باغی تھے، ''جو گنہگار'' ''طعن باز''، اور ''بُرے اور غیر مذہبی لوگ تھے۔'' (۳۲) خُدا کے لوگ اندر اور باہر سے محصور تھے۔

ایرول گنگور کے مطابق یہ دو ہزاری پُرانا۔ یہودی بحران اُس بحران سے بہت مشابہ ہے جس کا سامنا مسلمانوں کو بیسویں صدی میں ہوا۔ موخر الذکر کی صورت میں، کافر روم کا نیا متن، سیکولر مغرب تھا: نئی یونانیت مغربی تقلید تھی۔ اور نئے ہیروڈین، مسلمان ممالک میں سیکولر پسند آمر تھے۔

وہ طریقے جن میں مسلمانوں نے اس بحران کے بارے میں ردِعمل ظاہر کیا، یہودیوں کے طریقوں کی عکاسی کرتا ہے۔ موخر الذکر کے ہاں چار واضح کیمپ رومن طاقت کے مقابلے میں اُبھرے۔ سدوسیوں نے روم کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا، اور کچھ یونانیت پسندانہ رویے اپنا لئے...... جیسا کہ کچھ مسلمانوں نے آج سیکولر مغرب کے مقابلے میں اپنا لئے ہیں۔ ایسینیوں نے، دُنیا کو تیاگ دیا اور اپنے آپ کو تنہائی میں صوفیانہ زندگی کیلئے وقف کرنے کو ترجیح دی...... آج کل کے صوفیانہ ذہن رکھنے والے مسلمانوں کی طرح۔ تیسری یہودی جماعت، فریسیوں نے، روم کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور ایک منفعلانہ استرداد پسندی میں اُلجھ گئے۔ جس نے اُنہیں یہودی قانون کی بہت سخت پابندی کی طرف لگا دیا۔ یہ چیز بھی اُس چیز کے بہت مشابہ ہے، جو زیادہ قدامت پسند لوگوں نے، بیسویں صدی میں کرنے کا فیصلہ کیا: شریعت کے ساتھ بہت سختی

MashalBooks.org

سے متمسک ہونا، اور کسی بھی نئی اور بدیسی چیز کو رد کرنا۔

عیسیٰؑ کے دور کے یہودیوں میں چوتھا عنصر بھی دلچسپ تھا۔ یہ زیلٹ تھے، جو فریسیوں کی ایک اور زیادہ انتہا پسندانہ شاخ تھی۔ جنہوں نے نہ صرف رومنوں کے خلاف، بلکہ اُن کے یہودی معاونین کے خلاف بھی مسلح جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا، اُس دور کے یہودی مورخ جوزیفس (Josephus) کے مطابق، یہ لوگ پُر جوش طور پر اس بات پر مصر تھے کہ ''خدا ہی اُن کا واحد حکمران اور رب ہے'' (۳۳) دوسرے لفظوں میں وہ کافروں اور اُن کے اتحادیوں کو باہر نکالنا اور مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ آج کل کے عسکریت پسند اسلام کے پیروکار کرنا چاہتے ہیں۔

زیلٹوں کے کچھ ارکان کو سکاری (خنجر بردار لوگ) کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ چھوٹے خنجر اپنے چُغوں کے نیچے چھپائے رکھتے تھے۔ وہ اپنے شکار کو مقبولِ عام اجتماعات میں خنجر گھونپتے اور پھر ہجوم میں غائب ہو جاتے۔ اُن کے نشانے نہ صرف رومی سپاہی اور اہلکار تھے، بلکہ ''کوئی بھی شخص جو رومی ستمگاروں کا زیادہ قریبی دوست محسوس ہوتا، اُن کا نشانہ ہوتا'' (۳۴) یہاں تک کہ اُنہوں نے یہودیوں کے بڑے مذہبی پیشوا جوناتھن کو بھی قتل کر دیا''، ''وہ شخص جس کے متوازن نظریات کو اُنہوں نے برداشت کرنے سے انکار کر دیا'' (۳۵) وہ ہماری ہمعصر زبان میں ''مذہبی انتہا پسند'' اور ''دہشت گرد'' تھے، جو جوناتھن جیسے لوگوں کے پُر امن مذہب کو ''اغوا'' کر لیتے تھے۔

۷۰ عیسوی میں، رُومیوں کے ہاتھوں یروشلم اور معبد ثانی کی تباہی کے بعد، زیلٹوں نے مسادا کے رومی قلعے پر قبضہ کر کے اس میں پناہ لے لی۔ بار بار کے محاصروں کے تین سالوں کے بعد، رُومی فوج نے آخر کار قلعے کو صحیح وسالم حالت میں قبضہ کرنے کی کوشش ترک کر دی اور دیواروں کو جلا دیا۔ جب رُومی یلغار کر کے اندر آئے، تو زیلٹوں اور اُن کے خاندانوں، تمام نے خودکشی کر لی، بجائے ہتھیار ڈالنے کے اگر اُس دور میں بم ہوتے تو غالباً زیلٹ اُنہیں استعمال کرتے ...... نہ صرف اپنے آپ کو، بلکہ اپنے دشمنوں کو مارنے کیلئے بھی اور رُومی غالباً اُن پر ''خودکُش بمبار'' کا لیبل لگاتے۔

وہ آپ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

گزشتہ کہانی کو بیان کرنے کا مقصد یقیناً، اسلام کے نام پر دہشت گردی کا جواز پیش کرنا

نہیں ہے۔ دہشت گردی کیلئے کبھی کوئی جائز عُذر نہیں ہو سکتا ...... یعنی شہریوں پر پُر تشدد حملوں کا۔ بلکہ، میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مسلمان انتہا پسند، جو اس افسوسناک تشدد پسندی کی طرف رجوع کرتے ہیں، یا اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں'' اچانک کہیں سے پیدا نہیں ہو گئے۔ دُنیائے اسلام کی گزشتہ دو صدیوں کی سیاسی تاریخ کے پاس اس ظہور کی کُنجی ہے۔ اس سوال کا کہ اسلامی آزادی پسندی نے ...... جس نے اُنیسویں صدی کے اواخر میں ایسی اُمید میں حصہ لیا ...... اسلام پسندی کی انتہا پسندانہ لہر کے آگے ہتھیار کیوں ڈالے، جواب محض اسلام کی داخلی حرکیات کا جائزہ لے کر نہیں دیا جا سکتا۔ مغربی طاقتوں کی مداخلت، اور اُن سیکولر آمروں کی مداخلت جن کی وہ مسلم دُنیا میں حمایت کرتی تھیں، وہ بھی جزوی طور پر ذمہ وار ہیں۔ (۳۶) آدمی کہہ سکتا ہے، کہ رومی اور ہیروڈین، دونوں کا زیلٹوں کی تخلیق میں حصہ تھا۔

اس کا اور مطلب یہ ہے کہ اسلام پسندی اور اس کی پُر تشدد شاخ، جہادیت، مذہبی سے زیادہ مظہر ہے۔ یقیناً ان تحریکات کی نسبت اسلامی روایت میں زیادہ پُر تشدد اور آمرانہ لہجوں اور موضوعات سے ہے، لیکن جو چیز اُنہیں اُن عناصر کو نہ کہ دوسروں کو انتخاب کرنے پر مجبور کرتی ہے، وہ وہ انداز ہے جس میں وہ دُنیا میں، موجودہ صورتِ حال کا تجربہ کرتے اور اُس کی تعبیر کرتے ہیں۔ اپنے مضمون، اسلام کی بغاوت (The Revolt of Islam) میں نکی آر کیڈی (Nikki R. Keddie) بڑے عقلمندانہ طریقے سے یہ تجویز کرتی ہے:

> ''ہمیں اس امکان کو تسلیم کرنا چاہیے کہ بہت سے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان اتنا زیادہ مغرب کو اس وجہ سے مسترد نہیں کرتے کیونکہ وہ مسلمان ہیں، بلکہ، وہ زیادہ بڑے پیمانے پر اسلام پسند بن جاتے ہیں، کیونکہ وہ مغربی غلبے کے مخالف ہیں ...... ہم انتہا پسندانہ سامراج کی مخالفت، بشمول ثقافتی سامراج کی مخالفت، جو اسلام پسندی کی طرف لے جاتی ہیں، کی اُتنی ہی بات کر سکتے ہیں، یا اس سے زیادہ کر سکتے ہیں، جتنی کہ اس کے برعکس کر سکتے ہیں'' (۳۷)

یہ حرکت غالباً اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ مذہبی طور پر لاتعلق اور سیاسی طور پر بے چین مسلمان بھی کیوں بعض اوقات جہادیوں سے ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ایک امریکی دانشور یہ رائے دیتا ہے ''یہاں تک کہ چُست جینز پہنے ہوئے عرب نوجوان لڑکیاں بن لادن کی

MashalBooks.org

بطور ایک سامراج دشمن ہیرو کے تعریف کرتی ہیں۔'' (۳۸)

ایسے ''سامراج مخالف ہیرو'' ایک چونکا دینے والے پیغام کے ساتھ حمایت حاصل کرتے ہیں: اُمہ، عالمی مسلم برادری، حملے کی زد میں ہے۔ اس کی شہادت، حالیہ اور موجودہ تاریخ کی اُن کی منتخب اور متعصّبانہ تفہیم میں، بکثرت موجود ہے۔ مثال کے طور پر، اُسامہ بن لادن، معمول کے طور پر، اپنے اعلانات میں اُن جگہوں کا حوالہ دیتا ہے، جہاں مسلمانوں کی تذلیل کی گئی ہے، اُن پر ظلم کیا گیا ہے، یا غیر مسلموں (مفروضہ طور پر ریاستہائے متحدہ کی قیادت میں) کی طرف سے قتل کیا گیا ہے، جیسا کہ فلسطین، چیچنیا یا کشمیر میں۔ (۳۹) پھر وہ تمام مسلمانوں کو جہاد میں شامل ہونے کی پُکار دیتا ہے، جس کی تعریف وہ یوں کرتا ہے کہ ''یہ انفرادی فریضہ ہے، اگر دشمن مسلمان مما لک کو تباہ کرتا ہے'' (۴۰) (دوسرے لفظوں میں، اگرچہ روایات میں جارحانہ جہاد کا تصور بھی موجود ہے، لیکن بن لادن اور اُس کے قبیل کے لوگ جس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ دفاعی جہاد ہے)۔

لہٰذا، مغرب کے لوگوں کیلئے، اسلام پسندی، اور جہادیت کو غیر موثر کرنے کا ایک موثر طریقہ، دُنیا کے مسلمانوں کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ اسلام بطور مذہب کے حملے کی زد میں نہیں ہے۔ ایک اضافی اعتماد بحال کرنے والا پیغام یہ ہوگا کہ مسلمان، مغرب میں، دشمنی، توہین، یا امتیاز کا نشانہ نہیں ہیں......اور یہ کہ اُن کی مسجدیں، مینار، اور پردے ممنوعہ نہیں ہیں۔

زیادہ تر مغربی یہ سوچتے ہوں گے کہ وہ پہلے ہی امن اور احترام کے اس پیغام کو پھیلا رہے ہیں......اور کچھ لوگ، صدر اُوباما کی طرح، قاہرہ اور انقرہ میں اپنی ۲۰۰۹ کی معاون تقریروں میں حقیقتاً ایسا کرتے بھی ہیں۔ لیکن یہ پیغام کافی حد تک، بعض وجوہ کی بنا پر، پہنچتا نہیں ہے۔

اوّل، زیادہ تر مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ یو ایس کا خطیبانہ بیان، حقیقی پالیسیوں سے مطابقت نہیں رکھتا، اور وہ امریکی خارجہ پالیسی کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جسے وہ مسلم اقوام کیلئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ فلسطینیوں کی چار دہائی طویل حالتِ زار، جو کہ ایک تمثالی مسلم المیہ بن گیا ہے، اکثر سرِ فہرست ہوتی ہے، کیونکہ ریاستہائے متحدہ مسلم دُنیا میں یک طرفہ طور پر اور غیر منصفانہ طور پر، اسرائیل کا حامی ہے۔ ۲۰۰۰ سے لے کر، زیادہ تر حصے ہیں، ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں عام شہریوں کی اموات کی وجہ سے، صورتِ حال مزید خراب ہوئی ہے۔

مغرب کے لوگ حُسنِ تعبیر سے ''ضمنی نقصان'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن زیادہ تر مسلمان اُسے معصوم لوگوں کے قتل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ایک ناقد نے اسے خوب بیان کیا ہے ''ایک آدمی کا ضمنی نقصان، دوسرے آدمی کا بیٹا ہوتا ہے'' (۴۱)

دوسری طرف، جہاں یو ایس کی خارجہ پالیسی کو مسلمانوں کیلئے مددگار خیال کیا جاتا ہے، جیسا کہ سابقہ یوگوسلاویا میں، وہاں امریکہ کو عزیز رکھا جاتا ہے۔ کوسووو، جو کہ نوے فیصد سے زیادہ مسلمان ہے، دُنیا میں امریکہ کے سب سے زیادہ حامیوں میں سے ایک ہے۔ میرے ملک، ترکی میں، ریاستہائے متحدہ ۱۹۹۰ کی دہائی کے اواخر میں بہت مقبول تھا، جب اسے بطور ایک امن قائم کرنے والے کے، اور سربوں کی جارحیت کے خلاف ایک دیوار کے طور پر دیکھا جاتا تھا، لیکن ۲۰۰۳ کے بعد ترکوں کی امریکہ مخالفت یکدم آسمان کو چھونے لگی، جب جنگ عراق نے امریکہ کو ایک جارح کا روپ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ (دوسرے لفظوں میں، جہاں، مسلم دُنیا میں ہوسکتا ہے کہ کچھ جنونی مسلمان امریکہ سے اس وجہ سے نفرت کرتے ہیں، جو کچھ کہ وہ ہے، زیادہ تر مسلمان حقیقتاً اس پر نظر رکھتے ہیں کہ امریکہ کیا کرتا ہے)

دوم، مسلمان مغرب سے، اکثر اس کے سب سے مخالفانہ بیان سُنتے ہیں۔ جب ریپبلکن کانگریس میں ٹام ٹانکریڈو (Tam Toncredo) نے ۲۰۰۵ میں فاکس نیوز پر یہ اشارہ دیا کہ، امریکہ اسلامی دہشت گردی کے ''حتمی جواب'' کے طور پر ''مکہ پر بمباری کر سکتا ہے''۔ تو بہت سے امریکیوں نے غالباً اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن اگلے دن، میں نے ترکی میں اسلامی اخبارات اور ویب سائٹوں پر نگاہ ڈالی اور یہ سُرخی پڑھی ''اب امریکہ، اسلام کو کعبہ کی تباہی سے دھمکانے کی جرأت کرنے لگا ہے!''۔ دوسری تہذیب میں بہت زیادہ انتہا پسندانہ عناصر کو اس کے بڑے دھارے کے طور پر دیکھنے کا یہ رُجحان، بدقسمتی سے دونوں تہذیبوں میں وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ ذرائعِ ابلاغ، دونوں طرف، جنونیوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

اسی طرح، جب سوئٹزرلینڈ نے ۲۰۰۸ میں ایک قومی سطح کی رائے شماری میں میناروں پر پابندی لگائی تو اس نے بہت سے مسلمانوں کیلئے ایک تمثیلاتی دوہرا معیار قائم کر دیا، میرے ایک ترک قاری نے مجھے غصے سے لکھا ''اُس مغرب کو دیکھو جس کی تم بہت تعریفیں کرتے ہو۔ اُن کی آزادی صرف ملحدوں اور ہم جنس پرستوں کیلئے ہے، نا کہ مسلمانوں کیلئے۔'' میں نے وضاحت

MashalBooks.org

کرنے کی کوشش کی کہ سوئٹزرلینڈ کی رائے پورے یورپ کی نمائندگی نہیں کرتی، چہ جائیکہ امریکا کی، لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے لاکھوں لوگ تھے جو اس کی طرح سوچتے تھے۔ جن تک مین رسائی نہیں رکھتا تھا۔ دوسری طرف، لاکھوں امریکی ہیں، جنہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب اپنی سرزمین پر ایک بھی گرجے کی اجازت نہیں دیتا، اور غلط طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ ہے وہ کچھ جس کا حکم ''اسلام'' دیتا ہے۔ یہ حقیقت کہ باقی ہر مسلم اکثریتی ملک میں گرجے موجود ہیں، بہت کم توجہ حاصل کرتی ہے۔

مشرق اور مغرب کے درمیان خلیج بھی چوڑی ہے، اُس طریقے کے سلسلے میں جس میں ہم وقت کو دیکھتے ہیں۔ امریکی اکثر موجودہ حالات کے حوالے سے سوچتے ہیں، جو مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں جبکہ شرقِ اوسط کے لوگ تاریخ کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ جب یو ایس نے ۲۰۰۳ میں عراق پر قبضہ کیا، تو بہت سے امریکی یہ سوچتے تھے کہ یہ ایک بے مثال اقدام ہے، جو ڈونلڈ رمز فیلڈ (Donald Rumsfield) کی نو قدامت پسندوں اور فوجی حکمتِ عملیوں کی بصیرت پر مبنی تھا۔ لیکن علاقے کے بہت سے لوگوں کیلئے یہ...... صلیبی جنگجوؤں، منگولوں، نپولین اور یورپی سامراجیوں کے بعد، پھر ایک اور حملہ تھا۔

ثقافتی سطح پر، مغرب کے مادہ پرستانہ اور لذتیاتی عوامی کلچر اور روایتی مسلمانوں کے روایتی کلچر کے درمیان بہت بڑی خلیج ہے لیکن مغرب کا ایک اور چہرہ بھی ہے، جو انہی مسلمانوں کو قابلِ رسائی لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں میرے پارسا دادی دادا، اور اُن کے ہم خیال ہمسائے Little house on the prairie کو دیکھنا پسند کرتے تھے، جسے اُس وقت تُرکی ٹیلیویژن پر دکھایا جاتا تھا، اور ترکی زبان میں ڈب کیا گیا تھا۔ اُس سلسلے میں، جن خاندانی اقدار کی تصویر کشی کی گئی، اگرچہ وہ عیسائی تھی، لیکن وہ اسلامی مذہب پرستوں کو قابلِ تعریف نظر آتی تھی۔ (بلاشبہ Sex and the city قابلِ مذمت ہوتی)۔ جب تک کہ اسلام کے ساتھ مخالفت کے طور پر ایسے بیان نہ کیا جائے، جو کچھ روایت پرست، مسلمانوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، وہ مغربیوں کا عیسائی پن نہیں ہے، بلکہ اس کی کمی ہے۔

اگر ہمارے دور کے رومی، ہماری طرف کے زیلٹوں کو خاموش کرانے میں مدد دینا چاہتے ہیں، تو عقلمندی کی بات یہ ہوگی کہ وہ ان نکات پر غور کریں۔ لیکن ایسی چیزیں بھی ہیں جو ہم بطور

یہودیوں (میرا مطلب یقیناً مسلمان ہے) کے کر سکتے ہیں۔ اور اُن میں ایک ٹھیک وہی ہے جو نظارین نے، دو ہزار سال پہلے کی: زیلٹوں اور اُن کی بنیاد فریسیوں کو دکھائیں کہ خدا کی زمینی سلطنت کے اُن کے جوش وجذبے سے، اُنہوں نے اُس کے ساتھ آسمانی رابطہ کھو دیا ہے۔

مارکسزم اور رلینن ازم کو سمونا

اس بات کی وضاحت کرنے کیلئے کہ میرا مطلب کیا ہے مجھے پیچھے ۱۹۹۲ کی طرف جانے دیجئے، جو کہ کالج میں میرا دوسرا سال تھا۔ ایک دن میری ملاقات ایک دور پار کے دوست سے ہوئی جسے میں ہائی اسکول میں جانتا تھا۔ وہ خاص طور پر اسلامی شعائر کی پابندی کرنے والا مسلمان نہیں تھا، اور ہماری عمر اور استنبول میں ہمارے ماحول کے بہت سے نوجوانوں کی طرح، وہ بھی لڑکیوں اور کاروں میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا، بہ نسبت مسجدوں اور عبادات کے۔ لہٰذا میں کچھ حیران سا ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے حال ہی میں دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنی شروع کر دی ہے۔ میں نے اسکول کے کیفے ٹیریا میں، کافی پیتے ہوئے کہا ''یہ حقیقتاً بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر مجھے پوچھنے کی اجازت ہو تو یہ کیسے ہوا؟''

اُس کا جواب حیران کُن تھا۔ ''میں نے ٹی۔ وی پر ان امریکی جہازوں کو بغداد پر بمباری کرتے دیکھا'' اُس نے کہا: ''میں اس قدر پُر جوش ہوا کہ میں مزاحمت کرنے کیلئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔''

وہ جنگ جس کی طرف میرا دوست اشارہ کر رہا تھا، پہلی خلیجی جنگ تھی۔ (خُدا بہتر جانتا ہے کہ اُس نے جنگ عراق کے بعد کیا کیا، جو اس سے کہیں زیادہ خوفناک ثابت ہوئی) اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اُس کی کچھ عرب جڑیں بھی ہیں، اور بغداد میں چند دُور پار کے رشتہ دار بھی ہیں۔ اُس شہر پر، سی این این پر براہِ راست بمباری ہوتے ہوئے دیکھ کر، واضح بات ہے کہ اُس کے جذبات کو مہمیز ملی، جو مذہب پرستی کے ایک اچانک رنگ میں تبدیل ہو گئی۔

بہر حال، نماز کیلئے یہ سیاسی متحرک میرے نزدیک نیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بہت سال گزرے اپنے اجداد سے سیکھا تھا، روزانہ کی عبادت مذہبی، وجوہ کی بنا پر کی جاتی ہے...... خُدا کی عبادت کرنے کیلئے، اُس کی رحمت حاصل کرنے کیلئے اور اپنی روح کو پاک کرنے کیلئے نا کہ اُن

MashalBooks.org

واقعات کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے جو شام کی خبروں میں چل رہے ہوں۔

میرا خیال ہے، میرے دوست کی کہانی اُس بڑے مظہر پر روشنی ڈالتی ہے، جو مسلم دُنیا میں بیسویں صدی میں اُبھرا۔ جونہی اسلامی آزادی پسندی کمزور پڑی، اور مغرب اور اس کے اثر کے خلاف مزاحمت اُبھری، تو اس مزاحمت نے ہی، مذہب کی بنیاد کے طور پر حقیقی مذہب پرستی کی جگہ لینا شروع کر دی۔ اسلام پسندی کے اس رُجحان کے پیروکاروں اور خالقوں نے، اسلام کی تعریف خُدا کی رحمت اور ابدی نجات کے ایک راستے کے طور پر نہیں، جیسا کہ یہ قرآن میں کی گئی ہے، بلکہ اس کی بجائے ایک ایسے سیاسی نظریے کے طور پر کرنا شروع کر دی جو مسلمانوں کو مغرب کے غلبے والے دُنیا کے نظام کے خلاف جنگ کرنے میں مدد دے گا۔ مودودی نے ۱۹۴۱ میں لکھا ''اسلام ایک ایسا انقلابی اصول اور نظام ہے جو حکومتوں کو اُلٹ دیتا ہے...... یہ پوری دُنیا کے مکمل سماجی نظام کو اُلٹ دینا چاہتا ہے......اور اس کے ڈھانچے کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا ہے......اسلام دُنیا چاہتا ہے۔'' (۴۲)

یہ ''اسلام'' مارکسزم اور لینیزم کے بہت مشابہہ لگتا ہے......اس میں کوئی حیرت نہیں، کیونکہ مودودی اس نظریے سے شدّت سے متاثر تھا۔ اگرچہ اُس نے آزدای پسندی اور مارکسزم دونوں کی، بطور سیکولر مغرب کی پیداوار کے، مذاحمت کی، لیکن اسے اپنے نئے ''اسلام'' کو کسی نظریاتی مواد سے بھرنا تھا کیونکہ آزادی پسند یورپ حقیقی دشمن تھا، اور وہ مرکزی مطلق العنانیت جیسی کوئی چیز چاہتا تھا، لہٰذا اُس نے مارکسسٹ اصطلاحات اور عملی طریق سے آزادانہ طور پر استفادہ کیا۔ (۴۳) ۱۹۴۰ کی دہائی میں، اُس کے کچھ مداحوں نے کھلے عام اور فخریہ انداز میں، اُس کی تصویر بطور ''اسلام اور سوشلزم کے درمیان ملاپ'' کے باوا آدم کے طور پر پیش کی (۴۴) درحقیقت، خود مودودی نے سرِ عام یہ اعتراف کیا کہ وہ اسلامی ریاست'' جو اس کے تصور میں ہے ''فاشسٹ اور کمیونسٹ ریاستوں سے ایک قسم کی مشابہت رکھتی ہے۔'' اُس طریقے میں جس میں یہ پورے معاشرے پر غلبہ رکھتی ہے۔ (۴۵)

اس مرکزی مطلق العنان ریاست کا بنیادی نصب العین مسلم معاشرے پر شریعت کا نفاذ کرنا ہوگا ......اور اسلام پسند اطوبیا میں، پوری دُنیا میں ......لیکن کونسی شریعت؟ قبل جدید دور میں، اس سوال کا جواب ریاست کی طرف سے نہیں دیا جاتا تھا، جیسا کہ ہم نے دیکھا، مختلف علما

کی طرف سے شریعت کے مختلف مکاتبِ فکر پیدا کئے گئے، اور افراد اور قوموں کو اس میں سے انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ اسلامی دُنیا میں جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، اُن کے پہلے ہی اپنے قوانین تھے۔ اس قبل جدید دور میں، بہرحال، قانون شخصی تھا نا کہ علاقائی۔ اُنیسویں صدی میں، جدید اُصول کہ قانون علاقائی اور تمام شہریوں پر مساوی طور پر لاگو ہے، کو اختیار کر کے اسے تبدیل کر دیا......اور اُنہوں نے شریعت کو، مجلّے کے ذریعے اس کی ضابطہ بندی کر کے، معیاری بنا دیا لیکن اُنہوں نے یہ کچھ، شریعت کی اصلاح کر کے، اور مزید اصلاح کی ضرورت کو تسلیم کر کے، اس قانونی مقولے کو تسلیم کر کے کیا، ''تبدیل ہوتے ہوئے اوقات قانون کی ترمیم کو جائز بنا دیتے ہیں۔''

تاہم اسلام پسندی کے منصوبے کا ہدف ''اصلی شریعت'' کو نافذ کرنا تھا، وہ شریعت جو درجن بھر صدیاں پہلے کے معیارات کے مطابق تشکیل دی گئی تھی۔ مزید برآں، کلاسیکی دور کے برعکس، جس میں شریعت انتظامیہ کے اختیارات پر ایک روک تھی، اب یہ انتظامیہ کا ایک آلہ کار بن گئی۔ جدید ریاست کے طاقتور آلات اور قانون کے قبل جدید کے معیارات نے ایک بالکل ظالمانہ اور جابرانہ نظام قائم کیا۔ یہ سوال کہ آیا یہ جبر لوگوں کو زیادہ خدا پرست بنا دے گا...... جو کہ قرآن کی سب سے پہلی غرض ہے...... پوچھا تک بھی نہیں گیا۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ مسئلہ، ایک ایسا ''مکمل نظام'' قائم کرنا تھا جو مفروضہ طور پر مسلمانوں کو زمینی فتح دلوائے۔

اسلام پسندی کی خُدا سے پسپائی

اپنی تمام تر مذہبی ہاو ہو کے، پھر، اسلام پسندی درحقیقت ایک ''سیکولر'' سیاسی منصوبہ تھا ......جیسا کہ اس کے نعروں سے واضح ہے۔ مصری فعالیت پسند، حسن البنّا، جس نے ۱۹۲۸ میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی، جو اسلام پسندی کے دوستونوں میں ایک بنی (مودودی کی جماعتِ اسلامی کے ساتھ ساتھ)، نے اسلام کا تقابل سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں سے کیا، اور بلاشبہ یہ استدلال کیا کہ یہ دونوں سے بہتر ہے۔ (۴۶) مسئلہ صرف اس بیان کے کھوکھلے پن کا نہیں تھا ......اسلام حکمرانی کا کوئی خاکہ پیش نہیں کرتا ...... بلکہ اس کے اسلام کا رُتبہ گھٹا کر اسے اجتماعی ''نظام'' میں تبدیل کرنے کا تھا، جو کہ ذاتی مذہب پرستی سے خالی تھا۔

MashalBooks.org

مذہب کے سابق پروفیسر، ولفریڈ کانٹ ویل سمتھ (Wilfred Cantwell Smith) نے مصری مجلّے مجلة الازہر کے ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۸ تک کے ارتقا کے اپنے مطالعے میں، خُدا اور سیاست کے درمیان اس عجیب سودے بازی کا مشاہدہ کیا۔ اُس دور کے دوران مجلّے کے دو ایڈیٹر تھے۔ پہلا، ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۳ تک الخضر حسین تھا، جو کہ ایک روایتی مسلمان تھا...... وہ مذہب کو ''ایک ماورائی تصور کے طور پر دیکھتا تھا، بجائے ایک سیاسی اور تاریخی وجود کے'' اور وہ اس قدر پُر اعتماد تھا کہ مسلمانوں کے رویے پر تنقید کرسکتا تھا۔ اس مجلّے کے مضامین یا تو اخلاقی ہدایات سے پُر ہوتے تھے، یا دینیاتی غور وفکر سے۔ مثال کے طور پر فطرت کی شاندار خوبصورتی، کی تعبیر خدا کی عظمت کی علامت کے طور پر کی جاتی تھی۔ باقی ہر چیز سے ہٹ کر، خُدا احترام کا مرجع تھا۔(۴۷)

۱۹۳۳ میں، فرید واجدی، جو کہ ایک اسلام پسند تھا، نے میگزین کو سنبھال لیا، اور اس کا مواد زیادہ سے زیادہ سیاسی ہوگیا، واجدی کا واحد بڑا مقصد اپنے قاریوں کو یہ یقین دلانا تھا کہ اسلام بطور ''نظام'' کے مکمل ہے، خاص طور پر جب اُس کا موازنہ مغربی نظاموں سے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ''اسلام کی انسانی حقیقت، احترام کا نیا مرجع تھی'' اور ''اس زمینی قدر نے ایک مفہوم میں ماوراخُدا کی جگہ لے لی تھی''۔ سمتھ کے مطابق ''ایک گہری غیر مذہبیت'' واجدی کے، مجلّے میں نفوذ کئے ہوئے تھی اور خُدا اس کے پورے صفحات میں نمایاں طور پر شاذو نادر ہی ظہور پذیر ہوتا تھا۔(۴۸)

بہت قابلِ غور بات ہے کہ خدا سے یہ پسپائی زمین پر کوئی خوشی نہ لائی۔ ہر اُس ملک میں جہاں وہ اقتدار میں آئے ......ایران، سوڈان اور افغانستان ......اسلام پسند وہ جنت تخلیق کرنے میں ناکام ہوگئے جس کا اُنہوں نے وعدہ کیا۔ کیونکہ یہ اقتدار میں ''اسلام'' نہیں تھا، بلکہ اسلامی لبادے میں مطلق العنانیت تھی، اور کسی بھی مطلق العنانیت کا مقدّر ناکامی ہوتا ہے۔

اسلام پسندوں کو اس کوشش اور غلطی کے عمل میں اُلجھنے دینا، غالباً اُنہیں ایک غیر آزمائش شدہ اتوبیا دینا، غالباً اُنہیں ایک غیر آزمائش شدہ اتوبیا کے ساتھ چمٹنے رہنے سے بہتر ہے۔ ایسی جگہوں پر جہاں اُنہیں سیاسی طور پر مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، وہ زیادہ انتہا پسند، اور آخرِ کار پُرتشدد ہوگئے۔ مصر میں ملک کے یکے بعد دیگرے آنے والے ہیروڈوں کی طرف سے، ناصر، سادات، اور مبارک ......کی طرف سے اخوان المسلمون پر ظالمانہ جبر نے، اس تنظیم کی زیادہ انتہا

پسند شاخیں پیدا کیں۔ سید قطب، مودودی کا عرب ثانی، اُس تشدد کے نتیجے میں جو اس نے مصر کی خوفناک جیلوں میں برداشت کیا، زیادہ سے زیادہ سخت ہوتا گیا۔ نتیجۃً جہاد کی اُس کی پکار نے بہت سے انتہا پسندوں کو، بشمول ایمن الزواہری کے، متاثر کیا، جو، مصری تشدد کا اپنا حصہ وصول کر لینے کے بعد القاعدہ کا ہدایت کار بن گیا۔(۴۹)

ان جدید دور کے زیلٹوں کی کہانیاں مغرب میں بہت مشہور ہیں ......اُس وقت سے جب اُن میں سے کچھ نے ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ جدید دور کے روم کے قلب پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا......اُس افسوسناک دن کے بعد سے، متعلقہ امریکیوں اور دوسرے مغربیوں نے ''انتہا پسند اسلام کی مصیبت'' پر توجہ مرکوز کی ہوتی ہے اور وہ اس پر بحث کررہے ہیں۔

اس کے برابر اہم بحث ایک اس بات پر منعقد ہونی چاہئے کہ اسلام کی زیادہ موثر تعبیرات، پھلنے پھولنے کے قابل کیونکر ہوں گی۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ سیکولر پسند منصوبہ، مسئلے کا ایک حصہ ہے، نا کہ حل۔ مذہب کو مسلمانوں کے ذہنوں سے باہر نکالنے کی کوشش، اپنی بدترین شکلوں میں، آمرانہ حکومتیں پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نرم شکلیں بھی غیر معاون ہیں، کیونکہ وہ مسلمان معاشروں کی مذہبی خواہشات کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہتی ہیں، ایک ایسی چیز، جو قابلِ پیش بینی مستقبل میں یہاں رہنے والی ہے۔ ہم، بہرحال، ایک سیکولر ساز دُنیا میں نہیں بلکہ سیکولرازم سے نکالنے والی دُنیا میں رہتے ہیں۔(۵۰)

لیکن ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا ہے کہ یہ دُونوں انتہائیں ......سیکولر اور اسلام پسند آمریت ......ایک صدی پہلے وہ واحد ترجیحات نہ تھیں جن کا سامنا مسلم معاشروں کو تھا: ایک اُبھرتی ہوئی اسلامی جدیدیت بھی تھی، جس نے آزادانہ سیاست کو مسلم اقدار کے ساتھ یک جان کردیا۔ کیا وہ گزرے ہوئے دور کی ایک عجیب چیز تھی؟ یا کیا یہ ابھی تک ایک ہونہار تصوّر ہے؟

یہ ایک سوال ہے، جس پر مسلمان، اور غیر دُنیا سے پوری دُنیا میں بہت سے ذہن آج کل غور کررہے ہیں اور اس کا انتہائی دلچسپ جواب ایک دفعہ پھر، اچھے پُرانے ترکی سے آتا ہے۔

MashalBooks.org

باب8

اِسلامی آزادی پسندی کی طرف تُرکی پیش رفت

غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے، شرق اوسط کیلئے ایک آزادی پسندانہ ترقیاتی نمونے کی تحریک کیوں نہیں دیکھی، کیونکہ ہم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ یہ لازماً اسلامی رُجحان کی مخالفت کرے گی۔

حجاب......لیونارڈ بائنڈر، اسلامِک لبرلزم (۱)

ترکی نے ۲۰۰۸ کا آغاز ایک بہت گرما گرم مباحثے کے سائے میں کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا یونیورسٹی کی طالبات اپنے سروں کو حجاب کے ساتھ ڈھانپ سکتی ہیں...... جوکہ ایک ایسا معمول ہے جس کی اجازت، سوائے ترکی کے، پوری آزاد دُنیا میں ہے جہاں ۱۹۸۹ میں ایک کٹڑ سیکولر آئینی عدالت کی طرف سے پابندی لگادی گئی۔ برسرِ اقتدار جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اس کے ترکی مخففات کے مطابق اے کے پی) ایک قدامت پسند پارٹی ہے جس کی قیادت دیندار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اُنہوں نے چھ ماہ پہلے، جولائی ۲۰۰۷ میں ایک وسیع انتخابی فتح حاصل کی تھی، اور یہ حجاب کی حمایت کرنے کیلئے آمادہ تھی...... جو اُن کی زیادہ تر بیویاں اور بیٹیاں پہنتی تھیں...... کم ازکم کیمپسوں میں۔

فروری میں، اے کے پی نے، ترکی پارلیمان میں دوسری دو جماعتوں کی حمایت سے،

ایک ترمیم منظور کی جس نے آئین میں دوشقوں کا اضافہ کیا۔ ان میں سے ایک میں یہ بیان کیا گیا کہ تمام شہری، بلالحاظ اُن کے مذہب، نسل اور ثقافت کے ''عوامی خدمات سے مساوی طور پر فائدہ اُٹھائیں گے۔'' ......دوسری ترمیم نے ایک گارنٹی مہیا کی: ''کسی شہری کو اعلیٰ تعلیم کے حق سے نہیں روکا جائے گا''۔

یہ شقیں، زیادہ تر لوگوں کو عام فہم اعلانات کی طرح لگیں گی، لیکن سیکولر پسند انتظامیہ کیلئے یہ ایک ناقابلِ قبول الحاد پر مشتمل تھیں، جس نے یونیورسٹیوں کے دروازے ''پست ذہن'' قدامت پسند مسلمانوں کیلئے کھول دیئے۔ جلد ہی آئینی عدالت نے مداخلت کی۔ اس نے نہ صرف اس ترمیم کو کالعدم قرار دیا بلکہ اے کے پی کی حکومت پر، ملک کے اپنے طرز کے سیکولرازم کی خلاف ورزی کرنے پر ایک بھاری جُرمانہ عائد کیا۔ درحقیقت، حکمران جماعت، بمشکل ہی منتشر ہونے اور ترکی کے سیاسی قبرستان میں دفن ہونے سے بچی، جہاں دو درجن سے زیادہ جماعتیں حالتِ سکون میں پڑی ہیں، محض سرکاری نظریے کے کسی ایک رُخ کی تابعداری کرنے میں ناکامی کی وجہ سے۔

اس عجیب وغریب سیاسی تنازعے کے درمیان ......جس کے دوران ''آزادی'' اور ''سیکولرازم'' باہم، مخالف نعرے بن گئے تھے'' ......ایک سر پر سکارف پہنے ہوئے طالبہ کی طرف سے ایک دلچسپ آواز اُبھری، جس کے تعلیم کے حق پر بحث کی جارہی تھی۔ ایک ویب سائٹ پر جس کا عنوان ''ہم ابھی آزاد نہیں ہیں'' تھا، اُن میں تین سو افراد نے درج ذیل بیان کے نیچے اپنے دستخط ثبت کیئے:

''اُس دن سے، جب یونیورسٹی کے دروازے ہمارے اوپر بند کردیئے گئے، جو مصائب ہم نے اُٹھائے ہیں، اُنہوں نے ہمیں کچھ۔ چیزیں سکھائی ہیں: ہمارا اصل مسئلہ وہ آمرانہ ذہنیت ہے، جو لوگوں کی زندگیوں، شکل وصورت، الفاظ اور خیالات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل کرلیتے ہیں۔

لہٰذا، بطور ایسی خواتین کے جنہیں اس وجہ سے امتیاز کا سامنا ہے کیونکہ ہم اپنے سروں کو ڈھانپتی ہیں، ہم بذریعہ ہذا اعلان کرتی ہیں، کہ ہم، محض یونیورسٹیوں میں اپنے سکارفوں کے ساتھ داخل ہونے سے خوش نہیں ہوں گی، تاوقتیکہ ایسا نہ ہو کہ:

o کُردوں اور ملک میں دوسرے اقلیتی گروہوں کو، اپنے آپ کو اوّل درجے کے شہری سمجھنے

MashalBooks.org

کیلئے قانونی اور نفسیاتی بنیاد مہیا کی جائے۔

- [غیر مسلم] اقلیتوں کے وہ ادارے جو بے شرمی سے ضبط کئے گئے تھے اُنہیں واپس کئے جائیں۔
- یا ''تُرکیت کی توہین'' کرنے کے مقدمات [جو زیادہ تر بہت سے آزادی پسند دانشوروں کے خلاف قائم کئے گئے ہیں] ختم کئے جائیں۔(۲)

باقی کے متن میں، اُنہوں نے، ترکی میں تمام دبے ہوئے گروہوں کیلئے آزادیوں کی طلب جاری رکھی، جس میں علوی بھی شامل تھے، جو ایک غیر دقیانوسی مسلم فرقہ ہے، اور ''تفریق، دباؤ اور جبر کی تمام شکلوں'' کی مذمت کی۔ آخر میں، ان ''پردہ دار'' خواتین نے اپنے تمام موقف کو ایک قول کی بنیاد پر استوار کیا، جسے پیغمبر محمدؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: ''آسمان اور زمین انصاف پر استوار ہیں۔''

یہ صحیح معنوں میں آزادانہ اور اسلامی پیغام فوراً ہی مقبول ہو گیا، اور قومی خبروں کی بڑی سُرخیاں بننے لگا۔ اس کے دستخط کنندگان کی تعداد تیزی سے بڑھتی گئی، جو صرف چند ہفتوں میں بارہ سو تک پہنچ گئی۔ جلد ہی تین نوجوان خواتین نے، جنہوں نے یہ اقدام شروع کیا تھا نیسلیہان اکبولوت (Neslihan Akbulut)، ہلال کپلان (Hilal Kaplan) اور حوّا ایلمیز (Havva Yilaniz) نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا (We are not yet free) ہم ابھی آزاد نہیں ہیں۔ اس کے تعارف میں اُنہوں نے وہی نعرہ استعمال کیا'' جو ان کی ویب سائٹ پر نمودار ہوا تھا: ''اگر معاملہ آزادی کا ہے، تو کوئی بھی چیز معمولی نہیں ہے۔''

یہ اُس مظہر کی صرف ایک مثال ہے، جو ترکی میں ۱۹۹۰ کی دہائی سے اُبھرا ہے: آزادی پسندانہ سیاسی نظریات کی بڑھتی ہوئی قبولیت اور وکالت ملک کے عملی مسلمانوں کی طرف سے، درحقیقت آزادی پسندانہ اور اسلامی رُجحانات ملک میں اس طرح آپس میں گُندھ گئے ہیں، کہ اب وہ انتہا پسند سیکولر پسندوں سے بطور اتحادیوں کے دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ موخر الذکر کی طرف سے استعمال کئے جانے والے نفرت کے الفاظ بھی اس اسلامی آزادی پسندانہ ملاپ کی عکاسی کرتے تھے۔ جہاں وہ پردہ دار خواتین کی توہین کرتے ہوئے اُنہیں کارافاطامالا (Karafata malas) (لال بیگ) کہتے تھے، وہیں پھر وہ اسلامی آزادی پسندوں کیلئے جو اصطلاح استعمال

کرتے تھے وہ ہے ٹکیلی لبوش (Tkkelilibos) جس کے لفظی معنی ہیں ''آزادی پسند نماز کی ٹوپی کے ساتھ''۔

اور یہ سب کچھ واقع کیسے ہوا، ایک جائزہ لینے کے قابل کہانی ہے۔

''مرکز'' بمقابلہ ''مضافات''

پچھلے باب میں، ہم نے ترکی کو کمالی انقلاب پر چھوڑا، وہ کوشش، جو ترکی کو اس کے عثمانی ماضی سے ہٹانے اور اسے دوبارہ بنیاد سے اسے تخلیق کرنے کیلئے کی گئی، جو ان تصورات پر مبنی تھے، جن کی بنیاد اُٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے یورپ کے انتہا پسند سیکولرازم پر رکھی گئی۔ اس تصور کے مطابق، اسلام کو معاشرے میں کسی قسم کے کسی اثر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ۱۹۳۶ میں یک جماعتی کمالی حکومت کے سیکرٹری جنرل رجب پیکر (Recep Peker) نے ۱۹۳۶ میں لکھا: ''ترکی میں مذہبی غور وفکر کی حدود، آدمی کی جلد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔''(۳) دوسرے لفظوں میں، مذہب صرف شہریوں کے ''اندرون'' پر ہی وجود رکھ سکتا ہے، اور عوامی زندگی میں نہیں۔ مذہبی تعلیم، مذہبی طبقات، مذہبی تحریکوں کے نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی......اور نہ ہی ریاست کی طرف سے، مذہب کے ایسے عوامی بیانات کو تحفظ دینے کیلئے، یو ایس کے آئین کی پہلی ترمیم کی طرح کی کوئی چیز......

صرف دو دہائیوں کے اندر، ۱۹۲۵ سے ۱۹۴۵ تک، کمالی نصب العین نے ترکی معاشرے کے ''مرکز'' پر کامیابی سے غلبہ پالیا، جس میں افسر شاہی، عساکر، عدلیہ اور یونیورسٹیاں شامل تھیں۔ موخر الذکر کی تطہیر ۱۹۳۳ کی یونیورسٹی اصلاحات سے عمل میں لائی گئی، جس میں اُن پروفیسروں نے جنہوں نے کمالی نظریے سے اختلافات کیا......بشمول ''ترکی نسل'' کی۔ آریائی اصل کے بارے میں غیر سائنسی نظریات کے اپنی ملازمتیں کھو دیں۔ استنبول یونیورسٹی میں تقریباً دو تہائی علما کو ''پسماندہ ذہن'' سمجھا گیا اور عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔

کیونکہ معاشرے کا ''مرکز'' سیکولر پسندوں سے اس قدر مغلوب ہو گیا، لہٰذا اسلام صرف ''مضافات'' میں زندہ رہنے کے قابل ہو گیا......دیہاتی علاقوں، چھوٹے قصبوں، اور نچلے طبقات میں(۴) نتیجۃً عثمانی طبقہ بالا کی زیادہ شائستہ اسلامی روایت غائب ہو گئی، جبکہ مذہب کم تعلیم یافتہ عوام کے کلچر کا ایک حصہ بن گیا۔ نتیجۃً کئی دہائیوں تک طبقۂ بالا کے سیکولر ترک یہ سمجھتے تھے کہ ایک عملی

MashalBooks.org

مسلمان بننا کوئیلو (Koylii) ۔ دہقان بننے کے مترادف تھا۔

لیکن پھر بھی، عثمانیہ طبقہ بالا کی طرف سے پروان چڑھائے گئے آزادی پسندانہ نظریات نے ریپبلکن تُرکی میں اپنی راہ پالی۔ اور اس پُل کو تعمیر کرنے میں کوئی بھی شخص ایک غیر معمولی کُرد۔ ترکی عالم سیدنورسی سے زیادہ بااثر نہیں ہے۔

سعید نُورسی، ''زمانے کا معجزہ''

۱۸۷۸ میں، مشرقی اناطولیہ کے ایک غریب قصبے نورس میں (جہاں سے اُس کا خاندانی نام ظہور میں آیا) میں پیدا ہونے والا، نوجوان سعید ایک، پُرجوش اور ذہنی طور پر متجس طالبعلم تھا۔ اُس نے قرآن، احادیث اور دوسرے اسلامی ذرائع کی تعلیم اپنے علاقے کے مدرسوں میں حاصل کی۔ اس کے اساتذہ اُس کی تیز یادداشت اور ذہانت سے اس قدر متاثر تھے کہ اُنہوں نے اُسے ''بدیع الزمان'' (وقت کا معجزہ) کا نام دیا، جو جلد ہی اُس کا عُرف بن گیا۔

پندرہ سال کی عمر میں، سعید ایک کتاب جس کا عنوان رویا (خواب) تھا، سے گہرے طور پر متاثر ہوا، جو کہ آزادی کو ایک تمثیلی خراجِ تحسین تھا، جو دو دہائیاں قبل نامک کمال نے لکھی تھی، جو کہ وہ مشہور نوجوان عثمانی ہے جس کا تعارف باب ۶ میں کرایا گیا ہے۔ اس کتاب میں، اسلامی آزادی پسند کمال نے آزادی کی تصویر ایک خوبصورت پری کی طرح کھینچی، جو آسمانوں سے اُترتی ہے، تمام عثمانی شہریوں کو آمرانہ حکومت سے نجات دلاتے ہوئے اور اُنہیں، حقوق، ترقی اور دولت سے نوازتے ہوئے۔ سعید اس خواب سے گہرے طور پر متاثر ہوا۔ کئی سال بعد اُس نے لکھا، ''پھر میں کمال کے خواب (The Dream) کے ساتھ بیدار ہوا۔'' (۵)

لہٰذا، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں، اپنے بلوغت کے دنوں سے لے کر ۱۹۶۰ میں اپنی وفات تک، سعید نورسی کیلئے آمرانہ حکومت کی مخالفت اور آزادی اور جمہوریت کے ساتھ وفاداری، اہم موضوعات رہے...... اور اُس کے لاکھوں پیروکار جو جمہوریہ ترکیہ میں اُبھرے۔

نورسی کیلئے ایک اور اہم دلچسپی جدید سائنس تھی، اُس کے وقت کے مدرسے قدامت پسند اور الگ تھلگ ادارے تھے صرف اسلامی علوم پڑھائے جاتے تھے، نہ کہ جدید علوم جیسا کہ طبعیات، کیمیا اور حیاتیات۔ جدید علوم اُن فرانسیسی طرز کے اسکولوں میں پڑھائے جاتے تھے، جو

اُنیسویں صدی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ نے کھولے تھے۔ لیکن ان جدید اداروں کے کچھ فارغ التحصیل، نہ صرف سائنس کے بلکہ سائنسیت کے پیروکار بن رہے تھے...... یعنی اُس تصوّر کے کہ سائنس ہر چیز کیلئے ایک حتمی رہنما ہے اور مذہب کا بدل ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں کلاسیکی اسلامی تعلیم بغیر سائنس کے مذہب پڑھا رہی تھی، وہیں، جدید سکول بغیر مذہب کے (بلکہ اس کے خلاف) سائنس پڑھا رہے تھے۔

نورسی نے سوچا، کہ اس کا حل، نئے نصاب کے ساتھ نئے مدرسے کھولنا تھا اُس نے جدید اسلامی یونیورسٹی کیلئے بھی منصوبہ بنایا۔ نومبر ۱۹۰۷ میں وہ سارا سفر طے کرتا ہوا، سلطان عبدالحمید دوم سے ذاتی طور پر گفتگو کرنے اور اُس کی اشیر باد حاصل کرنے کیلئے استنبول گیا۔ سلطان کے سیکرٹریوں نے، اس دیہاتی کُرد کی خواہش اور اعتماد پر حیران ہوکر، یہ سوچا کہ، یہ شخص اپنے ہوش وحواس سے باہر ہے کہ عظیم خلیفہ کے ساتھ نجی گفتگو کی درخواست کر رہا ہے۔

لہٰذا نورسی وہ سرکاری مدد حاصل کرنے میں ناکام رہا جو وہ اپنے منصوبے کیلئے حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن اگلے برسوں نے جو اس نے سلطنت کے دارالخلافہ میں گزارے، اُس کی سوچ اور اُس کی شُہرت میں اضافہ کیا۔ اس عرصے کے دوران دوسرے آئینی دور...... یا حریّت (آزادی) جیسا کہ اس وقت اُسے کہا جاتا تھا...... کا اعلان کیا گیا، اور عثمانی پارلیمان کا اجلاس، تعطّل کی تین دہائیوں کے بعد، دوبارہ بلایا گیا۔ نورسی جلد ہی، آزادی کے نصب العین کے اسلامی حامی کے طور پر مشہور ہوگیا۔ اُس نے استنبول میں موثر تقاریر کیں، اور مشرق میں کُردوں کے بزرگوں کو درجنوں تار بھیجے، جو سب کے سب آئین پرستی، نمائندہ جمہوریت، اور آزادی فکر کا دفاع کرتے تھے۔ (۶)

جب سلطنتِ عثمانیہ جنگِ عظیم اوّل میں داخل ہوگئی، تو نورسی نے، اپنے طلبہ کے ہمراہ ہتھیار اُٹھالئے، مشرقی سرحد کو روسی فوج سے محفوظ کرنے کیلئے...... صرف جنگی قیدی کے طور پر گرفتار ہونے کیلئے...... اپنی رہائی کے جلد ہی بعد، وہ اُس جدید مدرسہ کے قیام کیلئے کوشش کرنے کیلئے جس کا وہ کئی دہائیوں سے خواب دیکھ رہا تھا، مشرقی ترکی واپس چلا گیا لیکن مقدر کے اُس کے لئے کچھ اور ہی منصوبے تھے۔

۱۹۲۵ میں، علاقے میں ایک کُرد بغاوت پھوٹ پڑی اور کمالی حکومت نے نہ صرف

MashalBooks.org

بغاوت کے مرتکبین کو بلکہ دوسرے بہت سے کُرد معززین کو بھی سزا دی، اور اُنہیں اناطولیہ کے مغربی علاقوں میں ''دوبارہ آباد کیا''۔ نورسی جس نے بغاوت کی مخالفت کی تھی، کو اسپارٹا صوبے کے ایک گاؤں میں جلاوطن کر دیا گیا جو کہ مغربی ترکی کے وسط میں واقع تھا۔ یہاں اُسے غور و فکر کا کچھ وقت ملا اور آخرِ کار اُس نے زندگی میں ایک نیا نصب العین متعین کر لیا۔ اس ''نئے سعید'' نے تمام سیاسی معاملات کو نظر انداز کر دیا اور اپنے آپ کو اسلام کے عقیدے کو لادینی تصوّرات اور زمانے کی ترغیبات سے بچانے کیلئے وقف کر دیا۔

جلد ہی، نورسی نے اپنے مشہور ''مکتوبات'' لکھنا شروع کر دیتے، جنہوں نے اگلی دہائیوں کے دوران، درجن بھر سے زیادہ جلدوں کو اسلام کی مدلّل مدافعت سے بھر دیا۔ اس کا واحد مقصد ''مسلمانوں کے شعور کو بلند کر کے خُدا کو واپس لانا تھا'' اُس مکمل سیکولر ہوموکمالیکس (Homo Kemalieus) کے تقابل میں جسے حکومت تخلیق کرنا چاہتی تھی۔ (۱) جتنا زیادہ نُورسی لکھتا جاتا تھا، اُتنا ہی زیادہ وہ سرکاری غیض و غضب کو دعوت دیتا جاتا تھا۔ نتیجتہً اُس نے سارا ''یک جماعتی دور'' (۱۹۲۵۔۵۰) قید میں گزارا، یا گھریلو قید میں، یا ترکی کے دور دراز حصوں میں جلاوطنی کی کسی نہ کسی شکل میں۔ اُس کے پیروکار، جنہوں نے خفیہ طور پر اُس کی تصانیف کو ہاتھ سے لکھا، تقسیم کیا، اور اُن کی نقل کی، ''نور کے طلبہ'' کے طور پر مشہور ہو گئے (یا نُورکوس کے نام سے)

نُور تحریک نہ صرف مکمل طور پر غیر تشدّد پسندانہ تھی، بلکہ مستقل مزاجی سے غیر سیاسی بھی تھی۔ ''سیاست کے ذریعے مذہب کی خدمت کرنا فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوتا ہے'' ایک نُور کے متن میں یہ استدلال کیا گیا ہے، اور وہ ''انقلابی اسلامی نقطۂ نظر کو مسترد کرتا ہے، جو معاشرے کی صورت گری اوپر سے کرنا چاہتا ہے اور جو تشدد کو جائز قرار دیتا ہے۔'' یہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ''اسلام کی خدمت کرنے کا بہترین طریقہ مذہب کی سچائیوں کی وکالت کرنا ہے۔'' (۸)
لیکن کمال ازم کیلئے یہ بھی ناقابلِ قبول تھا...... لہٰذا ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کی دہائیوں کے اخبارات میں ایسی کہانیاں، رپورٹ کی گئیں، جو نُور کو باز گردوں کے بارے میں ہوتی تھیں، جو پولیس کی طرف سے ایسے ''غیر قانونی سامان'' کے ساتھ گرفتار کر لئے جاتے تھے، جیسا کہ کتابیں، دوورقے، نقل کرنے والی مشینیں، اور نماز کی ٹوپیاں۔

نُور تحریک ۱۹۵۰ میں، صرف ایک گہرا سانس لینے کے قابل ہو سکی، جب چوتھائی صدی

پُرانی کمالی حکومت کا تختہ، جمہوری دور کے پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میں اُلٹ دیا گیا۔ نیا وزیر اعظم عدنان میندریس تھا، جس کی ڈیموکریٹ پارٹی (ڈی پی) کا مشہور نصب العین تھا'' کافی ہو چکا! اب بولنے کی قوم کی باری ہے'' ڈی پی، پروگریسوری پبلکن پارٹی (پی آر پی) کے کچھ آزادی پسندانہ تصورات کی وارث تھی، جسے ۱۹۲۵ میں بند کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ مذہب کے بارے میں زیادہ روادار اور مودّب، کُردوں کے بارے میں زیادہ نرم، اور آزاد منڈی کی سرمایہ داری کی زیادہ حامی تھی۔ مینڈریس، جس نے ترکی کو ''چھوٹا امریکہ بنانے کا وعدہ کیا تھا، نے جلد ہی مارشل پلان کو قبول کر لیا، ترکی فوجوں کو کوریائی جنگ میں بھیجا اور نیٹو میں شمولیت اختیار کر لی۔ اُس نے معاشی ترقی کا ایک ہلا بھی پیدا کیا، جس نے اُسے یکے بعد دیگرے تین انتخابی کامیابیوں سے ہمکنار کیا...... دوسری کامیابی ستاون فیصد ووٹوں سے، اور ترکی کی سیاسی تاریخ میں ایک بلا مقابلہ ریکارڈ کے ساتھ۔

لیکن کمالی ''مرکز'' ......افسر شاہی، فوج، عدلیہ اور یونیورسٹیاں......مینڈریس کو رجعی انقلاب کا رہنما سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرتے تھے، وزیرِ اعظم کے مفروضہ بُرے اعمال میں سے ایک اُس کا مذہبی رہنماؤں، بشمول سعید نورسی کے، اچھا رویہ تھا۔ اُس نے، جنوری ۱۹۶۰ میں پارلیمان میں کمال کے پیروکاروں کو، جو غصے سے یہ سوال کر رہے تھے کہ نورسی کو ملک میں ادھر اُدھر آزادانہ گھومتے پھرنے کی آزادی کیوں دی گئی ہے، یہ جواب دیا آپ اس زاہد آدمی سے کیا چاہتے ہیں جس نے اپنی پوری زندگی مذہب کیلئے وقف کر دی؟'' (۹)
اس کا جواب چار ماہ بعد ۲۷ مئی ۱۹۶۰ کو آیا، جب ترکی فوج نے انقلاب برپا کیا، مارشل لا یا لگایا، اور ڈی پی کے سینکڑوں ارکان کو یاسیادا میں، جو کہ استنبول کے مضافات میں ایک جزیرہ تھا، قید میں ڈال دیا۔ فوجی حکومت نے جلد ہی ایک دکھاوے کی قانونی کاروائی کی، جس نے میندریس اور اُس کے دو وزرا کو پھانسی کی سزا سُنائی، اُن خیالی جرائم کیلئے جن میں ''مذہبی رجعت پسندوں کو اقتدار دینا'' بھی شامل تھا۔ ۱۷ استمبر ۱۹۶۱ کو، ترکی تاریخ کے مقبول ترین وزیر اعظم، عدنان میندریس کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا...... کچھ احوال کے مطابق، سپاہیوں کی طرف سے پیٹنے اور گالیاں دینے کے بعد......(۱۰) باقی ماندہ ڈی پی کے سیاستدانوں کو لمبی مدّت کی قید کی سزا دی گئی۔
برسرِ اقتدار جرنیلوں کو ایک اور کام کی طرف بھی توجہ دینا تھی۔ نورسی انقلاب سے دو ماہ پہلے

MashalBooks.org

فوت ہو چکا تھا۔ عُرفہ کے مشرقی شہر میں اور وہیں وطن ہو چکا تھا، اُس کی قید جو کہ پورے ملک سے زائرین کیلئے کشش رکھتی تھی، فوجی گروہ اور اس کے مقاصد کے خلاف مزاحمت کی ایک علامت بن سکتی تھی۔ لہٰذا ۱۲ جون ۱۹۶۰ کی رات کو، ایک سکواڈرن عرفہ میں داخل ہوا، کرفیو نافذ کیا، شہر کے گرد ٹینک تعینات کئے، اور نورسی کی قبر کی طرف بڑھے۔ سنگِ مرمر کے مقبرے کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، نورسی کی باقیات کو مٹایا گیا، ایک فوجی جہاز پر ڈالا گیا، اور جہاز کو باہر کی طرف اُڑا دیا گیا، تاکہ اُسے اناطولیہ میں کسی جگہ ایک خفیہ مقام پر دوبارہ دفن کیا جا سکے۔ اُس کی آخری آرام گاہ ابھی تک نامعلوم ہے۔

اُس فوجی گروہ نے، جس نے ۱۹۶۰ کا انقلاب برپا کیا، جلد ہی ایک نئے آئین کا مسوّدہ تیار کیا، اور کثیر الجماعتی سیاست کی واپسی کی اجازت دے دی، لیکن اس نے بھی ایسے اقدامات کئے، یہ یقین دہانی حاصل کرنے کیلئے کہ نئی ریاست ایک نیم جمہوریت ہوگی، تاکہ حقیقی جمہوریت: منتخب سیاستدانوں کو زیرِ مشاہدہ رکھا جائے گا، اور جب ضروری سمجھا گیا، اُن کا تختہ کمالی انتظامیہ کی طرف سے اُلٹ دیا جائے گا۔

اُس کے بعد، ترکی سیاست گھڑیال کے لٹکن کی طرح ہوگئی، جو آمریت اور جمہوریت کے درمیان جھولتا رہا۔ اور جہاں سیکولر پسند آمریت کے فخریہ سرپرست بنے، وہیں اسلامی گروہ زیادہ سے زیادہ جمہوریت کی خواہش کرنے لگا۔

''تُرکی۔اسلامی غیر معمولی پن'' کی ساخت

سعید نُورسی کی مختصر تاریخ، ترکی اسلام کے غیر معمولی پن کی وضاحت کرنے میں مدد کرتی ہے، جو، ترکی ماہر عمرانیات شریف مارڈن کے مطابق، ہمعصر مغربی علما کی طرف سے اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے، کیونکہ ان کی ''توجہ عرب یا سلفی اسلام پر مرکوز رہتی ہے'' (۱۱)

اس غیر معمولی پن کا ترکی کی سیاست تاریخ سے کی انفرادیت سے بہت زیادہ تعلق ہے، جس نے وہ حالات پیدا کئے جن کا جدید دور کی دوسری مسلمان اقوام کو تجربہ نہیں ہوا۔ سب سے پہلے، دوسرے بہت سے مسلمان ممالک کے برعکس، ترکی کبھی یورپی اقوام کے سامراج کے تحت نہیں رہا۔ ترکی کے مسلمانوں کیلئے اس کا مطلب یہ تھا کہ ''دوسرا'' لازمی طور پر مغرب نہیں تھا، جیسا

کہ بہت سے عرب اور ہندوستانی/پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ معاملہ تھا۔ ترکی اسلام کے لئے ''دوسرا'' گھر کا پیدا کیا ہوا آمریت پسندانہ سیکولرازم تھا۔ درحقیقت ۱۹۹۰ کی دہائی کے بعد سے مغرب ترکی مسلمانوں کو ایک اتحادی محسوس ہوتا تھا، کیونکہ یہ ترکی کے اپنے طرز کے سیکولرازم کی طرف سے، ظاہر کئے جانے والے احترام سے، کہیں زیادہ مذہبی آزادی کا احترام کرتا تھا۔

دوم، اگرچہ ترکی کے سیکولر پسند بلا مبالغہ آمریت پسند تھے، لیکن بہر حال وہ مسلم دُنیا میں دوسروں کی نسبت زیادہ حدود کے پابند اور کم آمرانہ تھے، جیسا کہ ایران کے دوشاہ، اور عرب دُنیا کے سیکولر آمر تھے۔ ان ممالک کے برعکس، ترکی کے ہاں آئینی اور پارلیمانی حکومت کی روایت تھی، جس کی جڑیں اُنیسویں صدی کی عثمانی اصلاحات میں تھیں۔ نتیجے کے طور پر، کمالی آزادانہ انتخابات کو ہمیشہ کیلئے نہ ٹال سکے، اور اُنہیں نظریاتی بحالی کے ہر دور کے بعد کثیر جماعتی سیاست کو قبول کرنا پڑا۔

اس کا مطلب ہے کہ، ترکی میں ایک نیک مسلمان کیلئے، جو حکومت کے ہاتھوں جبر محسوس کرتا تھا، سُرنگ کے اخیر پر ضرب المثل روشنی ووٹ کا ڈبہ تھا، جو بار بار بالکل قدامت پسند سیاسی جماعتوں کو برسرِ اقتدار لا رہا تھا، جیسا کہ ڈی۔پی کو۔ لیکن ایران میں، جہاں شاہ کے کٹڑ پن نے جمہوری سیاست کیلئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی، واحد حل انقلاب تھا۔ مصر اور الجیریا میں، جہاں جمہوریت نہ تو گہری جڑیں رکھتی تھی نہ اُسے پھلنے پھولنے کی اجازت تھی، تو واحد اختیار، کم از کم کچھ لوگوں کیلئے، جہاد تھا۔

جدید ترکی اسلام کے غیر معمولی پن میں حصہ ڈالنے والا ایک تیسرا عامل، کمیونزم سے اس کی شدید نفرت تھی، ایک ایسا تنفر جس کی عرب دُنیا میں مثال نہیں ملتی۔ اس کی دو توجیہات تھیں ......اوّل سرد جنگ کے آغاز سے ہی، ماسکو نے یہ ثابت کیا تھا کہ اُس کے ترکی کو نقصان پہنچانے کے کچھ منصوبے تھے، سوویت حملے کا تصور، روسی۔ عثمانی دشمنی کی واضح یادوں کو تازہ کرتے ہوئے، بہت سے ترکوں کیلئے بشمول، اسلامی دیندار لوگوں کے ڈراونا خواب بن گیا۔ دوم، ترکی مارکسی بایاں بازو، جو ۱۹۵۰ کے بعد سے ایک بھیانک قوّت بن گیا تھا، شدید طور پر مذہب مخالف تھا۔ لہٰذا، پوری سرد جنگ کے دوران، ترکی کے زیادہ تر مسلمانوں کیلئے، دشمن ''بے خُدا کمیونزم'' تھا، جبکہ مغرب، خاص طور پر امریکہ کہیں زیادہ قابلِ قبول نظر آتا تھا۔ ایک ہر دلعزیز اسلامی عالم نے

MashaiBooks.org

۱۹۶۹ میں لکھا ''امریکی خُدا پر یقین رکھتے ہیں'' وہ ہمارے مذہب کا احترام کرتے ہیں، وہ اہلِ کتاب ہیں: لیکن سُرخے کافر ہیں'' (۱۲)

سعید نورسی اس موقف کا مثلِ اولیٰ تھا۔ اس کے خطوط کمیونزم کی مذمت سے بھر پور تھے۔ جسے وہ فلسفیانہ مادیت پرستی کا سیاسی نتیجہ سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے ڈی پی کی حکومت کے، کوریا میں افواج بھیجنے کے فیصلے کی حمایت کی، تاکہ وہ ''سُرخوں'' سے لڑیں، اور اُس نے اپنے ایک طالب علم کو ایک رضاکار کے طور پر بھرتی ہونے کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ وہ جارحانہ الحاد کے خلاف مسلم عیسائی اتحاد بنانے کی بھی اُمید کرتا تھا۔ ۱۹۵۰ میں، اُس نے اپنی تصانیف کا ایک مجموعہ پوپ پائیس دوازدہم کو بھی بھیجا، اور فروری ۱۹۵۱ کو شکریے کا ایک ذاتی خط بھی وصول کیا۔ دو سال بعد، نورسی نے، توحید و رسالت ماننے والوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ کرنے اور سیکولر دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں تعاون طلب کرنے کیلئے، عالمی اسقفِ اعظم ایتھنا گوراس (Athenagoras) سے استنبول میں ملاقات کی۔

نورسی کی فکر کے یہ تمام پہلو...... جمہوریت کی حمایت، آزاد دُنیا کیلئے ہمدردی، اور بین المذاہب تعاون میں دلچسپی ......کو اُس کے لاکھوں پیروکاروں کی طرف سے یاد رکھا جائے گا، جنہوں نے اُس کی وفات کے بعد نُور تحریک کو زندہ رکھا۔ (۱۳) ان میں سے، ایک کرشماتی، مبلغ فتح اللہ گولن (Fethullah Gulen) نورسی کے ورثے کو مزید وسعت دینے والے اور اسے ایک عالمی تحریک میں تبدیل کرنے والے تھے، سکولوں کے ایک موثر جال، غیر سرکاری تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہائے اظہار کے ساتھ۔

تُرکی اسلام پسندی کا ظہور

نورسی (اور بعد میں گولن) کی تحریک، جدید ترکی میں اسلام کی ایک بڑی شاخ بن گئی، لیکن یہ یقیناً واحد شاخ نہیں تھی۔ دوسری شاخ سرکاری اسلام تھا، جو حکومت کے مذہبی معاملات کے ڈائریکٹوریٹ (اختصار کے طور پر دیانت) کے تحت منظّم کیا گیا، جو خلافت کے تحت منظّم کئے گئے عثمانی اداروں کی جگہ لینے کیلئے ریپبلکن حکومت کی طرف سے ۱۹۲۴ میں تشکیل دیا گیا۔ یہ ترکی کے سیکولرازم کی حیرت انگیز عجیب چیزوں میں سے ایک تھی: یہ مذہب اور ریاست کی علیحدگی کے

بارے میں نہیں تھی، بلکہ ریاست کی طرف سے مذہبی غلبے کے بارے میں تھی۔ کمال ازم شہریوں کو اس قدر سیکولر بنانا چاہتا تھا جس قدر ممکن ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن کے عقائد پر بھی کنٹرول رکھنا چاہتا تھا۔

یہ بات بہت حیران کُن نہیں ہے، کہ سرکاری طور پر حمایت یافتہ دیانت ایک خشک اور بے کیف افسر شاہی بن گئی، جو صرف مسجد کی خدمات کا انتظام کرتی تھی اور رسومات اور تقریبات کو منظّم کرتی تھی، لیکن یہ کسی بھی شخص میں بمشکل کوئی جذبہ پیدا کرتی تھی۔ یہ صورتِ حال تبدیل نہ ہوئی۔ تاآنکہ اکیسویں صدی کا آغاز آ گیا، جب یہ تنظیم نئی قیادت اور اُس سیاسی حمایت کی مہربانی سے جو اس نے اسلام کی حامی اے کے پی کی حکومت سے حاصل کی، زیادہ خود اعتماد اور بابصیرت ہو گئی۔

ترکی اسلام کی تیسری شاخ، طریقتوں کے ایک متنوع گروہ کی طرف سے (تشکیل دی گئی) یا صوفی سلسلوں کی طرف سے تشکیل دی گئی جو عقائد کے روایتی سُنی ضابطوں کے حامل تھے۔ سب سے بڑی طریقت نقشبندیوں کی تھی۔ جو ذاتی پرہیزگاری اور اشتراکی خلاقیات پر زور دیتے تھے۔ وہ نورسی کی خُدا خوفی پر ارتکاز میں شریک تھے، لیکن لازمی طور پر اُس کے جدید عقلی اور آزادی پسندی کے رُجحان میں بھی نہیں۔ دونوں شاخوں کے درمیان فرق پہلی نظر میں ہی واضح تھا۔ ایک مخصوص نورکو کی مونچھیں ہوتی تھیں لیکن داڑھی نہیں، وہ سوٹ اور ٹائی پہنتا ہے، اور فطرت میں خُدا کے مظاہر کی بات ایسے کرتا ہے کہ جدید سائنس حمایت کرتی ہے۔ طریقت کا رُکن ایک لمبی داڑھی رکھتا ہے، مغربی انداز کی ٹائی سے احتراز کرتا ہے، اور بارھویں صدی کی مستند شخصیات ، جیسا کہ امام الغزالی اور عبدالقادر الگیلانی، سے حوالے بیان کرتا ہے۔

۱۹۶۰ کی دہائی کے اواخر میں نورکوؤں اور طریقتوں کے درمیان اختلافات نے اپنے سیاسی مُثنیٰ تلاش کر لئے۔ نورسی کے بہت سے پیروکاروں نے مرکزی دائیں بازو کی حمایت جاری رکھی، جس کی نمائندگی اب جسٹس پارٹی (JP) کرتی تھی۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ کالعدم ڈیموکریٹ پارٹی کی پیروی کرتی ہے لیکن جے پی کے رہنما، سلیمان ڈیمرل کو (جس کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ ایک فری میسن ہے)، وہ اعتماد کبھی نہیں ملا جو مینڈریس کو حاصل تھا۔ لہٰذا طریقتوں نے ایک اور نعم البدل کی تلاش کی، جسے اُنہوں نے ملی گوروش (Milli Gorus) (قومی نقطۂ نظر) تحریک میں

MashalBooks.org

پالیا، جس کی قیادت نجم الدین اربکان کرتے تھے، جوکہ ایک سابق انجنیئر تھے اور نقشبندی طریقت کے ایک رُکن تھے۔

وہ ''قوم'' جس کا حوالہ اربکان کی تحریک نے دیا وہ ''اُمّہ'' تھی۔ یعنی مسلمانوں کی عالمی اسلامی برادری۔ بطور ایک مذہبی برادری کے، اُمّہ فطری طور پر تمام مسلمانوں کو عزیز تھی، لیکن اربکان نے اس کا تصوّر بطور ایک سیاسی برادری کے بھی کیا لہٰذا، اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ ترکی، ایک ''اسلامی یونین'' اور ''ایک اسلامی نیٹو'' تشکیل دینے کیلئے تمام مغربی اتحادوں سے دستکش ہوجائے۔ کامن مارکیٹ یورپین یونین کے ایک پیش رو کے طور پر، ''بین الاقوامی صیہونیت'' کی ایک سازش کے طور پر، بیان کرتے ہوئے، اُس نے ''معاشی طور پر آزاد'' ترکی کا، اور ریاست کی تحریک یافتہ، صنعتی پیش قدمی کا وعدہ کیا۔

یہ تمام خیالات ''دائیں'' سے زیادہ ''بائیں'' معلوم ہوتے تھے، لہٰذا اربکان کی نیشنل سیلویشن پارٹی (ایم ایس پی) کو ۱۹۷۴ میں، اُس وقت کی سوشلسٹ ریپبلکن پارٹی، جس کی قیادت بلند ایجوت کے ہاتھ میں تھی، کے ساتھ مل کر اتحادی حکومت تشکیل دینے میں کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔ اس مختصر اسلامی سوشلسٹ اشتراک کے ناقدین مذاق سے اسے ''تربوزی اتحاد'' کہتے تھے: باہر سے سبز، اندر سے سُرخ۔

اربکان کا مرکزیت پسند، مغرب مخالف، صیہونیت مخالف اور بلکہ سامی مخالف پیرایہ بیان، شرقِ اوسط کی اسلام پسند تحریکوں، جیسا کہ مصر میں اخوان المسلمون کے زیادہ قریب تھا، بہ نسبت عثمانی دور کے اسلامی آزادی پسندوں اور نورکوؤں کے نقطۂ نظر کے، جنہوں نے موخرالذکر کی وراثت کے نشانات کو محفوظ رکھا۔ لہٰذا یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا کہ انتہائی قدامت پسند طریقتوں کے علاوہ، اربکان کے جہاز کے بادبان، ۱۹۷۰ کی دہائی کی نوزائیدہ اسلام پسند تحریک سے بھرے ہوئے تھے، جوکہ مودودی اور قطب جیسے اسلامی نظریہ سازوں کی ترجمہ شدہ تصانیف سے متاثر تھے۔ اس تحریک نے نورسی کی تصانیف کو ''پھولوں اور کیڑوں'' کی طرح رد کردیا مرکزی دائیں بازو کی اس کی امریکا پرستی کی وجہ سے مذمت کی اور یا اربکان کی حمایت کی، یا آخری انتہاؤں میں سے کسی بھی جماعتی سیاست کو مسترد کرتے تھے، جمہوریت کو ''کفر کا سسٹم کہتے ہیں''۔

اُس وقت کے نوجوان ترکی اسلام پسندوں میں سے ایک، محمد میتیز (Mehmet

Metiner) جس نے کئی سال بعد اس نظریے کو ترک کردیا، اور اپنے آپ کو نئی تعریف بطور ایک مسلم ''جمہوریت پسند'' کے دی، اپنے ۱۹۷۰ کے ساتھیوں کی ذہنی ساخت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم سے پہلے والی نسل یہ یقین رکھتی تھی کہ اُنہیں، کمیونسٹ خطرے کے ہوتے ہوئے امریکہ کے ساتھ کھڑا ہونے کی ضرورت ہے......لیکن ہماری نسل مختلف ہے، ہم ریاست ہائے متحدہ اور مغرب کو کافر سمجھتے ہیں، اور اسے سامراج پسند سمجھتے ہیں، جنہوں نے اسلامی دُنیا کو، اُن کٹھ پُتلی حکومتوں کے ذریعے، جو اُنہوں نے مسلم ممالک میں پیدا کی تھیں سامراج کے تحت رکھا ہوا ہے۔''(۱۴)

میتیز مزید ذکر کرتا ہے کہ، وہ ''اسلامی سوشلزم'' کی مہربانی سے، سوشلسٹ تصورات سے ہمدردی رکھنے لگا تھا، جو مصطفیٰ سباعی کی طرف سے لکھی گئی تھی، جو اخوان المسلمون کا ایک نظریہ ساز تھا۔ وہ مزید کہتا ہے کہ اُس نے اور اس کے اسلام پسند دوستوں نے عثمانی وراثت کو غیر دلچسپ پایا اور لہٰذا وہ کبھی ''عثمانی'' نہیں رہے۔''(۱۵)

اس مفہوم میں، ترکی میں اسلام پسندی، کم از کم جزوی طور پر، کمال ازم کا غیر ارادی نتیجہ تھا۔ موخرالذکر کے عثمانی روایت کے خلاف جذبے نے اسلامی فکر کو کمزور کردیا، یہاں تک کہ اس کے معتدل ترین کو بھی دبا کر رکھا (جیسا کہ نُور تحریک کو)، اور ایک ایسا خلا پیدا کردیا، جسے غیر ملکی اصل کی انتہا پسند اسلام پسندی ہی پُر کرسکتی تھی۔ ۱۹۶۰ کے انقلاب نے، ڈیموکریٹ پارٹی کو تباہ کر کے، اس خلا میں اپنا حصہ ڈالا، جس کی مرکزی دائیں بازو کی چھتری، تقریباً پورے اسلامی گروہ کو متحد کئے ہوئے تھی۔ اگر مینڈریس، سیاسی طور پر اور حقیقی طور پر زندہ رہتا تو اربکان اور اُس کی ملی گوروش کو غالباً سامعین نہ ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی مورّخ، احمد یشر جک (Ahmed Yasar Ocak) جوکہ ترکی اسلام کے ایک قابلِ احترام ماہر ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کے انتہا پسند اسلام پسندوں کو، انتہا پسند سیکولر پسندوں کے ''ناجائز بیٹے'' سمجھا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترکی ہیروڈیوں نے غیر ارادی طور پر ترکی زیلٹ تخلیق کرنے میں مدد دی۔(۱۶)

اُوزال انقلاب......اور ''تین آزادیاں''

۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ کو، جب مرکزی دائیں بازو کی جسٹس پارٹی برسرِ اقتدار تھی، ترکی کو ایک اور فوجی انقلاب کا سامنا ہوا، وہ وحشیانہ انقلاب جس کا ذکر اس کتاب کے تعارف میں کروایا گیا ہے۔

MashalBooks.org

جب جرنلوں نے دوبارہ ۱۹۸۳ میں قومی انتخاب کا شیڈول پیش کیا، تو اُنھوں نے صرف نو واردوں کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دی۔ ترگت اوزال، جو کہ ایک سابقہ سرکاری افسر اور ماہر معاشیات تھے، کامیاب ہوئے، اور اُس کی نئی تشکیل شدہ مدرلینڈ پارٹی اقتدار میں آ گئی۔ اگلے دس سال ''اُوزال کی دہائی'' تھے، آزادی پسندی کے ایک انقلابی دورنے، جس کے دوران اسلامی آزادی پسندانہ امتزاج، جو کہ کئی دہائیوں کے جبری نسیان کے بعد دبا دیا گیا تھا، دوبارہ جنم لیا۔

نقشبندی خاندان کے فرد کی حیثیت سے، اوزال اسلام میں پُختہ یقین رکھنے والا تھا۔ ورلڈ بینک اور پرائیویٹ سیکٹر کے سابق ملازم ہونے کی حیثیت سے، وہ آزاد مارکیٹ اور سرمایہ داری میں حقیقی یقین رکھتا تھا، اور وسیع تر مفہوم میں امریکی تصوّرِ آزادی میں۔ امریکی صحافی رابرٹ کپلان (Robert Kaplan) کے الفاظ میں، اوزال ''قرآن کی تلاوت کرنے اور سوپ اوپرا دیکھنے کو بہت پسند کرتا تھا۔ صوفی مسجد میں اپنا سر قالین کے ساتھ مارنے کو، اور ٹپک اس بار بی کیوز میں جانے کو بھی پسند کرتا تھا'' (۱۷) یہ اس بات کی وضاحت کرنے میں مدد کرتا ہے کہ اتاترک سے لے کر سب سے زیادہ دور اس ترکی رہنما کے طور پر، وہ کیوں ''ترکی کے سیاسی خلا میں مذہب کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا، بغیر ملک کے مغرب کے حامی رُخ کو خطرے میں ڈالے'' (۱۸)

اوزال نے اپنی پالیسیوں کو ''تین آزادیوں'' ......خیالات کی، مذہب کی، اور کاروبار کی...... پر استوار کیا، دہائیوں پُرانی، تحفظ پسندی، ''مرکزیت پسندی'' اور ''ایک منصوبہ بند معیشت'' کی کمالی پالیسیوں کو ترک کرتے ہوئے معیشت میں وسعت پیدا ہوئی۔ ضابطۂ تعزیرات میں کچھ آمرانہ شقوں کو، جنھوں نے ''مذہبی پروپیگنڈے'' پر پابندی کر دی تھی اور بہت سے دوسرے ''فکری جرائم'' کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ کُرد زبان پر ظالمانہ پابندیاں'' جنھوں نے کُرد نغموں تک کو جُرم قرار دے دیا گیا تھا، کم از کم جزوی طور پر اُٹھائی گئیں (اوزال نے فخریہ طور پر یہ بھی ذکر کیا کہ اُس کی ماں کُرد تھیں، اور اس طرح'' کے......لفظ'' پر بندش کو ہٹا دیا۔

اوزال نے عثمانیوں کا احترام بھی بحال کرنے کی کوشش کی۔ جو کئی دہائیوں سے سرکاری نظریے میں ایک خوف کی علامت تھی۔ بلکہ اُس نے سلطنتِ عثمانیہ اور ریاستہائے متحدہ کے درمیان کچھ مماثلتیں بھی پائیں، یہ استدلال کرتے ہوئے کہ دونوں نے متنوع طبقات کو اپنے مذہب، کلچر، اور معاشی خواہشات پر عمل کرنے کی آزادی دی۔ ۱۹۸۷ میں، اُس نے یورپی یونین

کو ترکی کی درخواست دی۔ دو سال بعد، وہ صدر بن گیا، لیکن وہ پالیسی کی رہنمائی بذریعہ وفادار وزیرِ اعظم کرتا رہا۔ (ترکی نظام میں، صدارت اعلیٰ ترین منصب ہے، لیکن وزیرِ اعظم کے پاس اختیارات زیادہ ہوتے ہیں)

زیادہ تر کمالی، بلا حیرت، اوزال سے نفرت کرتے تھے، اُسے ایک ایسے انقلاب مخالف کے طور پر دیکھتے ہوئے، جس نے اُن تمام چیزوں کو ختم کر دیا جو اس نے نصف صدی قبل کی تھیں۔ اس حقیقت نے، کہ وہ اسلام اور امریکہ دونوں کا حامی تھا، بعض لوگوں کو، کمالی جمہوریہ کا تختہ اُلٹنے کی مغربی سازش کا شک کرنے پر لگا دیا...... وہ وہم جو ۲۰۰۰ کی دہائی میں اپنے عروج کو پہنچ گیا، جب اسلام کی حامی اے کے پی یورپی یونین کی قسمت آزمائی کی علمبردار بن گئی۔

اوزال کے اپنے بھی چاہنے والے تھے۔ اُن میں سے ایک آزادی پسند دانشوروں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا......جن میں سے زیادہ تر سیکولر تھے لیکن سیکولر پسند نہ تھے......جنھیں کئی دہائیوں تک سیاسی میدان میں، جس پر کمالی ریاست، مارکسی بائیں بازو، اور قوم پرست دائیں بازو کا غلبہ تھا......کی طرف سے دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ اوزال کی حمایت میں ملک کے لاکھوں کُرد بھی تھے۔ جن کی شناخت کو، ریپبلکن دور کے ابتدائی سالوں سے ہی منظّم طریقے سے دبایا گیا تھا۔ اوزال کے حامیوں کا تیسرا اور سب سے بڑا گروہ اسلامی گروہ تھا۔ اُن کے نزدیک، وہ نہ صرف ایک ایسا نجات دہندہ تھا، جس نے حد سے زیادہ سیکولر پسند حکومت کے بوجھ سے نجات دلائی، بلکہ وہ ایک ایسا پہلا وزیرِ اعظم تھا، جس نے مکہ کا حج کیا، وہ وہ شخص تھا جس نے مذہب کو عوامی احترام واپس دلایا۔ نورکوس پہلے ہی گاڑی میں سوار تھے، بلکہ بہت سے طریقوں نے بھی اوزال کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کی مدرلینڈ پارٹی کیلئے ووٹ دیا۔ وہ اس عظیم سیاسی چھتری کو کھولنے کے قابل ہوا، جو عدنان میندریس نے ۱۹۵۰ کی دہائی میں تشکیل دی تھی۔

اوزال کے انقلاب کے ساتھ، اسلامی گروہ کے لوگوں نے بھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا، کہ مذہبی آزادی کی اُن کی آرزو، مغربی طرز کی آزادی پسند جمہوریت اختیار کرنے سے پوری ہو سکتی ہے، بجائے اُس اسلامی اطوبیا کو اختیار کرنے کے، جس کا وعدہ اربکان کرتا رہا تھا۔ اُن میں سے زیادہ تر نے کئی دہائیوں تک کمال ازم کا مشاہدہ کیا تھا، جس نے ترکی کو مغربیانے کا دعویٰ کیا تھا، مغرب کی فطری توسیع کے طور پر۔ یہ چیز اُس وقت تبدیل ہونا شروع ہو گئی، جب ان

MashalBooks.org

اسلامی ترکون نے دُنیا کے بارے میں مزید علم حاصل کیا۔ کچھ نوجوان سر پر سکارف باندھنے والی خواتین، جنہیں ترکی کالجوں سے خارج کر دیا گیا تھا، نے یورپ اور یونائیٹڈ سٹیٹس کی یونیورسٹیوں کا رُخ کیا، جہاں اُنہیں آزادی اور احترام ملا۔ اُن کے شوہروں کو بھی یہی انکشاف ہوا۔ اُن میں سے ایک، ترکی مسلمان نے جو اوزال کے دور میں برطانیہ منتقل ہو گیا، بعد میں لکھا: ''میں ۱۹۹۰ کی دہائی کے آغاز میں ترکی سے انگلینڈ آیا، انقرہ میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد، جہاں ہم کوئی نماز کے کمرے نہیں پاتے تھے...... [اگرچہ] انگلینڈ میں، ہم اُن ...... میں جو خصوصی طور پر مسلمانوں کیلئے یونیورسٹیوں میں مختص کئے گئے تھے، نماز ادا کرنے کے قابل تھے، اور ہمیں انتہائی حیرت ہوئی کہ سرکاری عمارتوں، جیسا کہ ہوم آفس میں، جب ہم اپنے ویزوں کی تجدید کروانے کیلئے درخواست دے رہے تھے (میں بھی ایسے ہی کمرے میں موجود تھا)۔ یہ ہمارے لئے آنکھیں کھولنے والے اور زندگی کو تبدیل کر دینے والے تجربات تھے، اور دوسرے بہت سے ترکی شہریوں کیلئے بھی'' (۱۹)

ان مذہبی ترکوں نے جلد ہی اپنے حقائق کو صحیح کر لیا اُنہوں نے محسوس کیا، کہ آزادی پسند مغرب گھر کے غیر آزادی پسند ''مغرب پرستوں'' سے بہتر تھا۔

ترکی اسلام پسندی کا زوال

اپریل ۱۹۹۳ میں، جب ترگت اوزال چھیاسٹھ سال کی عمر میں اچانک دل کے دورے سے انتقال کر گیا، پورے ترکی سے ہزاروں لوگ ہجوم کر کے استنبول میں اُس کے جنازے پر پہنچے۔ کچھ لوگوں نے ایسے جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے، جن پر لکھا ہوا تھا، ''غیر فوجی صدر'' ''جمہوریت پسند صدر'' اور ''مسلمان صدر'' ...... جو کہ بامعنی تراکیب تھیں، ایک ایسے ملک میں جو ریاست کے زُعما کے طور پر سابقہ فوجی اور کلیتاً سیکولر ناموں کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اوزال کو عدنان میندریس کے مزار کے قریب ایک جگہ پر دفن کیا گیا...... جو اُس نے ۱۹۹۰ میں اپنے پیشرو کے اعزاز میں تعمیر کروایا تھا، جسے تین دہائیاں قبل فوج نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

ترکی سیاست میں اگلے نو سال کو، نومبر ۲۰۰۲ میں اے کے پی کی آمد تک، بعض اوقات ''ضائع شدہ دہائی'' کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے نااہل اور ناکام اتحادوں کا ایک سلسلہ دیکھا، جس

نے آخر کار ۲۰۰۱ میں ملک کو ایک خوفناک معاشی بحران میں دھکیل دیا۔ لیکن اس دور نے بھی کچھ اہم تبدیلیاں پیدا کیں، جنہوں نے اسلامی کیمپ کو تبدیل کر دیا۔

اوزال کی وفات کا ایک نتیجہ مِلی گوروش کی حیات نو تھی، وہ سیاست اسلام پسند تحریک جس کی قیادت نجم الدین اربکان نے کی۔ اوزال کی مدر لینڈ پارٹی کی باگ ڈور محسود یلمیز کے ہاتھ میں آ گئی، جو کہ ایک سیکولر شخصیت تھی۔ جس کے اندر مذہبی رائے دہندگان کیلئے بہت کم کشش تھی۔ اربکان نے خوشی خوشی اس خلا کو پُر کیا، اور اُس کی جماعت ویلفیئر پارٹی نے دسمبر ۱۹۹۵ کے عام انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، جس میں ووٹوں کا ۲۱ فیصد حاصل کیا، جو کہ وہ بلند ترین میزان ہے، جو کسی اسلام پسند پارٹی نے ترکی میں کبھی حاصل کیا۔

اربکان کو مرکزی دائیں بازو کی پارٹی۔ جس کی قیادت تانسو چیلر کرتی تھیں جو کہ اس سے پہلے ترکی کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم رہی تھیں، کے ساتھ ایک اتحاد بنانے کیلئے جون ۱۹۹۶ تک کام کرنا پڑا۔ یہ ثنوی حکومت ایک سال تک رہی، جس کے دوران اربکان کو اپنے تصوّرات میں سے صرف چند کو نافذ کرنے کا موقع ملا، جیسا کہ دوسرے مسلمان ملکوں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنا، اور طریقت کے رہنماؤں کیلئے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر استقبالیوں کی مہمان نوازی کرنا...... جو سب سیکولر انتظامیہ کیلئے صدمے کا باعث تھا۔ لیکن جس چیز نے سیکولر پسندوں کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا وہ اُس کا اندازِ خطابت تھا اور اُس کے پارٹی کے ارکان کا، جو ایک اسلامی حکومت کی نیابت کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اس اسلامی چیلنج کے جواب میں، ۲۸ فروری ۱۹۹۷، کو فوج نے ایک عمل کا آغاز کیا جسے بعد میں ''پس جدید'' انقلاب کا نام دیا گیا۔ جرنیلوں نے پورے کمالی ''مرکز'' کو افسر شاہی عدلیہ، یونیورسٹیوں، اور ''بڑے دھارے'' کے ذرائع ابلاغ...... کو۔ حکومت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے، پھر ویلفیئر پارٹی کو بند کرنے، اور آخر کار اسلامی گروہوں اور اُن کے ذرائع پر دھاوا بولنے کیلئے منظّم کیا۔ جون ۱۹۹۷ میں جرنیلوں نے ''پسماندہ ذہنیت کی حامل'' (یعنی بہت زیادہ مذہبی) کمپنیوں کی ایک طویل فہرست کا اعلان کیا، اور اُن کی پیداواری اشیا کے بائیکاٹ کی ترغیب دی۔ بعض اسلامی رہنماؤں کو ''سیکولر مخالف تنظیمیں قائم کرنے'' کی وجہ سے مقدموں میں ڈالا گیا۔ بعض ناپسندیدہ صحافیوں کو نکال دیا گیا، اور بعض کی ملٹری کی طرف سے تیار کردہ جعلی دستاویزات کی بنا پر، توہین کی

MashalBooks.org

گئی۔(۲۰) ویلفیئر پارٹی کے بعض ارکان، جن میں اُبھرتے ہوئے ستارے اُس وقت کے استنبول کے میئر، رجب طیب اردگان، بھی شامل تھے، کو کمالسٹ حکومت کے خلاف ''نفرت کو اُبھارنے'' کی وجہ سے قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ بعض اخبارات نے ستمبر ۱۹۹۸ میں لکھا ''اردگان کا سیاسی مستقبل ختم ہے۔'' اب سے بعد وہ مقامی گورنر بھی نہیں بن سکتا۔''(۲۱)

وہ تقریر، جس نے اردگان کو دس ماہ کی قید کی سزا دلوائی، یقیناً سخت تھی۔(۲۲) لیکن اس میں ایک دلچسپ جُملہ بھی شامل تھا، جو اس سمت کی طرف اشارہ کرتا۔ جو وہ اختیار کرنے والا تھا: ''مغربی انسان کو مذہب کی آزادی ہے، یورپ میں عبادت، اور حجاب کیلئے آزادی ہے۔ ترکی میں کیوں نہیں؟''(۲۳)

اے کے پی کا پَس اسلام پسندی کا راستہ

۱۹۹۷ کے ''پس جدیدیت انقلاب'' کے مابعد نتائج کے طور پر، ویلفیئر پارٹی میں ایک زیادہ اعتدال پسند گروہ، جو کہ ارکان کے انتہا پسندانہ اور فریب نگاہ انداز سے اُکتا چکے تھے، ایک نئے نصب العین کی تلاش کرنے لگا۔ سابقہ اُستاد عبداللہ گُل کی قیادت میں، جو کہ غالباً پارٹی کے حلقوں میں سب سے زیادہ شائستہ شخصیت تھی، اس ''اصلاحِ پسند تحریک'' نے مغربی طرز کی جمہوریت کے حق میں زیادہ آواز بلند کی اور یہ استدلال کرنے لگے کہ ''ریاست کو لوگوں کی خدمت کیلئے ہونا چاہیے، بجائے ایک مقدس ریاست کے، جو لوگوں سے بہت بلند ہو''(۲۴)

اس تحریک نے جلد ہی ملی گوروش سے تعلق توڑ لیا، اور طیب ارذگان کے ساتھ عملی اتحاد کر لیا اور اگست ۲۰۰۱ میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اے کے پی) کی بنیاد رکھی۔

اوّل دن سے ہی، اے کے پی نے یہ اعلان کیا کہ یہ ''مذہبی محور والی سیاسی جماعت نہیں ہے'' اور اس نے اپنے نظریے کو ''جمہوری قدامت پسندی'' کے طور پر بیان کیا۔ اردگان کے مطابق اس کا مطلب تھا ''جدیدیت کا ایسا تصور جو روایت کو رد نہیں کرتا، اور عقلیت پرستی کی ایسی تفہیم جو زندگی کے روحانی مفہوم کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔''(۲۵)

نومبر ۲۰۰۲ میں، اس کی بنیاد رکھے جانے کے ایک سال کچھ زیادہ عرصے بعد، اے کے پی نے ووٹوں کی کل تعداد کے ۳۲ فیصد ووٹ لے کر عام انتخابات جیت لئے اور اقتدار میں آ گئی۔ جلد ہی، پوری دُنیا کو حیران کر کے، یہ پس اسلام پسند پارٹی یورپی یونین میں شمولیت کی کوشش کی

سب سے زیادہ پُرجوش اور کامیاب کوشش کنندہ ثابت ہوئی۔ جمہوری اصلاحات کی حیران کُن تعداد اور دائرے کے ساتھ، یہ، نیوز ویک کے کالم نگار فرید زکریا کے الفاظ میں، ترکی تاریخ میں سب سے زیادہ فراخ ذہن، جدید اور آزادی پسند سیاسی تحریک'' بھی ثابت ہوئی۔(۲۶)

لہٰذا یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی جب اے کے پی نے ۲۰۰۷ کے عام انتخابات میں ۴۷ فیصد ووٹوں کے ساتھ حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، نہ صرف قدامت پسندوں، بلکہ سب سے زیادہ سیکولر آزادی پسندوں، کُردوں اور یہاں تک کہ آرمینیاؤں کی بھی حمایت حاصل کی۔ ۲۷ اسلام پسند ملی گوروش، جس کی نمائندگی اب فیلیسٹی پارٹی (Felicity Party) کرتی تھی، جس نے اے کے پی حکومت کو ایک غدّار کے طور پر پیش کیا، جس نے اپنی روح ''مغربی سامراج'' کے ہاتھوں بیچ دی تھی، نے صرف ۲.۵ فیصد ووٹ حاصل کئے۔

اس کی تعبیر ٹھیک ترکی اسلام پسندی کی تاریخی شکست کے طور پر بھی کی جا سکتی تھی لیکن کمالی اس کے بالکل اُلٹ سمجھتے تھے۔ وہ کبھی بھی اے کے پی پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی بجائے، اس کے ارکان کو اسلام پسند کہتے تھے، اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ اس پارٹی کی تحویل محض، باہر کے لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے ایک چال تھی۔ اُن کے بعض سازشی نظریات ذہن کو چکرا دینے والے تھے۔ مثال کے طور پر ۲۰۰۷ میں، ایک کٹر کمال پسند مصنف، ارگون پوئے راز (Ergun Poyraz) نے ایک ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے والا سلسلہ شائع کیا، یہ استدلال کرتے ہوئے کہ اردگان اور گُل دونوں ''خفیہ یہودی'' ہیں، جو اتاترک کی جمہوریہ کو تباہ کرنے اور ترک قوم کو غلام بنانے کیلئے ''بین الاقوامی صیہونیت'' کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں(۲۸)

یہ سامی مخالف جنون، اُس حیرت انگیز تبدیلی کے، جو سیاسی منظر نامے میں واقع ہو رہی تھی، بہت سی علامات میں سے ایک علامت تھی۔ اے کے پی کے مغرب کی طرف زیادہ آگے بڑھ جانے نے صورتِ حال اُلٹ دی، اور اب کمال پسند، کہ وہ بھی خوفزدہ تھے کہ یورپی یونین کُردوں اور دوسری اقلیتوں کیلئے زیادہ حقوق کا مطالبہ کر رہی تھی، مغرب مخالف ہونا شروع ہو گئے تھے۔

بہرحال، کمال پسند، یہ شک کرنے میں کہ اے کے پی کا کوئی خفیہ ایجنڈا تھا، اکیلے نہ تھے۔ کچھ مغربی مشاہدہ کار بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ کسی بھی جماعت کو جو دیندار مسلمانوں پر مشتمل ہو

MashalBooks.org

لازمی طور پر غیر آزادی پسند اور غیر جمہوری ہونا چاہیے۔ ناقدین یقیناً اے کے پی کے حلقوں میں اسلام پسندانہ جذبات کا کھوج لگا سکتے تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی کی موروثی سیاست کے خصوصی مسائل کا بھی، جس میں اقربا پروری اور تنقید کی عدم برداشت بھی شامل تھی۔ طیّب اردگان نے بھی ایسے اشارات ظاہر کیے جنہیں، ''مسلم قومیت پرستی'' کے نشانات کہا جا سکتا ہے...... یا محض ''مسلم ازم'' ......اُس طریقے سے جس سے اُس نے پوری دُنیا میں مسلم اداکاروں سے جذباتی مماثلت ظاہر کی۔ (۲۹) لیکن پھر بھی، اے کے پی کی بعد از اسلام پسندی حیثیت صحیح تھی، چند وجوہات کی بنا پر۔

اوّل، وہ نئی سمت جو اے کے پی نے اختیار کی، ''جمہوری قدامت پسندی ترکی میں پہلے غیر معروف نہ تھی۔ اس کے بالکل برعکس: جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اس کی جڑیں سلطنتِ عثمانیہ کے اسلامی آزادی پسندوں میں اور ساتھ ہی ساتھ ترکی کی سیاست کی روایت میں بھی تھیں، جس کی نمائندگی ۱۹۲۴ میں پراگریسو ریپبلکن پارٹی کی طرف سے، ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے درمیان عدنان میندریس کی طرف سے، اور ۱۹۸۳ اور ۱۹۹۳ کے درمیان ترگت اوزال کی طرف سے کی گئی۔ جو کچھ اے کے پی نے کیا وہ مِلی گوروش، جو کہ غیر ملکی جڑیں رکھنے والی پہلے کی ایک ایجاد تھی کو چھوڑنا، اور زیادہ منظّم سیاسی روایت کی طرف واپس آنا تھا۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ، پارلیمان کے سپیکر بلند آرنچ جو کہ ارگان اور گُل کے بعد اے کے پی کے تیسرے سب سے طاقتور رُکن تھے۔ نے ۲۰۰۷ میں افسوس کا اظہار کیا کہ ۱۹۹۰ کی دہائی میں بہت بعد تک، وہ اور اس کے دوست اوزال کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے، اور اس پر ''انتہائی ناجائز تنقید'' کرتے رہے......آرنچ نے ایک جذباتی لہجے میں مزید کہا ''صرف اُس وقت جب میں نے دُنیا کے بارے زیادہ جانا، تو مجھے معلوم ہوا کہ اوزال کتنا صحیح تھا'' (۳۰)

دوم، اے کے پی کی سیاسی تبدیلی، ترکی میں تبدیل ہوتے ہوئے منظرنامے کی مطابقت میں تھی۔ کلاسیکی آزادی پسندی، ایک ایسا تصوّر جو سلطنتِ عثمانیہ کے آخری زمانے میں بہت مقبول تھا، لیکن جس کی کمالی جمہوریہ کی طرف سے بہت مذمت کی گئی، ۱۹۸۰ کی دہائی کے اخیر میں، اوزال کی اصلاحات اور نئی تنظیموں جیسا کہ انقرہ میں قائم ایسوسی ایشن آف لبرل تھنکنگ کی کوششوں کی مہربانی سے دوبارہ دریافت ہو گیا۔ آزادی پسندی کے فلسفے سے بحث کرتی ہوئی

کتابیں اور علمی کام، جو ۱۹۸۰ کی دہائی سے قبل انتہائی کم یاب تھے۔ ہر جا موجود ہو گئے۔ (۳۱) آزادی پسند دانشوروں کا نوزائیدہ گروہ کمالی سیکولرازم کا ناقد تھا، اور وسیع تر مذہبی آزادی کے حق میں تھا۔ اسلامی قدامت پسندوں کے ساتھ اُن کے بڑھتے ہوئے روابط، نے موخرالذکر گروہ کو نیا تناظر اور اندازِ بیان دیا۔ لہٰذا ۱۹۹۰ کی دہائی کے بعد سے اسلامی دانشوروں نے ''ایک اسلامی ریاست کے تصور پر سوالات اُٹھانا شروع کر دیئے اور اس کی بجائے ''ایک غیر نظریاتی ریاست'' کی یا ایک غیر جانبدار ریاست کی باتیں کرنے لگے، اور اپنے سماجی نصب العین کے طور پر ''تکثیریت'' کا دفاع کرنے لگے۔ آخرِ کار اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا، کہ ''ایران، سعودی عرب اور افغانستان میں اسلام پسند حکومتوں نے، ترکی کے سیکولر پسندوں کی نسبت بھی زیادہ انتہائی جبر کو متعارف کروایا۔'' (۳۲)

۱۹۹۸ میں، با اثر گولن تحریک نے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا، جس کا عنوان تھا ''اسلام اور سیکولرازم''، جس میں ترکی کے مٹھی بھر انتہائی معروف مذہبی علما اور اسلامی اساتذہ نے شرکت کی۔ تین دن کی بحث کے بعد، اُنہوں نے اعلان کیا کہ اسلام اور سیکولر ریاست باہم موافق ہیں، تاوقتیکہ موخرالذکر مذہبی آزادی کا احترام کرے۔ وہ جدّت پسند دینی عالم جس نے اس نقطۂ نظر کو آگے بڑھایا، محمد ایدین (Muhammet Aydin)، جو پوری مسلمان دُنیا کیلئے ''آزادی پسندانہ جمہوری ثقافت'' کو پروان چڑھاتا ہے، اے کے پی کی پہلی مدت میں ڈائریکٹوریٹ آف ریلیجیس افیسرز (Directorate of Religious Affairs) (دیانت) کا ذمہ دار وزیر بن گیا۔ (۳۳)

تیسرا عامل جو اے کے پی کی قلب ماہیت کی وضاحت کرنے میں مدد کرتا ہے، وہ اوزال کی طرف سے ترکی کے نام ایک تحفہ تھا: آزاد معیشت کی سرمایہ داری۔ اور یہ وہ عامل تھا جو آخرکار ترکی اسلام کی تبدیلی میں اس قدر فیصلہ کُن اور اہم تھا۔

اسلامی سرمایہ داری کا احیا

جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں اس سے پہلے دیکھا، اسلام کی ابتدا ایک کاروبار دوست مذہب کے طور پر ہوئی تھی۔ بعدازاں ''اسلامی سرمایہ داری'' کے عروج نے اسلامی تہذیب کی حرکت اور شان و شوکت کو آسان بنایا، جیسا کہ ہم نے دیکھا، جبکہ اس کا زوال اسلامی دُنیا کے جمود

اور بالآخر زوال پر منتج ہوا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عثمانیوں نے نجی کاروبار کی اہمیت کا احساس کرلیا......اگرچہ خاصی تاخیر سے اور کچھ تنظیمات اصلاحات کے ذریعے دھکا دے کر چالو کرنے کی کوشش کی۔

تاہم، اگرچہ عثمانی کوشش متوسط طبقہ کے ظہور پر منتج ہوئیں، لیکن یہ پیشرفت اپنے دائرے کے لحاظ سے بہت محدود تھی۔ متوسط طبقہ سلطنت کے سقوط تک بنیادی طور پر غیر مسلم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ینگ ٹرکس اور بعد میں کمالسٹوں نے، ایک ''قومی متوسط طبقہ'' پیدا کرنے کی کوشش کی، جسے ریاست کی حمایت حاصل تھی۔ وہ ایک خاص حد تک کامیاب ہوئے، لیکن ناجائز طریقوں کی مہربانی سے۔ ترکی سرمایہ داروں کیلئے ''مواقع کی گنجائش'' آرمینیاؤں کے زمانہ جنگ کے اخراج کی وجہ سے کھل گئی۔ جو کہ ایک افسوسناک فیصلہ تھا جو کہ جستہ جستہ اجتماعی قتلوں کا باعث بنا......اور بعد میں یونان کے ساتھ آبادی کے تبادلہ پر منتج ہوا۔ (۳۴) کمالی حکومت نے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۴ کے درمیان، ایک نازی ہمدردیاں رکھنے والی کابینہ کے تحت، یہودیوں، یونانیوں اور آرمیناؤں پر بھاری ''دولت ٹیکس'' عائد کردیا۔ (۳۵) وہ لوگ جو ٹیکس ادا نہ کرسکے، وقت کے تاریک معیارات کی مطابقت میں، مشرقی ترکی میں لیبر کیمپ میں بھیج دیئے گئے۔ (۳۶)

اس ریاست ساختہ ''قومی متوسط طبقہ'' کی تشکیل اور ترکیب دونوں ناجائز تھیں۔ صرف اُن شہرباشوں نے جو سیکولر سیاستدانوں اور سرکاری ملازموں کے ساتھ پی پلا سکتے تھے، ریاست سے نفع بخش ٹھیکے اور قرضے وصول کئے۔ ۱۹۴۰ کی دہائی کے اختتام تک، کمالی ''مرکز'' نے، اپنی پسند کے مطابق کامیابی سے ایک کاروباری بالا طبقہ پیدا کرلیا تھا۔

اسی دوران میں، مذہب بنیادی طور پر کم مراعات یافتہ طبقے میں باقی رہا۔ اورحان پامک (Orhan Pamuk) جس نے ادب میں نوبل انعام کا حاصل کیا، ۱۹۵۰ کی دہائی کے استنبول میں اپنی بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''قومی ریاست، مذہبی غربا کی نسبت ہماری ملکیت تھی۔''۔ لیکن وہ مزید کہتا ہے، کہ اُس کی طرح کے سیکولر لوگ بھی ''اُن لوگوں کی طرف سے جن کا سیکولرازم کا کوئی ذوق نہیں تھا، جماعت سے باہر نکالے جانے'' سے خوف زدہ تھے۔ (۳۷)

پامک کے خوف، چند دہائیاں بعد، اوزال کے انقلاب کے دوران، حقیقت کا روپ دھارنا شروع ہوئے۔ معیشت کو آزاد کرکے، ریاست کے کردار کو کم کرکے، اور ذاتی طور پر مذہبی

طور پر پارسا اور معاشی کاروباری جذبہ کو اُبھار کر، اوزال نے اسلامی ذہن رکھنے والے کاروباری لوگوں کیلئے موقع پیدا کیا۔ اتنی جلدی کہ ۱۹۸۰ کی دہائی کا اختتام آیا، معیشت دار نے ''اناطولی شیروں'' کی بات کرنا شروع کردی......وہ کمپنیاں جن کی بنیاد اناطولیہ کے قدامت پرست شہروں میں رکھی گئی، جنھوں نے تیزی سے آزاد معیشت کی جرأت مندانہ نئی دُنیا میں پیداکاری اور برآمدات کے زبردست مواقع سے فائدہ اُٹھایا۔

۱۹۹۰ میں، ان قدامت پسند کاروباری لوگوں کے ایک گروہ نے ایک موسیاد (Musiad) نامی یونین بنائی، جو کہ واضح طور پر، خوب منظم توسیاد (Tusiad) Turkish Industrialists and Businessmen's Association) کا متبادل تھا، جو ''استنبول کے طبقہ امرا کے زیادہ سیکولر طبقے کی نمائندگی کرتی تھی۔ حرف ''ایم''، ''مستقبل'' یا ''آزاد'' کی نمائندگی کرتا تھا، لیکن بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اصل میں اس سے مراد ''مُسلم'' ہے، کیونکہ بہت سے موسیاد کے ارکان مسجد جانے والے وہ قدامت پسند ہیں، جن کی بیویاں اور بیٹیاں حجاب پہنتی ہیں۔

۱۹۹۴ میں، موسیاد نے، ایک کتابچے میں جس کا عنوان (Homo Islamicus) ہوموا سلامیکس تھا، ایک اسلامی معاشی منشور شائع کیا۔ اس دستاویز نے محنت اور آزاد تجارت کی حوصلہ افزائی کی، پیغمبر محمدؐ کی بطور تاجر زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے۔ اس نے شدّت سے منڈی کی آزادی کا دفاع کیا اور معیشت میں ریاست کے مداخلت کارانہ کردار کی مخالفت کی۔ اس نے یہ بھی اضافہ کیا کہ اُن کا سرمایہ دارانہ نظام اسلام کی رحمدلانہ اور فیاضانہ اقدار سے سدھایا ہوا ہے، کسی ''ظالمانہ'' قدر سے نہیں۔ (۳۸)

اپنی بنیاد سے لے کر اب تک موسیاد اور روز افزوں موثر ہوتی جارہی ہے، اور اس نے مسلسل آزاد منڈی کی اصلاحات کی حمایت کی ہے، جبکہ توسیاد کے کچھ ارکان، جو ایک ''تحفظ یافتہ'' معیشت سے فائدہ اُٹھاتی رہی ہیں، کم پُر جوش رہ گئے ہیں۔

یہ تفریقِ ترگت اوزال کے ابتدائی سالوں میں شروع ہوئی، جو ''مکمل آزادی'' کا حامی تھا، جبکہ توسیاد کے بہت سے ارکان ''مخلوط معیشت'' یا سرمایہ داری اور سوشلزم کے مرکب کی حمایت کرتے تھے۔ (۳۹)

MashalBooks.org

اسلام کے کالوِنسٹ

اُن شہری مراکز میں سے ایک جنہوں نے اناطولین ٹائیگرز کو جنم دیا، کیسری تھا، جو کہ ترکی کے مرکز میں ایک درمیانہ حجم کا شہر تھا۔کیسری ہمیشہ سے اپنے کاروباری ذہن، اور مذہب پرستی کیلئے مشہور رہے ہیں۔لیکن اوزال کے انقلاب کی مہربانی سے اُنہوں نے آگے کو ایک بڑی زقند لگائی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط کے بعد سے اس شہر نے ایک صنعتی اُٹھان کا تجربہ کیا، جس میں سیکڑوں کارخانے کھل گئے۔۲۰۰۰ کی دہائی کے وسط تک اس کی ٹیکسٹائل کمپنیوں میں سے صرف ایک نے ایسے مارکوں کیلئے جیسا کہ ''لیولیس''، ''رینگلر'' اور ''ڈیزل''، دُنیا بھر کے سوتی ٹوٹل کا ۷۰ فیصد مال مہیا کیا، اور اپنے سامان کو شرقِ اوسط کے بہت سے مما لک کو برآمد کیا۔

۲۰۰۵ میں، برلن میں قائم ایک تھینک ٹینک، دا یوروپین سٹیبلیٹی اِنی شی ایٹو (ای ایس آئی) (The European Stability Initiative) (E S I) نے کیسری کے معاشی معجزے کے راز کو سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ کیا۔

شہر کے مشہور کاروباری لوگوں کے ساتھ انٹرویو منعقد کرنے کے بعد، ای ایس آئی کی ٹیم نے ایک رپورٹ لکھی۔ان کاروباروں کی ترغیب میں مذہب کے عجیب وغریب کردار پر زور دیا گیا۔کیسری کے کاروباری لوگوں میں سے ایک نے پیغمبر محمدؐ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا'' آدمی کی تقدیر کا دس میں سے نو حصہ تجارت اور جرأت پر منحصر ہے''۔ایک دوسرے کاروباری شخص نے استدلال کیا، ''ایک مذہبی آدمی کیلئے اچھا ہے کہ وہ محنت کرے'' اور '' کارخانہ کھولنا ایک طرح کی عبادت ہے''۔ایک فرنیچر کمپنی کے بانی نے بیان کیا ''میں جدید اور روایتی ہونے کے درمیان کوئی واضح اختلاف نہیں دیکھتا'' اور یہ کہا کہ وہ ''جدّت طرازی کیلئے تیار ہے'' (۴۰)

شہر کے سابقہ میئر شکرو کاراتیپ (Sukru Karatepe) نے ای ایس آئی کے تحقیق کاروں کو بتایا ''کیسری کو سمجھنے کیلئے آزادی کو میکس ویبر (Max Weber) کو پڑھنا چاہیے۔'' (۴۱) ویبر نے، یقیناً اُس کردار کی طرف اشارہ کیا جو ابتدائی دور کے پروٹسٹنٹوں، خاص طور پر کالونسٹوں کے زاہدانہ اور جفاکش اخلاق نے، یورپ میں جدید سرمایہ داری کے اُبھار میں ادا کیا، کاراتیپ کے مطابق، آدمی وہی کام کی اخلاقیات کیسری میں اور بعض دوسرے اناطولی شہروں میں بھی مشاہدہ

کرسکتا ہے اسلامی تعلیمات کی مہربانی سے۔موزوں طریقے سے ای ایس آئی کے تحقیق کاروں نے اپنی رپورٹ کا عنوان ''اسلامی کالوِنسٹ'' رکھا۔اُن کا نتیجہ یہ تھا کہ کیسری ایک واحد نظیر کا مطالعہ تھا، اور عمومی طور پر، ''گزشتہ دہائی کے دوران (۲۰۰۵۔۱۹۹۵)، ترکی اسلام کے اندر، انفرادی، کاروبار کی حامی لہریں نمایاں ہوگئی تھیں''۔(۴۲)

یہ ''انفرادی، کاروبار کی حامی لہریں'' یقیناً سرمایہ دارانہ تھیں، لیکن مادہ پرست، لذّت پسند یا خودغرضانہ نہیں تھیں بلکہ اُس کے بالکل برعکس، وہ سماجی ذمہ داری کے احساس، کے ساتھ، جیسا کہ اسلام میں زور دیا گیا ہے، ہم آہنگ تھیں۔کیسری کے اسلامی کاروباری لوگوں نے پانچ سال میں ۳۰۰ ملین ڈالر سے زیادہ، کلینکوں، سکولوں، اور دوسری مختلف خیراتی تنظیموں پر خرچ کئے۔۲۰۰۵ تک شہر میں، سولہ ہزار الگ الگ شوربے کی تقسیم گاہیں، روزانہ دس ہزار لوگوں کی خدمت کررہی تھیں۔کیسری کی ثقافت'' کاروبار، زُہد پرستی، اور ایثار پسندی کا ایک مرکب تھی'' (۴۳)

اے کے پی سیاسی قلب ماہیت، ان اسلامی کاوینیسٹوں کی دلچسپیوں سے لاتعلق نہ تھی۔ موخرالذکر ایک ایسا ترکی چاہتے تھے۔جو عالمی معیشت سے جڑا ہوا ہو، اپنے استحکام کو یورو پی یونین کے ساتھ وابستہ کردیا ہو، اور اُس کے تمام ہمسایہ مما لک کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں ......ٹھیک ٹھیک اے کے پی کی حکمتِ عملی (۴۴) اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ تمام ''اسلامی کالولنٹ'' اردگان اور گل کے حامی تھے، اور کیسری درحقیقت اے کے پی کا شہر تھا، جس نے ۲۰۰۷ میں پارٹی کو حیرت انگیز ۶۶ فیصد ووٹ دیئے۔

مسلمان طبقۂ اوسط اور اس کی تبدیل ہوتی ہوئی ثقافت

جولائی ۲۰۰۸ میں، موسیاد کے بانی، ایرول یارار (Erol Yarar)، جو کہ باعمل مسلمان ہیں، نے ایک ترکی اخبار کو ایک انٹرویو دیا، جس نے قومی سطح پر ایک بحث کو چھیڑ دیا۔اس کی سُرخی یوں تھی ''ہم ترکی کا حقیقی متوسط طبقہ ہیں''۔یارار نے یہ استدلال کیا کہ جبکہ کچھ کاروباری لوگوں کو ریاست کی طرف سے امداد دی گئی، ''ہم اپنی ہی کوششوں سے اُبھرے، بہت حد تک یورپ کے طبقہ اوسط کی طرح۔'' (۴۵)

یارار نے ایک اہم چیز کا بھی ذکر کیا: ایک طرف مسلمان کاروباری لوگ ایک ایسے سرمایہ

MashalBooks.org

دارانہ نظام کو تخلیق کر رہے تھے، جو ان کی مذہبی اقدار سے متاثر تھا: دوسری طرف، سرمایہ دارانہ نظام میں اُلجھنے سے اُن کی مذہبی اقدار تبدیل ہو رہی تھیں۔ اُس نے یاد کیا، ''جب ہم نے اپنی پہلی میٹنگ ایک پانچ ستارے والے ہوٹل میں منعقد کی: ''تو موسیاد میں ہمارے کچھ دوست یہ سوال کر رہے تھے، ''ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟......اُن میں سے بہت سوں نے کبھی ملک سے باہر سفر نہیں کیا تھا، اور وہ یورپ، امریکا اور روس کے مخالف تھے...... وہ اپنی کمپنیوں کی وراثت اپنے بیٹوں کو دینا چاہتے تھے، اور اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے بارے میں زیادہ زحمت نہیں اُٹھاتے تھے۔ اُس وقت سے ''یہ غلط تصورات بہت حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب وہ اس چیز کو زیادہ سے زیادہ دیکھنے کیلئے یورپ کا سفر کر رہے ہیں......حال ہی میں، میں استنبول میں ایک بڑے شاپنگ مال میں ایک چھوٹی سی مسجد میں داخل ہوا۔ مین نے جوتوں کو دیکھا: وہ سارے اعلیٰ معیار کے برانڈ تھے! یہ وہ انقلاب ہے جو ترکی میں برپا ہو رہا ہے۔'' (۴۶)

دوسرے لفظوں میں، جدید دُنیا کے ساتھ بطور شراکت دار ملاقات نے، اس کے بارے میں سابقہ منفی رویّوں میں اصلاح کر دی۔ ان مسلمان کاروباری لوگوں کے تجربات، جدید دُنیا کے ساتھ بطور شرکا کے ملاقات سے بہت مختلف ہیں......جیسا کہ مغربی غلبے یا سیکولر آمریت کے تحت مسلمان اپنے آپ کو دیکھتے ہوں گے۔ یہ جدید دُنیا کے باہر کے لوگ ہونے سے بھی مختلف ہے، جیسا کہ یورپی معاشروں میں بہت سے کمزور مسلمان تارکین وطن محسوس کرتے ہیں۔

اسلامی کالونسٹوں نے، مسلمان پیشہ وروں کی نئی نسل کیلئے ملازمتیں بھی پیدا کیں۔ لہٰذا صرف دو دہائیوں میں......وسط ۱۹۸۰ کی دہائی سے وسط ۲۰۰۰ کی دہائی تک......ایک ''مسلمان طبقہ اوسط'' اُبھرا جس نے سیکولر پسندوں کو حیران کر دیا۔ جونہی اس کا سماجی تناظر تبدیل ہوا، اس طبقہ اوسط نے اپنے سیاسی رویے تبدیل کرنا شروع کر دیئے۔ اس کی ایک مثال اسلام پسندی کا زوال تھا۔ ۲۰۰۶ میں ایک آزادی پسند تھنک ٹینک کی طرف سے کئے گئے ایک سروے (جب اے کے پی حکومت اقتدار میں تھی) میں یہ ظاہر ہوا کہ، ترکی معاشرے میں ''شریعت کی ریاست'' کا مطالبہ صرف سات سال میں ۲۱ فیصد سے ۹ فیصد تک آ گیا۔ جب شریعت کے کچھ انتہائی اقدامات کے بارے میں، مثلاً سنگساری کے بارے میں، سوالات پوچھے گئے، تو یہ حمایت گر کر ایک فیصد تک آ گئی۔ (۴۷) یہ خاص طور پر ایک بڑی تبدیلی تھی، جب اس کا موازنہ ترکی کی اسلام

پسندوں کے جوبن کے ساتھ کیا جائے، جب وہ ایک ''طالبان کی طرح کی شریعت'' کے نفاذ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ (۴۸)

ایک اسلامی اُستاد نے ۲۰۰۹ میں لکھا ''آہ، وہ ۷۰ کی دہائی کے مثالی مجاہدین!''۔ اب وہ سب پیشہ بنانے والے مُتیاحد (تعمیراتی ٹھیکدار) بن چکے ہیں''۔ (۴۹)

سیاسی زندگی کے بارے میں اپنے تبدیل شدہ نقطۂ نگاہ کے علاوہ، اس نئے مسلم طبقۂ اوسط نے، ایک بالکل نئی ثقافت پروان چڑھانا شروع کر دی۔ ایک دلچسپ مطالعہ جو اس قلب ماہیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک ترک ماہر عمرانیات سے آیا ہے۔ یہ تبدیلی اُس وقت واضح ہو گئی جب اُس نے ناولوں کے دو عہدوں کا موازنہ کیا...... پہلا عہد ۱۹۸۰ کی دہائی کا ہے اور دوسرا ۱۹۹۰ کی دہائی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور میں، ناولوں میں تمام کردار واضح طور پر تراشی ہوئی شخصیات تھیں......اخلاقی طور پر گرے ہوئے سیکولر پسند بمقابلہ مثالی مسلمان...... ہر کہانی کا ایک ہیرو ہوتا تھا، جو کچھ روحانی تحقیق کے بعد، روشنی کو پا لیتا تھا اور ''اسلامی نقطہ نظر'' کا جان نثار بن جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کی شادی بھی ''اسلام کی خاطر اچھے بچے پیدا کرنے'' کے بارے میں ہوتی تھی۔ اور رومان یا محبت پر مرکوز نہیں ہوتی تھی۔

لیکن دوسرے دور میں، ''اسلامی ناولوں'' کے کردار زیادہ حقیقی اور اُن کی کہانیاں زیادہ پیچیدہ ہو گئیں۔ اب سیکولر شخصیات لازمی طور پر تمام کی تمام بُری نہیں تھیں اور اسلامی شخصیات بھی زیادہ انسانی ہو گئی تھیں......جن کے ساتھ گناہ بھی تھے، ذاتی شکوک وشبہات بھی تھے، اور محبت کی کہانیاں بھی تھیں۔ مزید برآں، اب تنقید کا رُخ نہ صرف باہر کے لوگوں کی طرف تھا، بلکہ خود اسلامی کیمپ کی طرف بھی تھا۔ خواتین مصنفین میں سے ایک، جن کے ابتدائی ناولوں میں ''اسلامی طرزِ زندگی'' کو مثالی بنایا گیا تھا، اب اسلامی معاشرے کے اندر ناانصافیوں پر تنقید کر رہی تھیں، جیسا کہ اُن زن بیزار شوہروں کو جو اپنی محبوباؤں کو اپنی ''دوسری بیویوں'' کے طور پر اپنا لیتے ہیں۔ (۵۰)

الغرض، اسلامی ادب ''اجتماعی نجات کے بیان'' سے ''نئی انفرادی مسلم برادریوں'' کی طرف منتقل ہو گیا۔ (۵۱) اور یہ چیز لکھاریوں اور اُن کے قاریوں کے تبدیل ہوتے ہوئے سماجی معاشی پس منظروں کے ساتھ براہِ راست متعلق تھی......۱۹۸۰ کی دہائی کے اسلامی ناول ''بڑے

MashalBooks.org

شہروں میں نوواردوں کے تجربات کی عکاسی کرتے تھے...... نچلے طبقے کے لوگوں کی۔'' لیکن ۱۹۹۰ کی دہائی کے اواخر میں، وہ لوگ اب نووارد نہیں رہے تھے: اُنہوں نے ایسے جدید کام پالئے تھے جیسا کہ انجینئر، میئر، کاروباری حضرات اور کاروباری خواتین۔'' اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس دور میں قدیم ''نجات کے ناول'' اور دوسری ''نظریاتی کیمپ'' ادب مزید کوئی زیادہ اچھی نہیں بکتی تھیں۔ اس کی بجائے جو چیز مقبولِ عام ہو چکی تھی، وہ ذاتی ترقی کے بارے میں کتب تھیں۔(۵۲) دوسرے لفظوں میں، جونہی پارسا مسلمان شہری طبقۂ اوسط میں شامل ہوئے، مذہب کے بارے میں اُن کی تفہیم، کم نظریاتی اور زیادہ انفرادی ہوگئی۔

''ہمارے مذہبی فہم کو تازہ ترین معلومات کی فراہمی''

اس تبدیل ہوتے ہوئے منظرنامے، اور اُس قبولیت نے جو اس نے مذہب کی نئی تعبیرات کیلئے پیدا کی، جلد ہی اپنی بازگشت پائی، جب اے کے پی نے ۲۰۰۲ کے اواخر میں برسرِ اقتدار آنے کے چھ ماہ بعد، علی بارداکوگلو (Ali Bardakoglu) کو ڈائریکٹوریٹ آف ریلیجیس افیئرز (دیانت) کا سربراہ مقرر کیا۔ ایک صاحب علم مذہبی پیشوا، بارداکوگلو اس ادارے میں نئی حرکیت اور نیا نقطۂ نظر پیدا کرنے کیلئے آمادہ تھا۔ علامتی طور پر اُس نے اپنے پیشروؤں کے بے کیف سیاہ لباس کو جو وہ پہنتے تھے، ختم کر کے ایک سنہری پتیوں والا سفید لباس، زیبِ تن کیا، جو کہ عثمانی شاہی اور انداز پر تیار کیا گیا تھا۔ ۲۰۰۴ میں، اُس نے ''تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے مطابق ہمارے مذہب کو تازہ ترین معلومات فراہم کرنے'' کی ضرورت کے بارے میں بات کی۔ اُس نے کہا ''سوائے بنیادی مذہبی ذرائع کے ہمیں مذہبی تعبیرات کو بطور آج کے اختیار کئے جانے والے حقیقی نمونے کے، ماضی سے اختیار نہیں کرنا چاہیے۔'' (۵۳) اگلے سال، اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ،'' اُس نے دو خواتین کو استنبول اور کیسری کی مساجد میں بطور کونسلر تعینات کیا۔

۲۰۰۶ میں بارداکوگلو نے، ایک اور بیان کے ساتھ دوبارہ ایک خبر بنا دی: ''ایسی کوئی حدیث نہیں ہوسکتی جو کہتی ہے، 'عورتوں میں سے بہترین وہ ہیں جو بھیڑوں کی مانند ہیں'' (۵۴) یہ اُس حدیث پراجیکٹ کا تعارف تھا، جو دیانت نے شروع کیا تھا، ایک ایسا نیا حدیث کا مجموعہ تیار کرنے کیلئے جو کلاسیکی لٹریچر میں سے زن بیزاری کے کچھ بیانات کو خارج کر دے گا، یا کم از کم

اُنہیں صحیح تناظر میں رکھنے کیلئے۔(۵۵) مثال کے طور پر وہ احادیث جن میں عورتوں کے اکیلے سفر کرنے پر پابندی لگائی گئی ہے، اس وجہ سے وجود میں آئیں ''کیونکہ پیغمبرؐ کے وقت میں جنگل اتنا خطرناک تھا کہ اکیلی خاتون اس میں سفر نہیں کرسکتی تھی'' محمد گورمیز (Mehmet Gormiz)، جو اس وقت کے دیانت کے وائس پریزیڈنٹ تھے، جنہوں نے نومبر ۲۰۱۰ میں بارداکوگلو کی جگہ لینا تھی، نے وضاحت کی۔ ''بدقسمتی سے یہ وقتی معاملہ ایک مستقل طور پر صحیح مذہبی اصول میں تبدیل ہوگیا'' (۵۶) (حدیث پراجیکٹ...... جو انقرہ یونیورسٹی کے دینیات کے اسکول میں قائم ہے...... ابھی تک زیرِ تکمیل تھا جب یہ کتاب پریس میں گئی)۔

مجموعۂ احادیث پر تر کی تنقید، حقیقتاً ۱۹۸۰ کی دہائی میں شروع ہوگئی تھی، لیکن ابتداء اس میں حقیقی حمایت کی کمی تھی۔ جب ایک انتہا پسند اصلاح پسند نے ادیب یُوکسل (Edip Yuksel) نے تنہا، احادیث کو چیلنج کیا اور ''صرف قرآن'' کا فارمولا پیش کیا، تو اُس پر قدامت پرستوں کی طرف سے دشنام طرازی کی گئی، بلکہ اُسے مرتد قرار دے دیا گیا۔ لیکن یوکسل کی بعض تنقیدات کو نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں ایک مذہبی عالم جو ٹیلیویژن کے ذریعے تبلیغ کرنے والا بن گیا تھا۔ یشر نوری اوزترک (Yasar, Nuri Ozturk) نے حدیثوں کے بارے میں اسی طرح کی تنقیدات بلند کیں اور ''روایات کے اسلام'' کے مقابلے میں، زیادہ ترقی پسندانہ ''قرآن کا اسلام'' آگے بڑھایا۔ کمالسٹوں کے ساتھ اُس کے بے اصولے اتحاد نے قدامت پسندوں کو بددل کر دیا، لیکن یہ تصور کہ ''کچھ حدیثیں حقیقتاً مسائل پیدا کرنے والی ہیں''، مسلسل مقبول ہوتا گیا۔

حدیثوں پر تنقید، اسلامی کیمپ میں، حقوقِ نسواں کے حامی نظریات کے اُبھار کے ساتھ شامل ہوگئی ......ایک مرتبہ پھر سماجی تبدیلی کی مہربانی سے۔ جب ایک روایتی مسلمان گھریلو خاتون، کا سامنا ایسی حدیث سے ہوتا جس میں عورتوں کو نصف دماغ والی ایسی مخلوق کے طور پر پیش کیا گیا ہوتا، جس کا واحد فریضہ اپنے شوہر کی اطاعت ہوتا، تو وہ خاموش رہتی۔ لیکن اب، ایک طبقۂ اوسط کی مسلمان خاتون، جس کے پاس معاشیات کی ڈِگری ہے، اور وہ غالباً اپنے شوہر سے زیادہ پیسے کماتی ہے، کہہ سکتی ہے، ''ایک منٹ ٹھیرو، یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔'' دوسرے لفظوں میں، دیانت کی، زن بیزاری سے مبرّا احدیث کا نیا لٹریچر پیدا کرنے کی 'کوشش' اُس نئے سماجی مرتبے

MashalBooks.org

کے بغیر جوتر کی خواتین نے معاشی مواقع کے ساتھ حاصل کرلیا ہے، غالباً آگے نہ بڑھ سکتی۔

درحقیقت، ''ہمارے مذہبی فہم کو تازہ ترین معلومات کی فراہمی'' کیلئے اس سے بھی زیادہ جرأت مندانہ خیالات پروان چڑھے۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں شروع ہوکر، جب ''انقرہ سکول'' کے مذہبی علمانے، کیا تاریخی ہے اور کیا مذہبی کے درمیان فرق پر زور دیا۔ اکثر اوقات، بیسویں صدی کے مشہور ترین ''نومعتزلہ'' ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تصانیف سے متاثر ہوکر، ان علما نے نہ صرف احادیث پر تنقیدی نگاہ ڈالی، بلکہ لفظ پرستی کے مقابلے میں، قرآن کی تناظریت کیلئے دلائل پیش کیے۔ اُن کی کتب نے اسلامی روایت کے بارے میں تنقیدی نقطہ ہائے نظر اختیار کیے ہیں، اور اس طرح زیادہ عقلی اور آزادی پسندانہ تعبیرات پیش کی ہیں۔ اُن کے عنوانات میں سے کچھ درج ذیل ہیں: قرآن کی معتزلہ تشریح، معتزلہ کا سنہری دور، سُنہ پر دوبارہ غور، احادیث پر دوبارہ غور، نظریاتی حدیث سازی کے پسِ پردہ، انفرادیت سازی کا راستہ، اور فرد اور اُس کا مذہب۔

دیانت کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامہ میں انفرادیت پر بڑھتا ہوا زور بھی بہت نمایاں تھا۔ گزشتہ ۲۰۰۰ کی دہائی سے کچھ مضامین کے ایسے عنوانات شامل ہیں: ''آزاد معاشرے میں حاکم ذات صاحب یقین پید کرنا''، ''خود اپنی مذہبیت پیدا کرنے کی فرد کی ذمہ داری'' اور ''ایک آزادی کرنے والی مذہبی تعلیم''۔ ان کا مصنف، دیانت کا چوٹی کا اہلکار محمد شیو کی ایدین (Mehmet Sevki Aydin) والدین کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ ''اپنے بچوں پر اپنے مذہبی فہم کو لاگو نہ کریں'' اور یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ صاحبِ یقین کو ''مذہبی حکام سے مشورہ کرنا چاہیے، لیکن خود اپنی عقل کو بھی استعمال کرنا چاہیے...... اور اپنی زندگی کا فعال مالک ہونا چاہیے۔'' (۵۷)

غالباً دیانت کی طرف سے آزادی کا سب سے زیادہ قابلِ احترام دفاع، اپریل ۲۰۰۷ میں علی باردا کوگلو کی طرف سے آیا۔ ایک افسوسناک وقوعے کے نتیجے میں، جس میں، تین عیسائی مبلغین کو مشرقی ترکی میں، ترکی حد سے زیادہ قوم پرستوں کے ایک گروہ کی طرف سے وحشیانہ طور پر قتل کردیا گیا۔ ایک پریس کانفرنس میں، اُس نے قاتلوں کی مذمت کی اور کہا ''یہ اُن کا [مبلغین کا] فطری حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ ہمیں ایک ملحد کے ذاتی انتخاب کا بھی احترام کرنا سیکھنا چاہیے، چہ جائیکہ دوسرے مذاہب کا۔'' (۵۸) تین سال بعد، باردا کوگلو نے، ترکی میں تاریخی، عیسائی گرجاؤں کے دوبارہ کھولنے کی بھی وکالت کی، جو سیکولر ریاست کے قومی تعصّبات کی

وجہ سے بند کردیئے گئے تھے۔ (۵۹)

ان تمام نظریات کی وجہ سے، دیانت کی نئی قیادت، اور خاص طور پر انقرہ سکول کے مذہبی علما کو، ترکی میں، مذہبی طیف کے کی جدّت پسندانہ جانب سمجھا جاتا ہے بلکہ کچھ انتہائی قدامت آوازوں نے کچھ تازہ تناظرات پیش کیے ہیں۔ مشہور اسلامی اُستاد علی بُلاچ (Ali Bulac) نے، مثال کے طور پر، اُس درجہ دوم کی ذمی حیثیت پر اعتراض اُٹھایا ہے، جو مسلمان سلطنتیں، پوری اسلامی تاریخ میں، غیر مسلموں کو دیتی رہی ہیں اُس نے یہ استدلال کیا کہ یہ درجہ، قرآن کی طرف سے صرف اُن غیر مسلموں کیلئے مراد تھا، جنہوں نے اسلام پر جنگ کا آغاز کیا، لیکن اس کو غلطی سے اُن تمام لوگوں تک توسیع دے دی گئی۔ اُس نے لکھا کہ، اسلامی نصب العین ایک ایسا سماجی معاہدہ ہونا چاہیے۔ جو مساوی حیثیتوں پر مبنی ہو۔ (۶۰)

ایک اور قدامت پسندانہ رائے کے رہنما، خیرالدین کارمان (Hayrettin Karaman) جو کہ اسلامی قانون کے اعزازی پروفیسر اور اسلام کے حامی روزمانے ینی شفق Yeni Shfak، کے کالم نگار ہیں، نے ان نظریات کا دفاع کیا ہے کہ عیسائی اور یہودی بھی اخروی زندگی میں ''نجات پا سکتے ہیں''، یہ کہ اسلام سے ارتداد قابلِ تعزیر نہیں ہونا چاہیے یہ کہ اسلام ''نازیوں کی طرح کی ایک مطلق با اختیار ریاست کو مسترد کرتا ہے''، اور یہ کہ غیر مسلموں کے ''غیر اسلامی عقائد اور اعمال'' کو ایک اسلامی ریاست میں بھی آزاد ہونا چاہیے۔ اُس نے اس نظریے کی بھی مخالف کی ہے کہ قرآن کی امن پسند آیات منسوخ ہوچکی ہیں اور یہ استدلال کیا کہ اسلام کا صحیح سیاسی نصب العین ''ایک ایسی دُنیا نہیں ہے جس میں ہر شخص مسلمان ہو، بلکہ ایک ایسی دُنیا ہے جس میں مسلمان تمام اقوام اور تمام آزادیوں کی حفاظت کریں۔'' (۶۱)

متضاد جنسوں کے ارکان کے درمیان مصافحے کے جواز کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں، جس سے بہت سے قدامت پسند مسلمان اجتناب کرتے ہیں، کارامان نے ایک ایسا جواب دیا جو معاشرے میں تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے:

''اُن جگہوں پر اور اُن اوقات میں، جب مصافحے کی کوئی رسم نہیں تھی، تو نوجوان مردوں اور عورتوں کے درمیان ہاتھوں کو پکڑنے میں ایک جنسی مفہوم ہونے کا بہت زیادہ امکان ہوتا تھا۔ پُرانے فقہا اس لحاظ سے ٹھیک ہوسکتے ہیں [اس عمل کی مخالفت کرنے میں]۔ لیکن آج یہ رسم وسیع

MashalBooks.org

پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے، یہ ایک فطری چیز بن چکی ہے، اوراس طرح اس کا جنسی جذبے کے ساتھ تعلق کمزور پڑ چکا ہے بلکہ یہ ایک ضرورت بن چکی ہے۔''(۶۲)

دوسرے لفظوں میں، معاشرے میں تبدیلی، پُرانی تبدیلی تعبیرات پر دوبارہ غور پر منتج ہوتی ہے۔

۲۰۰۸ میں، اس تبدیلی کی ایک نمایاں مثال، فتح اور گولن کی طرف سے آئی، جو کہ ترکی میں سب سے بڑی اسلامی برادری، ''نئے نورکو'' (Neo nurcu) گولن تحریک کے رہنما ہیں، جب اُن سے ازدواجی زیادتی کے بارے میں پوچھا گیا، ایک ایسا عمل، جس کا، جواز کچھ دقیانوسی علما نے کبھی کبھار، معلوم طور پر دیا ہے، گولن نے ایک بالکل غیر متوقع جواب دیا۔ ''یہ طلاق کیلئے ایک وجہ ہوگی'' اُس نے کہا ''مزید برآں، خطرے کی زد میں آئی ہوئی عورتوں کیلئے ایک اچھا خیال ہوگا کہ وہ کراٹے یا جوڈو سیکھیں ......تاکہ اگر اُن کے شوہر وار کریں، تو وہ بھی بہتر طور پر جوابی وار کرسکیں۔''۶۳

اسلام میں اصلاح کیلئے تُرکی سے حاصل کئے جانے والے سبق

ترکی اسلام کے تمام نئے تصورات اور تناظرات میں ہم ایک عمومیت دیکھتے ہیں: مذہبی متون کے بارے میں ایک زیادہ عقلیت پسندانہ اور انفرادی نقطۂ نظر۔ ۲۰۰۴ میں، ایک اسلامی دانشور نے اس بات کی شناخت کی اس کا مطلب کیا ہے: ''آج کل کے مسلمانوں میں معتزلی تناظر زیادہ غالب اور وسیع تر ذہنی رویہ بنتا جا رہا ہے۔''(۶۴) پانچ سال بعد، ایک اور دانشور نے یہ بیان کیا کہ اب ترکی کے جدّت پسند مسلمان ''قرآن اور اطاعت کی بجائے، قرآن اور آزادی کے بارے میں سُننا چاہتے ہیں''(۶۵)

اس ''اصلاح'' کی ڈھیلی ڈھالی، اور غیر رسمی نوعیت پر غور کرنا اہم ہے۔ عوام ایسے اعلانات پر دستخط کرنے نہیں جا رہے جن میں یہ کہا گیا ہو ''بُخدا، اب ہم معتزلہ ہیں''۔ نا ہی کسی مسلمان لوتھر نے کسی مسجد کے دروازے پر، انقلابی پچانوے مقدّمات گاڑ دیئے ہیں، یہ منظر نامہ، جو کسی اور جگہ کی نسبت مغرب میں زیادہ مقبول ہے، سماجی تبدیلی سے پہلے فلسفیانہ تبدیلی کی پیش بینی کرتا ہے۔ لیکن جو کچھ واقع ہو رہا ہے، وہ بالکل اس کا اُلٹ ہے۔

یہ ایک بے نظیر تجربہ ہے، جس کے غیر معمولی نتائج ہیں۔ نہ صرف ترکی کیلئے، بلکہ پوری دُنیا

کے اسلام کیلئے۔ اپنی متحرک، تشکیلی صدیوں میں، جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے، والے ابواب میں دیکھا ہے، اسلام ایک ایسا مذہب تھا، جو تاجروں اور اُن کی عقلیت پسند، متحرک اور عالمی ذہنی ساخت نے پھیلایا۔ لیکن بعد میں مشرق کے زیادہ طاقتور طبقات ......زمیندار، سپاہی اور کسان ......غالب آگئے اور کم عقلیت پسند اور زیادہ جامد ذہنی رویے نے مذہب کی صورت گری شروع کی۔ جتنی زیادہ تجارت زوال پزیر ہوئی، اُتنی ہی زیادہ مسلم ذہن جامد ہوتا گیا۔ بعد کے مراحل میں، سلطنتِ عثمانیہ جیسی طاقتور ریاستوں کے اُبھرنے کے ساتھ ہی، جدید طرز کے سرکاری ملازمین منظر میں داخل ہوگئے، جن کی پیروی اُنیسویں صدی میں جدید طرز کے دانشوروں نے کی لیکن تبدیلی لانے کیلئے ان کی قابلِ غور کوشش بھی، اوپر سے نیچے کی طرف کے عمل کے طور پر جاری رہیں، جس میں معاشرے کا بڑا حصہ غیر متعلق رہا۔

جس چیز کی شدید کمی تھی، وہ ایک حرکیہ تھا، جو خود معاشرے کو تبدیلی کے ایک عامل میں تبدیل کردیتا۔ وہ مرکز پسندانہ اور سوشلسٹ معاشی نمونے، جن کی طرف بیسویں صدی میں مسلمان ممالک غلطی سے کھینچے چلے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ سیکولر پسندوں اور دوسروں کے سیاسی ظلموں نے، ......افسوسناک طور پر راستے کو روک دیا۔

صرف خلیجی ممالک ہی، تیل کی دولت کی مہربانی سے، دولت مند ہوگئے، لیکن دولت آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے مترادف نہ تھی۔ موخرالذکر مواقع اور معروضی قوانین کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ ایسے کاروباری افراد کا بھی تقاضا کرتی ہے، جو عقلیت پسندانہ فیصلے کرنے کے اہل ہوں، اور ایک ایسی خوب تعلیم یافتہ پیشہ ور کارکُن نفری کا تقاضا کرتی ہے، جو نہ صرف معیشت کو بلکہ معاشرے کو بھی تبدیل کرسکیں۔ یہ قوتیں زیادہ قابلیت پر مبنی ثقافت پیدا کرسکتی ہیں، اور ورثتی ڈھانچوں کو ختم کرسکتی ہیں، جیسا کہ قبائلی عصبیتیں۔ سرمایہ داری کی حرکیات جلد ہی خواتین کارُکن نفری کی خدمات کا بھی تقاضا کرتی ہے، جو عورتوں کو اختیارات ملنے پر منتج ہوتی ہے۔

تیل کی دولت ایسا کچھ بھی نہیں کرتی۔ جیسا کہ فرید زکریا لکھتا ہے ''تیل سے مالا مال ریاستوں کی دولت مثبت سیاسی تبدیلی پیدا نہیں کرتی'' اور اُن کے لوگ ''بنیادی طور پر ویسے ہی رہتے ہیں جیسے کہ وہ پہلے تھے......غیر تعلیم یافتہ اور غیر ہنر مند''۔(۶۶) دوسرے لفظوں میں، ہوسکتا ہے آپ ریاض میں ایک تیل سے مالا مال شیخ ہوں اور رولز رائس چلاتے ہوں، لیکن اپنے سماجی

MashalBooks.org

تعلقات میں قبائلی ہی رہیں، اپنی بیوی کو گھر پر رکھیں، اور اپنی بیٹی کیلئے کسی اور شیخ سے شادی کا انتظام کریں لیکن اگر آپ استنبول میں ایک مسلمان کاروباری ہیں، جو مسلسل معیشت کے چیلنجوں سے نمٹ رہے ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کیوں بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے، اور آپ اُسے ایک امریکی یونیورسٹی میں بھیجنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اصلاح کے متلاشیوں کو، مسلمان معاشروں کو ''مغربیانے'' کیلئے آمرانہ کوششوں پر توجہ مرکوز نہیں کرنی چاہیے...... چہ جائیکہ اُنہیں ''آزاد کروانے'' کیلئے جنگوں اور فتوحات کی کوششیں کی جائیں...... بلکہ یہ دو اہم حرکیات کی تائید کرنے پر مرکوز کرنی چاہیے: جمہوریت اور آزاد معیشت۔

ایک ایرانی نژاد امریکی مسلم عالم اور اوباما انتظامیہ کے مشیر، ولی نصر اپنی ۲۰۰۹ کی کتاب (Forces of Fortune)(مقدّر کی قوتیں) میں، ایسا ہی نقشہ بناتے ہیں، مسلم دُنیا میں آزادی پسندانہ جمہوریت کیلئے زمین ہموار کرنے کیلئے تجارت کی اہمیت پر بجا طور پر زور دیتے ہوئے۔ وہ ایک کامیاب مثال کے طور پر دو ممالک کو پیش کرتا ہے: ترکی اور دُبئی (٦٧) اگرچہ دُبئی دونوں میں سے زیادہ چمک دمک والا اور نگاہوں کو کھینچنے والا ہے، لیکن یہ ایک چھوٹی سی شہری ریاست ہے جو چند دہائیاں پہلے اُبھری، دوسری طرف، ترکی، کی تاریخ بھی ہے اور، امریکی سیاسی تجزیہ نگار گلر کے الفاظ میں ''مسلمان دُنیا میں ایک مرکزی ریاست بننے'' کی دور حاضر کی صلاحیت بھی ہے'' (٦٨) اور ہاں، یہ اُسی راستے پر چل رہا ہے۔

تُرکی نمونہ ملک سے باہر سفر کرتا ہے

مئی ۲۰۰۹ء میں، ملائشیا تھینک ٹینک کی دعوت پر جو کہ ایک آزاد ادارہ ہے، ''اسلام اور مذہبی آزادی'' کے موضوع پر گفتگو کرنے کیلئے، میں نے کوالالمپور کو پرواز کی۔ مسلم مالیز اور دوسرے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے، میں نے یہ استدلال کیا، کہ کسی بھی شخص کو، جو اسلام سے کسی دوسرے مذہب میں جانا چاہتا ہے، ایسا کرنے کیلئے آزاد ہونا چاہیے، کیونکہ 'مذہب میں جبر' نہ صرف یہ کہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ عام فہم کے بھی۔

جہاں سامعین کی طرف سے ردِّعمل زیادہ تر مثبت، اگرچہ ملا جُلا تھا، وہیں ایک دوسرے

مقرر جو کہ پی اے ایس اسلامی پارٹی آف ملائشیا، کے ممتاز رُکن تھے۔ میرے ساتھ صرف خاموشی سے اتفاق کر سکے۔ اُنہوں نے سرگوشی کی ''میں اور دوسرے ہماری جماعت کے دوسرے اصلاح پسند اُس سے اتفاق کرتے ہیں جو آپ نے کہا، لیکن پارٹی میں اربکان پسند انتظامیہ، جو اردگان پسند کہتے ہیں، کھلے ذہن کے نہیں ہیں۔'' ظاہری طور پر، اربکان اور اردگان کے درمیان فلسفیانہ اختلاف...... جو ترکی سیاست میں دو مثالی نام ہیں...... نے پانچ ہزار میل دُور ایک مسلم ملک میں ایک بحث کو اُبھارا تھا۔

یہ ایک بڑے مظہر کی بہت سی مثالوں میں سے محض ایک مثال ہے۔ اکیسویں صدی کا پس کمالی تُرکی، دُنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے کہیں زیادہ اہم بن چکا ہے جیسا کہ فُلر تحریر کرتا ہے۔ درحقیقت ''بہت سے مسلمانوں نے'' طویل عرصے سے ترکی کے اپنے تاریخی اور ثقافتی ماضی سے ناتا توڑنے کو، ایسا انتہا پسندانہ عمل سمجھا ہے، کہ اس نے اس کے تجربے کو اُن کیلئے بے محل بنا دیا ہے'' ،لیکن ''ترکی اسلام کا نیا چہرہ، خاص طور پر اس کے ارتقا پذیر سیاسی تناظر کے اندر، ہر جگہ مسلمانوں کو، روز افزوں طور پر نظر فریب بن رہا ہے''۔ (٦٩)

یہ نیا ترکی، صرف اسلام اور جمہوری سرمایہ داری کا کامیاب مرکب ہی پیش نہیں کرتا اے کے پی کے وزیر خارجہ، احمد ڈیووتو گلو (Ahmat Davutoglu) کی طرف سے وضع کی گئی بصیرت کی حاصل حکمت عملیوں کے تحت، یہ شرق اوسط کے مسلمانوں، بلکہ اس سے بھی آگے مسلمانوں کے حالات میں تعمیری کردار ادا کرتا ہے۔ بعض خاص معاملات میں،...... جیسا کہ ۲۰۰۳ میں یو ایس کے عراق پر حملے کی حمایت، اور ۲۰۱۰ میں یو ایس کی قیادت میں ایران کے بارے میں پابندیوں کے ووٹ کی حمایت کرنے سے انکار...... ترکی خارجہ پالیسی کا یہ رویہ، واشنگٹن کے رویے سے مختلف تھا، اور اس نے امریکہ میں ابروؤں کو کھڑا کر دیا، بلکہ اس بارے میں بحث پر مجبور کر دیا کہ ''ترکی کو کسی نے کھویا''۔ تاہم ان معاملات میں، ترکی حکومت محض عملی انداز سے کام کر رہی تھی، اور عوامی رائے کے مطابق، جس نے شرقِ اوسط میں، بطور ایک جمہوریہ کے ملک کے وقار میں مزید اضافہ کیا۔ (٧٠) (''جمہوری'' بعض لوگوں کو نوٹ کرنے کی ضرورت ہے، کا مطلب واشنگٹن کا ''اندھا حمایتی'' بننا نہیں ہے)

یہ نیا ''ترکی نمونہ'' ۲۰۱۱ کے اوائل کی ''عرب بہار'' میں بالکل فضا میں موجود تھا، جن کے

MashalBooks.org

دوران پہلے تیونس اور پھر مصر کے طویل عرصے کے آمروں کا تختہ عوامی احتجاجات کے ذریعے اُلٹا گیا۔ جب یہ کتاب چھاپہ خانے میں جارہی تھی، تو ایسے ہی احتجاجات، دوسری عرب شخصی حکومتوں جیسا کہ لبیا اور بحرین کی شخصی حکومتوں کو ہلا رہے تھے، اور عرب دُنیا میں ایک زیادہ جمہوری دور بظاہر طلوع ہو رہا تھا۔

اور اب ''ترکی ماڈل'' موجود ہے، اس لئے نہیں کہ کسی شخص نے اسے لاگو کیا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اے کے پی کے پس اسلام پسندی، آزادی پسندی کی کامیابی نے، پورے خطے میں زیادہ روشن خیال فعال لوگوں کو اُبھارا۔ تیونس میں جہان کی آمریت کمالی ترکی سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھی، پردے پر اور دوسرے اسلامی معمولات پر پابندی کے ساتھ، اسلامی تحریک کے رہنما، راشد غنوچی (Rached Ghannouchi)، جو کہ بہر حال ایک آزاد خیال مفکر ہیں نے سرعام کہا کہ اُس کی تحریک ''ترکی مثال کی تعریف کرتی ہے'' (۷۱) چند ہفتے اور، مصر کی اخوان المسلمون کے ایک رہنما اشرف عبدالغفار نے کہا، کہ اُس کی تنظیم ''اے کے پی، [مفتی] مبارک کے بعد مصر کیلئے ایک نمونہ ہوگی''۔ (۷۲)

آگے کا راستہ

بلاشبہ، ترکی خواہ کتنا ہی مرکزی کیوں نہ ہو، یہ تنہا مسلم دُنیا کے مستقبل کی تشکیل نہیں کرسکتا۔ البتہ جو کچھ یہ کرسکتا ہے اور کر رہا ہے، وہ اسلام، جمہوریت اور سرمایہ داری کے امتزاج کی ایک مثال پیش کرنا ہے۔

ترکی کے زیادہ قدامت پرست مسلمان مفکرین، اب بھی ملک کی منکشف ہوتی ہوئی منزل پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں، جسے وہ ''اسلام کی پروٹسٹنٹ سازی'' کہتے ہیں اور وہ اس کے اسلامی اقدار کو تباہ و برباد کرنے کی پیش بینی کرتے ہیں۔ اُن کے پاس بھی ایک نکتہ ہے، اگر مسلمان ایک نئی طبقہ اوسط کی ایسی ثقافت کی تعمیر نہیں کرسکتے جو جدید تناظر میں، اسلامی اقدار کا اظہار نہیں کرتی اور اس کو حیاتِ نو نہیں دیتی، تو وہ بلاشبہ سیکولر بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کا حل قدیم اور جامد کے ساتھ چپکنا نہیں ہے، جنہیں غائب ہو جاتا ہے، بلکہ حرکی اور نئے کو گلے لگانا ہے، اور ایسا بطور مسلمانوں کے کرنا ہے۔

یہ ادراک یقیناً، اسلام پسندوں کے ادراک سے مختلف ہے، جو اسلامی ریاست کے آمریت پسندانہ خواب کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ اسلام کی عالمی چودھراہٹ کی۔ لیکن یہ سیکولر پسندوں کے خواب سے بھی مختلف ہے، ترکی میں یا مغرب میں، جو ایک مکمل طور پر ایک اسلام سے پاک دُنیا دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں......اور حقیقتاً کسی بھی قسم کی مذہبی اقدار کے بغیر دُنیا کی۔ لیکن یہ ایک ایسا ادراک بھی ہے جو صحیح ......اور اُمید افزا ہے۔ والٹر رسل میڈ (Walter Russell Mead) جو کہ ''امریکہ کا خیالات اور اُن کے نتائج کا سب سے بڑا تخلیق کار'' ہے، بجا طور پر بیان کرتا ہے:

> ''آخر کار'' جب اور اگر اسلام ایک متحرک معاشرے کے ساتھ صلح کرتا ہے، تو یہ ایسا صرف ایک ممکن طریقے سے کرے گا۔ یہ اپنے آپ کو الحاد کی کسی نرم شکل میں ''سیکولر نہیں بنائے گا'' یہ کسی Post confessions unity religion مذہب کے ساتھ مخلوط نہیں ہوگا، جو تمام مذاہب کو بنیادی طور پر ایک سمجھتا ہے بلکہ نا قابلِ مواخذہ دقیانوسیت، نمایاں نیکی، قدامت پسندانہ اصولوں، اور اپنے مذہب کیلئے عظیم جذبہ کے حامل پارسا مسلمان دُنیا کو یہ دکھائیں گے کہ حرکی اسلام کیسا ہوسکتا ہے۔ اُن کی مثال، ادراک اور تعلیم سے متاثر ہو کر، پوری دُنیا کے مسلمان، زیادہ گہرائی سے اپنے مذہب کی دُنیا میں داخل ہوں گے، اُسی لمحے وہ اپنے آپ کو ایک حرکی، آزاد خیال، اور سرمایہ دار دُنیا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ پائیں گے، جو کہ بہت سے مذاہب اور بہت سی ثقافتوں سے بھرپور ہے۔'' (۷۵)

یہ بلاشبہ آگے کا راستہ ہے۔ اگر مغربی طاقتیں مدد کرنا چاہتی ہیں، تو اُنہیں مسلم دُنیا میں معاشی ترقی اور سیاسی آزادی پسندی کی حمایت کرنا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں اُن سماجی قوتوں کو مضبوط بناتی ہیں، جو مثبت تبدیلی کیلئے دباؤ ڈالتی ہیں، لیکن اُنہیں سیاسی کشمکشوں اور خصوصاً فوجی تصادمات سے گریز کرنے میں محتاط رہنا چاہیے جو صرف رجعت پسند عناصر کو تقویت دیتے ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ، پُرزور طریقے سے یہ ثابت کرتی ہے کہ جہاں مغرب اور دُنیائے اسلام کے درمیان ثقافتی اور معاشی میدانوں میں، پُرامن تعلقات، آزادی پسند مسلمانوں کے نصب العین کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے، وہیں کشیدگیوں، تصادات اور حملوں نے ہمیشہ

MashalBooks.org

انتہا پسند طبقات کو تقویت دی ہے۔

لیکن اُن آزادی پسند مسلمانوں کو گھر پر بہت سا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ دو متضاد لیکن باہمی طور پر ایک دوسرے کو بڑھانے والے نظریات۔ سیکولرازم اور اسلام پسندی، کا ایک صدی طویل غلبہ نے اسلامی آزادی پسندی کی ذہنی اپیل کو روک دیا ہے……اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے نظریاتی کاموں سے آگے جانا چاہتے اور مقبول عام بننا چاہیے۔ مسلم معاشروں کو آزادی کیلئے زیادہ موثر دلائل سننے کی ضرورت ہے۔ سید قطب سے ایک اصطلاح مستعار لیتے ہوئے، اُنہیں، اس طویل اور صبر آزما راستے کو طے کرنے کیلئے کچھ نشاناتِ راہ کی ضرورت ہے۔

لہٰذا ایک معمولی لیکن باتشویش مسلمان کے طور پر، مجھے اپنا حقیر حصہ ڈالنے کیلئے، آنے والے ابواب میں، ان میں سے چند، پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔

MashalBooks.org

حصہ سوم

آزادی پسندی کے راستے پر نشاناتِ راہ

مذہبی آزادی کو پہچاننے کیلئے، اسلامی فکر میں، اہم ترین ذریعہ، اس کے بنیادی اصول میں پنہاں ہے: اللہ کی عظمت کی بہت طاقتور اسلامی بصیرت۔...... مائیکل نووک، قدامت پسند مفکر

MashalBooks.org

باب 9

ریاست سے آزادی

سماجی انجینئر باہر سے شروع کرتے ہیں، وہ پہلے سیاسی اور سماجی نظام مرتب کرتے ہیں پھر اندر کی طرف حرکت کرتے ہیں، فرد کی طرف۔ خُدا اندر کی طرف سے شروع کرتا ہے، پہلے فرد کو تبدیل کرنے سے۔

ونسٹ کورنل (Vincent Cornell)، اسلامی علوم کے پروفیسر (۱)

پیغمبر محمدؐ کی زندگی کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعات غیر معمولی طور پر عجیب ہیں۔

پہلا واقعہ، بدر کی مشہور جنگ، جو ۶۲۴ میں مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے کفار کے درمیان واقع ہوئی، سے بالکل پہلے، پیغمبرؐ اور آپ کے ایک صحابی کے درمیان ایک مختصر سی گفتگو ہے۔ جنگ سے پہلے والی رات، مسلم فوج کو قریب ہی خیمے لگانا تھے، اور پیغمبرؐ نے، بطور کمانڈر انچیف، ایک جگہ تجویز کی۔ لیکن آپ کے ایک صحابی المنذرؓ نے محسوس کیا، کہ بلند تر مقام پر ٹھہرنا زیادہ قابلِ ترجیح ہوگا۔ لہٰذا آپؓ چل کر پیغمبرؐ کے پاس آئے اور کہا ''یا رسول اللہؐ، کیا آپ کی یہ رائے خدا کی طرف سے وحی پر مبنی ہے، یا یہ جنگی ترکیب ہے؟'' پیغمبرؐ نے جواب دیا ''کوئی وحی نہیں، محض جنگی ترکیب ہے۔''

''تو پھر یہ خیمے لگانے کیلئے عسکری لحاظ سے موزوں ترین جگہ نہیں ہے'' المنذرؓ نے کہا۔

آپ نے ایک ایسا مشورہ دیا جسے پیغمبرؐ نے پسند کیا اور اُس پر عمل کیا۔ مسلم روایت یہ کہتی ہے کہ یہ وہ مشورہ تھا جس نے جنگ جیتنے میں مدد دی۔ (۲)

اس واقعے کے بارے میں جو چیز دلچسپ بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ اُس فرق کو واضح کرتی ہے، جو قرونِ اولیٰ کا مسلمان خُدا کی وحی اور پیغمبرؐ کے ذاتی فیصلے کے درمیان کرتے تھے۔ واضح طور پر، موخر الذکر سے آپ اختلاف کر سکتے تھے...... بشرطیکہ اُس کی اچھی وجہ ہو۔

دوسرا واقعہ بھی اسی اصول پر زور دیتا ہے۔ یہاں بھی، خبر کے مطابق، پیغمبرؐ نے اپنے مسلمان ساتھیوں کو کھجور کی کاشت کے متعلق مشورہ دیا، لیکن آپ کی تجویز مددگار ثابت نہ ہوئی۔ لہٰذا آپ نے یہ کہہ کر مزید مشورہ دینے سے انکار کر دیا، ''میں صرف ایک بشر ہوں۔ اگر میں تمہیں مذہب سے متعلق کچھ کرنے کو کہوں تو، اسے مان لو۔ لیکن اگر میں اپنے ذاتی مشورے کی بنیاد پر کچھ کرنے کو کہوں، تو پھر [یاد رکھو] میں صرف ایک بشر ہوں'' (۳)

ان دونوں واقعات سے، جو اُن قرآنی آیات سے جو پیغمبرؐ کی بشریت پر زور دیتی ہیں، مطابقت رکھتے ہیں، مسلمان دو اہم سبق سیکھ سکتے ہیں، پہلا، صرف خُدا تعالیٰ ہی سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا ہے۔ تمام انسان، بشمول خدا کے پیغمبروں کے، غلطی کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ پیغمبر انتہائی پارسا ہوتے ہیں اور اُنہیں خُدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ لہٰذا اُنہیں مسلمانوں پر ایک محکم حاصل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کو ''خُدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت'' کا حکم دیتا ہے۔ (۴) لیکن پھر بھی خُدا کے پیغمبر سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے، پورے لازم احترام کے ساتھ، جب وہ اپنے ذاتی فیصلے کی بنا پر، اور خُدا سے کسی براہِ راست رابطے کے بغیر، کوئی عمل کر رہا ہو۔

دوسرا، ایک ایسی دُنیا میں جہاں پیغمبر تک کو بھی ایک غیر مسئولہ حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ تو کسی کو بھی حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبرؐ کا امتیاز اُس وحی کی وجہ سے تھا جو آپ کو خُدا کی طرف سے ملتی تھی، لیکن اس بات پر اسلامی اتفاق رائے ہے، کہ آپ کی وفات ہر قسم کی وحی کے اختتام کی علامت ہے۔ لہٰذا مابعد محمدؐ دُنیا میں، کسی بھی شخص کے بارے میں یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ خُدا کے ساتھ اُس کا براہِ راست رابطہ ہے، اور لہٰذا وہ مسلمانوں کیلئے غیر مسئولہ حاکم ہے۔ دوسرے لفظوں میں مابعد محمدؐ دُنیا میں، کوئی بھی شخص جائز طور پر، ''خُدا کی حکومت'' یا مذہبی حکومت قائم کرنے کا دعویٰ

MashalBooks.org

نہیں کرسکتا۔

مذہبی حکومت؟ کیسی مذہبی حکومت؟

سُنّی مسلمانوں کیلئے، یہ دعویٰ کہ پیغمبرؐ کے بعد سے لے کر کوئی انسان خُدا کی طرف سے رہنمائی یافتہ نہیں ہے، کوئی خبر نہیں ہے...... یہ اُن کے اتفاقِ رائے کا ایک حصہ ہے۔ سُنی روایت یہ یقین رکھتی ہے کہ پیغمبرؐ کے پہلے چار خلفا، خلفائے راشدین، خصوصی دانش اور پارسائی کے حامل تھے۔ لیکن اُن کا دور کب کا گزر چکا۔ مزید برآں، یہ حقیقت کہ مسلم معاشرہ اس مثالی دور کے دوران خانہ جنگی کی طرف دھکیلا گیا، اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس دور کو بہت زیادہ مثالی قرار دینا غیر حقیقت پسندانہ ہے، بعد کے خلفا تو ان سے بھی کم اعتماد کے حامل تھے۔ زیادہ تر بدعنوان اور غیر پارسا تھے جن کی زیادتیوں کو صرف شریعت کی حاکمیت کے ذریعے ہی قابو میں رکھا جاسکتا تھا۔ اُن میں سے کچھ نے شان وشوکت والے خطابات بھی غصب کر لئے تھے، جیسا کہ ''ظلّ اللہ علی الارض'' (زمین پر خُدا کا سایہ)، لیکن یہ بعداز قرآن گھڑے گئے افسانے تھے، جو سیاسی محرکات کے تحت گھڑے گئے۔

المختصر، سُنّی روایت کی بنیاد پر کسی مذہبی حکومت کی تخلیق بہت مشکل ہے۔ (سُنّی نصب العین بلکہ، ایک ہے۔ یعنی ایک ایسی حکومت جو قانون کی حکمرانی پر مبنی ہو، اور موخر الذکر سے مراد شریعہ ہے)(۵) اس میں کوئی حیرت نہیں کہ اُن لوگوں نے جو سُنّی دُنیا میں مذہبی حکومت کی خواہش رکھتے ہیں، اس کی بنیاد ایک اور مابعد قرآن افسانے میں تلاش کی ہے......یعنی مہدی کا افسانہ، جو کہ یہودی مسیحا کا اسلامی متن ہے۔ لیکن مہدی تحریکین اسلامی تاریخ میں نادر مستثنیات ہیں، یقیناً معمول نہیں ہیں۔(٦)

دوسری طرف، شیعہ مذہبی حکومت کی طرف زیادہ مائل ہیں، کیونکہ وہ خُدائی ہدایت یافتہ اماموں اور آیت اللہ ہا (خُدا کی نشانیاں)، جو اوّل الذکر کی غیر موجودگی میں اختیار سنبھالتے ہیں کے ایک ناشکستہ سلسلے پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم، یہ عظیم آیت اللہ خمینی کی اصولی اختراع تھی، جس نے آیت اللہ ہا کی مذہبی حاکمیت کو سیاسی حاکمیت میں تبدیل کر دیا۔ نتیجتہً، وہ اسلامی جمہوریۂ ایران، جس کی بنیاد اُس نے رکھی، جزوی طور پر مذہبی حکومت کا حامل ہے کیونکہ یہ منتخب شدہ سیاسی

رہنماؤں پر ''اسلامی فقہا کی سرپرستی'' کو قبول کرتا ہے۔ لیکن دوسرے شیعی ماہرین، جیسا کہ عراق کے عزت مآب عظیم آیت اللہ ''السیستانی اس ایرانی جدّت کو مسترد کرتے ہیں، انکساری سے اپنی ''سرپرستی'' کو مذہبی معاملات تک محدود کرتے ہوئے۔

لہٰذا، اسلامی سیاست کیلئے بڑا سوال یہ نہیں ہے، کہ آیا اُمّت کو مذہبی حکمرانوں کو قبول کرنا چاہیے۔ شاذ مسلمان ہی ایسے افراد کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں، جو خُدا کی طرف سے بول سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کسی اور چیز پر یقین رکھتی ہے: حکومت کی اسلامی شکل پر۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسی ریاست جو اُس ''نظام'' پر مبنی ہے جس کا مفروضہ طور پر اسلام حکم دیتا ہے، جس کے بارے میں اُنہیں اُمید ہے کہ اُن مسائل کا حل پیش کرے گی جنھوں نے مسلم معاشروں میں مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً کوئی ایسی چیز ہے؟

حکومت کی اسلامی شکل؟

مبتدیوں کیلئے، قرآن واضح طور پر حکومت کی کوئی تعریف اپنے اندر شامل نہیں کرتا۔ یہ بہ تکرار مومنوں کو پیغمبرؐ کی اطاعت کا مشورہ دیتا ہے، جو مسلم برادری کے سربراہ تھے، لیکن یہ تخصیص نہیں کرتا کہ، جب ایک مرتبہ پیغمبرؐ تشریف لے جائیں گے تو کیا ہوگا۔ ایک آیت صرف اتنا کہتی ہے، ''اطاعت کرو......اپنے میں سے اُن کی جو تم میں سے صاحبانِ اختیار (اولیٰ الامر) ہیں'' لیکن یہ اس کی تخصیص نہیں کرتا کہ وہ کون لوگ ہوں گے، اور وہ اقتدار میں کیسے آئیں گے (۷) قرآن کا ایک اور اکثر بیان کیا جانے والا تصوّر شُوریٰ (باہمی مشورہ) ہے، جس کا مطلب ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے خیالات کو سنیں، لیکن، یہ پھر، تخصیصی حکم نہیں ہے۔ (۸)

دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتاب سیاست کے بنیادی مسائل پر تقریباً خاموش ہے۔ ایک مسلم عالم کے الفاظ میں، اس کی بجائے یہ، یہ تاثر دیتا ہے کہ ''سیاسی حکومت اور انتظام سے متعلقہ معاملات کو الوہی وحی کے دائرے کے اندر خیال نہیں کیا جاتا''۔(۹)

مزید برآں، جیسا کہ مسلم روایت کا موقف ہے، خود پیغمبرؐ بھی سیاسی نظریے کے بارے میں خاموش تھے۔ اپنے بسترِ مرگ پر، آپ نے نہ تو کوئی سیاسی وارث چھوڑا، نہ ہی کلیسا کی طرح کا کوئی ادارہ جو اُمت پر حکمرانی کرنے میں، آپ کی عدم موجودگی میں، مدد کرتا۔ آپ کا مشہور خطبۂ حجۃ

MashalBooks.org

الوداع وراثت کے بارے مین بہت نرم اعلان کے ساتھ ختم ہوتا ہے:''میں تمہارے لئے قرآن چھوڑے جا رہا ہوں''، آپ نے محض یہ کہا''تم اسے تھامے رکھنا۔'' (اس جُملے کے دو اور متن۔ قرآن میں یا''روایت'' کا اور یا پیغمبرؐ کے''خاندان'' کا اضافہ کرتے ہیں ...... دو اصطلاحات جو بالترتیب اور واضح طور پر سُنی اور شیعہ تناظرات کی عکاسی کرتی ہیں۔ تاہم، ان متون میں بھی، کسی ایسے سیاسی انفرادی وجود کا کوئی حوالہ نہیں ہے، جو پیغمبرؐ نے پیچھے چھوڑا ہو)۔

لہٰذا، جب پیغمبرؐ نے ۶۳۲ کے موسم گرما میں رحلت فرمائی، تو مسلم اُمہ کے پاس کوئی ایسا سیاسی خاکہ نہیں تھا، جس کی وہ پیروی کرتے۔ لہٰذا اُمت کے اکابرین بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ اُنہوں نے، بغیر کسی حیرت انگیزی کے، اپنے دور اور ماحول کے سیاسی معیارات کے اندر اپنے دلائل دیئے۔ آخرِ کار، قبائلی سردار بنانے کی عرب روایت کے مطابق، اُنہوں نے اپنے گروہ میں سے ایک شخص، ابوبکرؓ کو، مسلم اُمت کے نئے سربراہ کے طور پر منتخب کیا۔

اس طرح وہ ادارہ وجود میں آیا، جسے خلافت کے نام سے جانا گیا۔ یہ ایک وقتی ادارہ تھا، جو انسانوں نے، تاریخی حالت کے مطابق تشکیل دیا تھا۔ یہ یقیناً اسلامی معیارات پر مبنی تھا، ......جن کی عکاسی اس یقین میں ہوتی ہے کہ خلیفہ کو پارسائی، انصاف اور نیکی کے ساتھ حکومت کرنی چاہیے۔ لیکن یہ ساتویں صدی کے عرب کے حالات پر بھی مبنی تھا۔ اگر وہ اوّلین مسلمان ایتھنز کی کسی جمہوریہ کے شہری ہوتے، تو غالباً وہ، اسلامی معیارات کے مطابق ایک اسمبلی کی تخلیق کرتے، نہ کہ محض ایک واحد رہنما کی۔

لیکن، پھر، خلافت کی بنیاد ڈالے جانے کے صرف چند صدیوں بعد، اسے بعض مسلمانوں کی طرف سے، بجائے مسلمانوں پر حکومت کرنے کیلئے ایک وقتی ادارے کے، اسے اسلام کا ایک تقاضا سمجھ لیا گیا، وہ عالم جس نے سب سے پہلے خلافت کو مذہب کی ایک ضرورت کیلئے بطور دلیل پیش کیا، الاشعری تھا، جو، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، روایت پسند مکتبِ فکر کے بانی رہنماؤں میں سے ایک اور دلیل پرست گروہ کا شدید ناقد تھا۔ (۱۰) ایک اور روایت پرست عالم الماوردی نے اس تصور کو مزید پروان چڑھایا اور حکومت کی ایک اسلامی شکل کی نظریہ سازی کی، جس کی ساخت خلافت کے ساتھ ملتی جلتی تھی۔

اسی دوران میں، دلیل پرست مکتبِ فکر کے ہاں کم مطلق العنانی کا رویہ تھا۔ کچھ معتزلیوں

نے یہ استدلال کیا کہ حکومت کوئی مذہبی فریضہ نہیں ہے، اور اگر ہر فرد قانون اور انصاف کی پابندی کرے، تو بغیر کسی ریاست کے بھی امن غالب آ جائے گا۔ (۱۱) دوسرے یہ کہتے تھے کہ حکومت ضروری ہے، ......لیکن عقلیت پسندانہ لحاظات کے تحت، نہ کہ مذہبی احکام کے تحت۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے ابتدائی ابواب میں دیکھا، روایت پرست طبقہ بڑے دھارے کے اسلام پر غالب آ گیا، اس تصوّر کے ساتھ کہ خلافت مذہب کا ایک حصہ ہے نتیجے کے طور پر یہ تصوّر کہ اسلام ریاست سے ناقابلِ علیحدگی ہے، ایک عام طور پر اپنایا جانے والا مسلم رویہ بن گیا۔

ایک عالمی خلافت (سونے اور چاندی کی)

خلافت پر بحث، بیسویں صدی میں، خاص طور پر ۱۹۲۴ کے بعد، جب ترکی حکمران مصطفیٰ کمال اتاترک نے عثمانی خلافت کو ختم کیا، دوبارہ شروع ہوئی۔ میں نے پچھلے ابواب میں اس فیصلے پر تنقید کی، کیونکہ اس نے مسلم دُنیا میں حکمرانی کا خلا پیدا کر دیا، جس نے اسلام پسندی کی مختلف شکلوں کیلئے راستہ کھول دیا۔ تاہم یہ ایک سیاسی جائزہ ہے۔

مذہبی طور پر بات کرتے ہوئے، خلافت کا خاتمہ، کوئی جُرم نہیں تھا، کیونکہ پہلی بات یہ ہے کہ وہ کوئی مذہبی طور پر مطلوب ادارہ نہیں تھا، جیسا کہ ترغیب دینے کے انداز میں، پہلے سیّد بے کی طرف سے ترکی پارلیمان میں، اور بعد میں علی عبدالرزاق کی طرف سے قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی میں استدلال کیا گیا۔ (۱۲)

سیّد بے نے، جو کہ اسلامی فقہ کے پروفیسر ہیں، یہ استدلال کیا کہ خلافت ......کیتھالسزم کی پاپائیت کے برعکس، جو کہ ''مذہبی اور روحانی'' ہے......ایک سیاسی ادارہ تھا، اور اس طرح اس کی جگہ پر ایک مقبولِ عام منتخب حکومت کو لایا جا سکتا ہے۔ (اُس نے یہ دعویٰ بھی کیا: اسلام قانون میں بھی، جیسا کہ علم اور سائنسوں میں، آزادی پسندی کا حامی مذہب ہے)۔ (۱۳)

معاصر مسلم مفکر عبدالوہاب الآفندی، اپنی قابلِ ذکر کتاب Who needs an Islamic State? (اسلامی ریاست کی ضرورت کسے ہے؟) میں، خلافت کے بطور مذہبی طور پر مطلوب ادارے، کے تصور پر تنقید کرتا ہے۔ وہ ہمیں یاد دہانی کراتا ہے ''خلافت اپنے آپ میں کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا، جو کہ انصاف کا حصول اور قوم کا تحفظ ہے۔''

MashalBooks.org

(۱۴) الآفندی استدلال کرتا ہے، کہ اُن روایت پرست علما نے جنھوں نے خلافت کو نصب العین بنایا، محض ذرائع کو مقصد کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ مزید برآں وہ ابتدائی خلفا کے کئے ہوئے ''وقتی فیصلوں'' کو ایسے نظائر سمجھتے تھے جن کی معیاراتی اہمیت ہے۔'' (۱۵)

معاصر اسلام پسند، نہ صرف اُسی غلط تصور کو محفوظ رکھتے ہیں...... بلکہ وہ اسے اپنے سیاسی پروگرام کی بنیاد ہی بنا لیتے ہیں۔ وہ خلافت کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں، اور اس کے دوبارہ قیام کو اپنا بنیادی نصب العین قرار دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر، وہ زیادہ قریبی سلطنتِ عثمانیہ کو نہیں دیکھتے، بلکہ ''اصل'' خلافت ...... جو ساتویں صدی کے عرب میں وجود میں آئی، کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک بنیادی اطوبیا ہے، جس کا مقصد اُس وقت کے سیاسی حالات اور ماحول کو بحال کرنا ہے۔

افسوس، اُنہیں سماجی اور معاشی حالات کو واپس لانے کا شوق بھی ہے۔ ''عالمی خلافت'' کے نصب العین کی سب سے بڑی علمبردار، یوکے میں قائم حزب التحریر، ''ایک سیاسی جماعت جس کا نظریہ اسلام ہے''، ذیل کی تحریر کو فخریہ طور پر اپنے ویب سائٹ پر پیش کرتی ہے۔

''یہ خلافت ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی کرنسی سونے اور چاندی میں بنائے، اور سونے اور چاندی کی بنیاد پر کام کرے، جیسا کہ یہ پیغمبرِ خداؐ کے دور میں تھا۔'' (۱۶)

دلائل کے اسی رُخ کو اختیار کرتے ہوئے، آدمی یہ دلیل دے سکتا ہے کہ ایک خلافہ ریاست، ''جیسی کہ یہ اللہ کے پیغمبرؐ کے دور میں تھی'' کو گھوڑوں اور اونٹوں کی بنیاد پر کام کرنا چاہیے ......نہ کہ کاروں، گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور ''کفار'' کی دوسری ایجادات پر۔ ایک شخص یہ بھی استدلال کر سکتا ہے کہ اس ریاست کو ''جیسا کہ یہ اللہ کے پیغمبرؐ کے دور میں تھی'' اپنے ذرائع مواصلات کا انتظام ذاتی ہرکاروں اور گھریلو کبوتروں کی بنیاد پر...... نہ کہ فون اور انٹرنیٹ کی بنیاد پر، کرنا چاہیے۔ اس حقیقت کی قطعاً پروانہ کریں کہ خود حزب التحریر کے لوگ بہت ممکن ہے، کاریں، ٹرینیں جہاز، اور بالکل واضح طور پر انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوں۔

ایسے تمام دلائل کی غیر معقولیت انتہائی واضح ہے۔ اس کی بنیاد میں اسلام پسندوں کی بنیادی غلطی پنہاں ہے:۔

وہ اس بات کا ادراک نہیں کرتے کہ وہ چیز جسے وہ ''اسلامی ریاست'' کہتے ہیں، اس کے

سوا کہ وہ مسلمانوں کی پہلی نسلوں کا سیاسی تجربہ تھیں، اور کچھ نہیں تھی۔ یقیناً، یہ تجربہ اسلام سے ہدایت یافتہ تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن صدیوں کے وقتی حقائق سے بھی تشکیل یافتہ تھا جن میں وہ رہتے تھے۔

لہٰذا، صحیح سوال یہ ہے: اکیسویں صدی کے مسلمانوں کا سیاسی تجربہ کیا ہونا چاہیے؟

دوسرے لفظوں میں ہمیں ایک تصوراتی ''اسلامی ریاست'' کی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کی بجائے، جیسا کہ الآفندی کہتا ہے، ''مسلمانوں کیلئے ایک ریاست'' کی تلاش کرنی چاہیے۔

جمہوریت کو...... بلکہ ایک سیکولر جمہوریت کو بھی قبول کرنا

جب ایک مرتبہ ہم ''مسلمانوں کیلئے ایک ریاست'' کو تلاش کرنا شروع کر دیں گے، تو ہم اختتام ایک عام فہم حل سے کریں گے۔ کیونکہ کوئی مخصوص مسلمان مذہبی حاکمیت رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور کیونکہ ہر قسم کے مسلمان، متنوع نظریات، خیالات اور خواہشات رکھنے والے موجود ہیں، لہٰذا وہ واحد نظام جو سب کیلئے منصفانہ ہوگا، وہی ہو سکتا ہے، جو ان سب کو سیاسی عمل میں شامل کرے: ایک جمہوریت، جس کا کہ مسلمان مفکر الفارابی نے ایک ہزاری پہلے، ادراک کیا۔ (۱۸)

لیکن پھر بھی ایک بنیادی سوال باقی رہتا ہے: کیا ''مسلمانوں کیلئے اس جمہوری ریاست کا قانونی نظام شریعت پر مبنی ہونا چاہیے؟

پہلی نظر میں یہ سوال بے معنی ہے، کیونکہ اگر ایک ریاست جمہوری ہے، تو اس کے قانون ساز کسی بھی ایسی قانونی روایت کو اختیار کرنے میں آزاد ہیں، جسے وہ موزوں خیال کرتے ہیں۔ اگر وہ رُومی قانون کے کچھ عناصر کو اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں کہنے دیجئے کہ یہ ٹھیک ہے، وہ ایسا کر سکتے ہیں اگر وہ شریعہ کی مطابقت میں قانون سازی کرنا چاہتے ہیں، تو یہ ٹھیک ہے۔ اس کی منطق، اُس استدلال سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی جو یو ایس کی بعض ریاستوں میں سزائے موت کی حمایت میں استعمال کیا جاتا ہے...... کہ یہ ''خُدا کا قانون ہے''

تاہم، ''خُدا کے قانون'' کے عناصر کو جمہوری عمل کے ذریعے شامل کرنا ایک چیز ہے، اسے ایک سرکاری اصول کے طور پر قانون بنانا ایک اور چیز۔ موخر الذکر صورت میں نظام دو وجوہات کی

MashalBooks.org

بنا پر جمہوری نہیں رہے گا۔ اوّل، ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص خُدا کے قانون، پر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ انتہائی قدامت پرست مسلمان معاشروں میں بھی سیکولر اور غیر مسلم شہری شامل ہیں، جو دوسرے قوانین کو ترجیح دیں گے۔ دوم، ایسا نہیں ہے کہ ''خُدا کے قانون'' کی تعریف پر ہر شخص متفق ہے۔ شریعت کی ہمیشہ بہت سی مختلف تعبیرات رہی ہیں، اور ان تعبیرات کی تعداد آج زیادہ جدّت پسند مکاتبِ فکر کے آغاز کے ساتھ بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا جب بھی ریاست شریعت کو اپنا سرکاری قانونی ضابطہ بنانے کا فیصلہ کرے گی، تو یہ ناگزیر طور پر، اس کی بہت سی ممکن تعبیرات میں کسی ایک کو اختیار کرے گی، اور باقی سب کو ایک طرف کر دے گی۔ اور اس صورت میں، ''خدا کا قانون'' خُدا کا قانون نہیں رہے گا۔ یہ صرف انسانوں کا قانون ہوگا...... ایسے انسانوں کا جو بزعم خود پارسا اور اس قدر خود پرست ہوں گے کہ خُدا کے ذہن کو جاننے کا دعویٰ کریں گے۔

پس، ''شریعہ پر مبنی جمہوریت'' نہ تو جمہوریت ہوگی، اور نہ ہی شریعت پر مبنی۔ یہ صرف ایک آمرانہ ریاست ہوگی، جو شریعت کے اپنے متن کو نافذ کرتی ہے، جو لازمی طور پر اس کے اپنے موضوعی اور زمینی مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ (یا یہ اُن مسلمانوں کے اندر کشمکشوں اور تصادمات کی طرف لے جائے گی، جو شریعہ کے مختلف متون پر یقین رکھتے ہیں) اس کے لئے ایک قابلِ مطالعہ مثال ''قوانین کو اسلامی بنانے'' کی پاکستان کی ناکام کوشش ہے، جو داخلی کشمکشوں پر منتج ہوئی، کیونکہ مختلف مذہبی دھڑے اس چیز پر کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ سکے کہ حقیقی اسلامی قانون کیا ہے) (۱۹)

عبداللّٰہی احمد النا عم (Abdullahi Ahmed An-naim) جو کہ ایک ایموری یونیورسٹی میں سوڈانی نژاد قانون کے پروفیسر ہیں، نے اس مسئلے پر بہت عمدہ لکھا ہے۔ ''[شریعت] کا، ریاست کی جابرانہ قوّت کے ذریعے نفاذ، اس کی مذہبی نوعیت کی نفی کرتا ہے۔'' کیونکہ مسلمان ریاست کے قانون کی پابندی کر رہے ہوں گے، اور بطور مسلمان اپنے مذہبی فرائض آزادانہ طور پر اور نہیں کر رہے ہوں گے'' (۲۰) وہ استدلال کرتا ہے، لہٰذا، مسلمانوں کیلئے بہترین ریاست سیکولر ریاست ہے، جو لوگوں کو ''ایمان اور آزادانہ انتخاب کی بنیاد پر مسلمان بننے کی گنجائش پیدا کرے گی، جو وہ واحد طریقہ ہے جس سے کوئی مسلمان ہوسکتا ہے'' (۲۱)

اس موقع پر، غالباً ہمیں، ایک سیکولر ریاست اور ایک سیکولر پسند ریاست میں فرق پر غور کرنا چاہیے۔ اوّل الذّکر ایک ایسی ریاست ہوتی ہے، جو مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتی ہے،

اور اپنے شہریوں کے، اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق تسلیم کرتی ہے۔ دوسری طرف ایک سیکولر پسند ریاست، مذہب مخالف ہوتی ہے، اور عوامی زندگی میں، شہریوں کی انفرادی زندگیوں میں، اس کے اثر کو دبانا چاہتی ہے۔ (۲۲) اسلام، یا اس مقصد کیلئے، کسی بھی دوسرے مذہب کیلئے...... سیکولر پسند ریاستوں کے ساتھ مفاہمت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو سیکولر لوگوں کے ساتھ کیوں مطمئن نہیں ہونا چاہیے، جو مذہبی آزادی کی قدر کرتے ہیں؟

اسلام پسندی کے بغیر شریعت

درج بالا سوال پر اعتراض، سیکولر ریاست اور اُن دو اہم تصوّرات، جن کے بارے میں مسلمان ہمدردی رکھتے ہیں: ''سیاسی اسلام'' شریعت کے مابین دیکھی جانے والی کشمکش سے آتا ہے۔ آیئے ہم ایک ایک کر کے ان پر نظر ڈالیں۔

پچھلی کچھ دہائیوں میں، سیاسی اسلام کی اصطلاح بعض معقول وجوہات کی بنا پر، خاص متنازعہ بلکہ بدنام ہو چکی ہے: اس پر اسلام پسندوں کا غلبہ ہے، جن کا نصب العین ایک ایک جماعتی ''اسلامی ریاست'' کا قیام ہے۔ لیکن در حقیقت، واقعی ایک سیاسی اسلام ہوسکتا ہے، جس کا نصب العین، جمہوریت کے اصولوں کے اندر، محض اسلامی اقدار کی نمائندگی اور اُن کا دفاع ہو، اسلام کی کچھ بنیادی اقدار...... جیسا کہ انصاف، انسانی حقوق اور خاندانی اقدار...... کے واضح طور پر سیاسی مفہوم ہوسکتے ہیں اور مسلمان اُن کو سیاسی طریقے سے جیسا کہ سیاسی جماعتوں کے ذریعے آگے بڑھانے میں بالکل حق بجانب ہیں۔

ڈاکٹر ناعم اس بات سے اتفاق کرتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ''اسلام اور ریاست کی علیحدگی''، جو کہ ضروری ہے، وہی چیز نہیں ہے جو کہ ''اسلام اور سیاست کی علیحدگی'' ہے۔ یہ اختلاف اس اختلاف سے مشابہہ ہے، جو ایک کمیونسٹ ریاست، جو مارکسزم کو اپنے نظریے کے طور پر اختیار کرتی ہے'' اور ایک جمہوری ریاست، جس کے تحت کمیونسٹ پارٹی ایک جمہوری کھیل کے ایک حصے کے طور پر زندہ رہتی ہے، کے درمیان ہے۔ یہی کھیل اسلام کے مختلف متون کی گنجائش پیدا کرے گا۔ مثال کے طور پر، اسی جمہوری نظام میں، بالکل ایک ''آزادی پسند اسلامی پارٹی'' ہوسکتی ہے، جو کلاسیکی آزادی پسندی اور اس کی آزاد معیشت کو ان اسلامی اقدار کے ساتھ زیادہ

MashalBooks.org

مطابقت پذیر پاتی ہے جن کی وہ علمبردار ہے۔ ایک اور سیاسی جماعت کا نام ''سوشلسٹ اسلامی پارٹی'' ہوسکتا ہے، جو زیادہ ریاست کے زیرِ انتظام معیشت کا دفاع کرسکتی ہے، دونوں یہ دعویٰ کرسکتی ہین کہ اُن کے پروگرام اسلامی اقدار (اور معاشرے) کی بہتر خدمت کرسکتے ہیں، اور پھر ووٹر یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کونسی زیادہ اُمید افزا نظر آتی ہے۔

شریعت کو بھی، ریاست سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے، اور وہ شہری عوام کے دائرے میں، اُن قدامت پسند مسلمانوں کے ایک رہنما کے طور پر باقی رہ سکتی ہے، جو اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق منظّم کرنا چاہتے ہیں...... بالکل ویسے ہی جیسے کٹڑ یہودیوں کی طرف سے کیا گیا ہے، جو بڑے عرصے سے، مغربی ممالک میں، اپنے مذہبی ضابطے حلاخہ کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں۔

برطانیہ ایک اچھی مثال کا مطالعہ ہے...... جو کہ اگر تکنیکی طور پر نہیں تو، اصلاً ایک سیکولر ریاست ہے، اور ایک آزادی پسند ریاست بھی۔ ۲۰۰۸ کے اواخر میں حکومت نے سرکاری طور پر شریعہ کورٹس کے معاملات کے ساتھ نمٹنے اور اگر فریقین اتفاق کریں تو قانونی طور پر نافذ ہونے والے فیصلے کرے۔ صرف ایک سال میں، پورے ملک میں اسی سے زیادہ شریعہ عدالتیں کُھل گئیں، اور ہزاروں برطانوی مسلمانوں نے، زیادہ تر تارکین وطن نے، شادی، طلاق اور وراثت کے معاملات میں اُن میں اپیلیں دائر کیں۔

بلاشبہ، کلاسیکی شریعہ کے کچھ اجزا، جیسا کہ جرائم کی جسمانی سزائیں اس برطانوی نظام میں قابلِ اطلاق نہیں ہیں۔ ایسا ہونے دیں۔ شریعہ کے دوسرے پہلو، جیسا کہ غلامی سے متعلقہ معاملات، بھی ناقابلِ اطلاق ہیں، ایک ایسی حقیقت جو مسلمانوں نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کرلی ہے، یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ دور بہرحال تبدیل ہوگیا ہے۔ درحقیقت کچھ قوانین اتنی جلدی کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ہی، پیغمبرؐ کی وفات کے چند ہی سال بعد، ناقابلِ اطلاق سمجھ لئے گئے تھے، کیونکہ وہ حالات جو پہلے مرحلے پر ان کی قانون سازی پر منتج ہوئے تھے، تبدیل ہوگئے تھے۔ (۲۴) یہ بات ناگزیر ہے کہ جدید تناظر شریعہ میں اس سے بھی زیادہ تبدیلیاں لائے گا۔

یہاں، اہم نکتہ یہ یقین دہانی ہے کہ شریعہ کے ساتھ تمسک ایک رضاکارانہ انتخاب ہے۔ وہ برطانوی مسلمان جو شریعہ عدالتوں میں اپیلیں کررہے ہیں، اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ نہ کہ حکومت یا ''مذہبی پولیس'' کی طرف سے عائد کردہ احکامات پر۔ دوسرے برطانوی

مسلمان بھی جو اپنی عدالتوں میں اپیل نہیں کرتے، اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ اگر میں برطانیہ میں رہ رہا ہوتا، تو میں بھی شریعہ عدالتوں کی ہدایت کو نظرانداز کردیتا کیونکہ وہ روایت پرست مکاتبِ فکر جن کے وہ ہم خیال ہیں، اسلامی قانون کے، میرے غیر لفظی فہم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔

یہ تمام مختلف نقطہ ہائے نظر ٹھیک ہیں، کیونکہ کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے، جو تحکمانہ طور پر انہیں ٹھیک قرار دے سکے۔ اسلام کی پہلی صدی کے مُرجئین (ملتوی کرنے والے) ٹھیک تھے: ہم یقینی طور پر نہیں جان سکتے کہ کسی کی اسلام کی تشریح صحیح یا غلط ہے، لہٰذا ہمیں حتمی فیصلے کو اگلی زندگی پر ''ملتوی'' کرنا پڑتا ہے، کہ وہ فیصلہ خُدا کی طرف سے دیا جائے...... ہم صرف انکسار پسندی سے اُس تعبیر کی پیروی کرسکتے ہیں جسے ہم سب سے زیادہ قائل کرنے والی پائیں۔ جیسا کہ ترکی اسلامی مفکر سید نورسی نے مشہور طور پر لکھا'' آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا مکتبِ فکر سب سے زیادہ پارسا ہے، لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف یہی پارسا ہے۔''

''اسلامیائی گئی سلطنتِ متحدہ'' میں داخل ہوں

تاہم، معاصر اسلام پسند، شریعت کی اپنی تعبیرات کو تمام دوسرے مسلمانوں پر اور 'افسوس' کہ غیر مسلموں پر بھی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ میں ایک ذیلی گروہ، جو ''یوکے کیلئے اسلام'' کہلاتا ہے، یہ حلف اُٹھاتا ہے کہ یہ پورے یوکے اسلامیائے گا۔ یہ جرأت مندانہ طور پر برطانوی ایوانِ پارلیمان پر میناروں کا اضافہ جیسے انوکھے اقدامات کی وکالت کرتا ہے۔ اس گروپ کی ویب سائٹ، جس کا عنوان ہے ''ٹریفالگر سکوئیر شریعہ کے ماتحت'' پر ایک بڑ، اس تاریخی لندن پلازا میں تمام بڑے مجسموں کو تباہ کرنے کا عہد کرتی ہے۔ یہ سائٹ عمدہ طریقے سے یہ وضاحت کرتی ہے، ''تمام مضر منشیات پر غیر مبہم طور پر پابندی لگائی جائے گی'' ظاہر طور پر الکوحل کے مشروبات اور ادویات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

یہاں ظاہر کیا گیا مطلق العنانیت کا خواب، روایت سے بھی آگے جاتا ہے۔ زیادہ تر کلاسیکی علما نے یہ اعتراف کیا ہے کہ شریعہ بنیادی طور پر مسلمانوں کیلئے ایک قانون ہے، اور لہٰذا اس کی بیشتر پابندیوں کا اطلاق دوسروں پر نہیں ہوتا۔ آٹھویں صدی کا حنفی عالم الشیبانی، جو، اسلامی

MashalBooks.org

حکومت کے تحت غیر مسلموں کے حقوق پر ایک مستند تصنیف کے مصنف ہیں، نے اس بات پر زور دیا کہ غیر مسلم اپنے قصبوں میں شراب اور سور کے گوشت کی تجارت کرنے کیلئے آزاد ہیں۔ اگرچہ یہ چیزیں مسلمانوں کیلئے غیر قانونی خیال کی جاتی ہیں۔ (۲۶) لہٰذا، سلطنتِ عثمانیہ جیسی مسلمان ریاستوں میں ایسے شراب خانے تھے جو غیر مسلم چلاتے تھے، جہاں الکوحل کلی طور پر غیر مسلموں کو (کم از کم نظریاتی طور پر) مہیا کی جاتی تھی۔

لہٰذا، انتہا پسند اسلام پسندوں کا جشنِ فیروزمندی، ایک جدید ایجاد محسوس ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا منبع خدمت کرنے کا مذہبی جذبہ نہیں ہے، بلکہ غلبہ پانے کا سیاسی محرّک ہے۔

جیسا کہ برطانوی مسلم ضیاء الدین سردار لکھتا ہے، ''اُس کے بہت سے حصے میں جو اسلامی نظریے، کا سوانگ بھرتا ہے، آمریت فطری طور پر شامل ہوتی ہے'' (۲۷) یہ آمریت زیادہ تر اُس نفرت سے منسلک ہے، جو وہ لوگ جو جدیدیت کے کناروں پر ہیں، اس کے طبقہ بالا کے بارے میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، کہ اسلام فاریو کے جیسے گروپ، یوروپی ممالک میں اُن مسلمان تارکین وطن کی طرف سے تشکیل دیئے گئے ہیں، جن کو اپنے میزبان معاشروں کی طرف سے بیگانہ قرار دیا جاتا اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ تارکینِ وطن ''ثقافتی طور پر جڑوں سے کٹ گئے ہیں'' کیونکہ وہ اپنے آپ کو نہ تو اُن ممالک کا حصہ محسوس کرتے ہیں، جہاں سے آئے ہیں نہ ہی اُن کا جہاں وہ آتے ہیں۔ (۲۸)

''ایسے بددل شہری مکین'' ہمیشہ انتہا پسند نظریات کی طرف مائل رہے ہیں...... عموماً انقلابی بائیں بازو کی مختلف شکلوں کی طرف...... اور اکثر اوقات اُنہوں نے ''شہر سے اس کے بے بنیاد، مغرور، لالچی، زوال پذیر، فضول عالمی پن، کے تصور سے نفرت ظاہر کی ہے۔'' (۲۹) اس کا نتیجہ اکثر اوقات، شکست دینے، غلبہ پانے، اور پھر اُس معاشرے کو تبدیل کرنے جو اس قدر بدعنوانی کا شکار لگتا ہے، کی شدید خواہش ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، انتہا پسند اسلام پسند اگرچہ اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں اور غالباً یقین رکھتے ہیں کہ اُن کا سارا جشن فتح کا جذبہ خُدا کی عبادت کرنے کے جذبے پر مبنی ہے، لیکن یہ اُن کے سماجی نفسیاتی مسائل پر مبنی ہوسکتا ہے...... اور غالباً محض اُن کی اناؤں پر۔ کیونکہ اُن کے نظریے کا ذیلی متن یہ ہے کہ وہی روئے زمین پر سب سے زیادہ پارسا لوگ ہیں اور لہٰذا وہ دوسرے سب

لوگوں پر حکومت کرنے کے مستحق ہیں۔ اگر پوری دُنیا اسلامیائی جاتی ہے، تو نتیجہ، جیسا کہ ایک عسکریت پسند نے بہت واضح الفاظ میں کہا ہے، یہ ہوگا ''کہ مسلمان جیت جائیں گے...... اور پوری دُنیا پر حکومت کریں گے۔'' (۳۰)

غالباً، مسلمان مزید جو کرنے کے بارے میں سوچیں، وہ زیادہ منکسر المزاج ہونا ہے، اور دوسروں کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرنا ہے۔ قرآنِ کریم مسلمانوں کو، دوسروں سے یہ کہنے کا حکم دے کر: ''تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین'' (۳۱) ایسی رواداری کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ بہترین سیاسی نظام، جو اس تمام تکثیریت کیلئے ہم زیست ہونے کی گنجائش پیدا کرے گا۔، وہ سیاسی نظام ہوگا'' جس کی تعریف کسی عقیدے کی طرف سے نہیں کی جائے گی، بلکہ جو ان سب کو آزاد کردے گا۔ دوسرے لفظوں میں، یہ ایک سیکولر ریاست ہے...... جو مدینہ کی ابتدائی شہری ریاست سے زیادہ مختلف نہیں ہے، جو پیغمبرِ محمدؐ نے، یہودیوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر قائم کی۔ (۳۲)

سیکولر ریاست کو قبول کرنا مسلمانوں کیلئے نہ صرف اسلام کی اس انداز سے پیروی کرنے کی گنجائش پیدا کرے گا جس انداز پر وہ صحیح طریقے سے یقین رکھتے ہیں، بلکہ مثالی ''اسلامی ریاست'' اور اس کے نظاموں پر، جیسا کہ ''اسلامی معیشت''...... جو کہ ایک بہت بعد کی ایجاد ہے، غیر مختتم بحثوں کو بھی ختم کردے گا۔ (۳۳) مثال کے طور پر، مسلمانوں کے درمیان، اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا، منافع سود کو، جو کہ جدید بینکنگ کا ایک بنیادی پہلو ہے، قبول کرنا وہی چیز ہے، جو کہ سود (رِبٰو) ہے، جس کی مذّمت قرآن کرتا ہے۔ ایک آزاد معیشت میں ایسا اختلاف ٹھیک ہے، کیونکہ وہ مسلمان جو منافع کو ناپسند کرتے ہیں ''منافع سود سے پاک بینکنگ، کی ترجیح اختیار کرسکتے ہیں، جبکہ دوسرے جو کوئی مسئلہ محسوس نہیں کرتے روایتی بینکوں کے ساتھ کام کرسکتے ہیں۔ (آج ترکی میں یہی صورتِ حال ہے) لیکن اگر آپ ایک آزاد معیشت کی جگہ ''اسلامی'' معیشت لانا چاہتے ہیں، جو آپ اپنی موضوعی تعبیر کے مطابق تشکیل دیتے ہیں، تو پھر پہلے آپ ایک کشمکش پیدا کرتے ہیں، اور بعد میں اگر آپ کامیاب ہوجاتے ہیں، تو جبر پیدا کرتے ہیں۔

سیکولر ریاست کو قبول کرنا، اُس چیز پر توجہ مرکوز کرنے میں مسلمانوں کی مدد کرسکتا ہے جو

MashalBooks.org

حقیقتاً اہم ہے اسلامی تحریکوں نے بیسویں صدی میں اسلام پر مبنی نظاموں کی غیر مختتم تلاش میں، بہت زیادہ وقت ضائع کیا ہے اور بہت زیادہ کشمکش پیدا کی ہے۔ اس کی بجائے جس چیز پر اُنہیں توجہ مرکوز کرنی چاہیے تھی، وہ اسلامی عقیدہ اور ثقافت تھی، ......فنون اور سائنسوں کے ذریعے، تبلیغ اور وکالت کے ذریعے، تعلیم اور خیرات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے۔ یہ تمام چیزیں افراد اور طبقات کی طرف سے جاری رکھی جاسکتی ہیں، ریاست کی پُشت پناہی کے بغیر۔ درحقیقت، یہ چیزیں ریاست کی مداخلت کے بغیر ہمیشہ اچھی طرح ہوسکتی ہیں جیسا کہ امریکی تجربہ ثابت کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کو حقیقتاً جس چیز کی ریاست کی طرف سے ضرورت ہے وہ مذہب نہیں بلکہ مذہب کی آزادی ہے۔

باب 10

گناہ کرنے کی آزادی

تو پھر نیکی کیا ہے، اگر یہ اس چیز کا آزادانہ انتخاب نہیں ہے کہ خوب کیا ہے؟

......ایلِکسس ڈی ٹوکیوولِ (۱)

تصوّر کیجئے کہ میں، ایک خوبصورت دن کو، ایک غالب طور پر مسلمان ملک میں، ایک خاموش پارک میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کہہ لیجئے کہ وہاں آس پاس اور بھی لوگ ہیں جو اسی پارک میں دم لے رہے ہیں۔ جب ظُہر کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ پارک میں موجود ہر شخص، بشمول میرے، مسجد کی طرف رُخ کرتا ہے۔ صرف ایک شخص پارک میں اپنے بینچ پر بیٹھا رہتا ہے۔

اب اگر میں اُس شخص پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالوں تو کیا ہوگا؟ یا اگر میں اس سے بھی آگے جاؤں اور دوسرے مسجد جانے والوں سے بُڑبُڑا کر کہوں: ''اس نامراد شخص کی طرف دیکھو، یہ نماز کی اذان کو نظرانداز کررہا ہے۔''

اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ شخص مسجد کی طرف جانے کا دباؤ محسوس کرے، غالباً جب اگلی دفعہ نماز کا بلاوا آئے تو، وہ عوامی مذمت سے بچنے کیلئے، دوسرے لوگوں کے ساتھ شامل ہوکر مسجد میں چلا جائے۔

MashalBooks.org

اگر یہ مفروضہ ملک سعودی عرب ہو، تو وہ دباؤ جو یہ شخص محسوس کرے گا وہ اس سے بھی زیادہ سخت اور زیادہ براہِ راست ہوا گر مذہبی پولیس کے لوگ آس پاس موجود ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس شخص کو نماز کو چھوڑنے پر لعن طعن کریں اور اُسے دھکیل کر مسجد میں لے جائیں تا کہ وہ عبادت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے۔

دونوں منظر ناموں میں مذکورہ شخص، معاشرے یا حکومت کے دباؤ کے تحت نماز پڑھنے پر مجبور ہوا ہے، نہ کہ اپنے ضمیر کی آواز سے، اور اگر وہ ان دباؤں کے آگے جُھک جاتا ہے، تو وہ اپنے بارے میں اچھا تاثر بنانے کی وجہ سے عبادت کر رہا ہوگا، نہ کہ خدا کی عبادت کرنے کی ایک مخلصانہ خواہش کی وجہ سے۔

لیکن کیا خُدا مسلمانوں سے یہی کچھ چاہتا ہے؟ بڑا سادہ جواب ہے کہ نہیں۔ قرآن کریم میں ایک اقتباس میں خصوصی طور پر اس مسئلے سے نمٹا گیا ہے۔ یہ کہتا ہے: ''افسوس ہے اُن لوگوں پر جو نماز پڑھتے ہیں، اور دکھاوا کرتے ہیں'' (۲) دوسرے لفظوں میں خُدا دکھاوے کیلئے عبادت کرنے کی مذمت کرتا ہے۔ عبادت کلی طور پر عبادت کی غرض سے ہونی چاہیے۔

جبر نہ صرف ایسی مخلصانہ مذہب پرستی کی طرف لے جانے میں ناکام ہوتا ہے: بلکہ یہ اس کا راستہ روکتا ہے۔ اگر ہماری کہانی والے آدمی کو مسجد جانے پر کسی شخص کی طرف سے مجبور نہ کیا جاتا، تو اس کے پاس، آخر کار خُدا پرستی کی طرف، خود سے راستہ تلاش کر لینے کا بہتر موقع ہوتا۔ شاید وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی خُدا پرستی سے متاثر ہوتا، اور اس کے بارے میں سوچتا۔ درحقیقت، وہ یقیناً بہت زیادہ متاثر ہوتا، اگر وہ مسجد جانے والے اُس پر بُری نظریں ڈالنے کی بجائے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ احترام ہمیشہ نفرت کی نسبت زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔

یہ محض ایک عام فہم کی بات ہے۔ لیکن یہ قرآنی دانش بھی ہے، جو اس قسم کی آیات میں منعکس ہوتی ہے، جیسا کہ: ''مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے'' (۳) یا یہ ''اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ تمام لوگ جو زمین پر ہیں ایمان لے آتے، سب کے سب: تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے، اُس وقت تک جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں؟''

تو پھر، کچھ مسلمان معاشروں میں ''مذہب میں جبر'' کا شدید رُجحان کیوں ہے؟'' تو پھر کیوں سعودی مطوّعین کو اور ایرانی باسیج کو ملازم رکھتے ہیں...... وہ سرکاری نفریاں، جن کا کام گلیوں

میں گشت کرنا، اور کسی بھی ناپاک طرزِ عمل کو سزا دینا ہے جسے وہ دیکھیں؟

صحیح کا حکم دینا، غلط سے روکنا

سچی بات یہ ہے، کہ نہ تو سعودی اور نہ ہی ایرانی مذہبی پولیس کلی طور پر اسلامی جواز سے محروم ہیں۔ قرآن میں یقیناً ایک خصوصی تصور موجود ہے، جس کا حوالہ، وہ اور دوسرے آمریت پسند مسلمان معمول کے طور پر دیتے ہیں: ''معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا''۔ قرآن اس کو مسلمانوں کیلئے ایک فریضے کے طور پر پیش کرتا ہے: ''آپ میں سے ایک گروہ ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بُلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔'' (۵) متعدد دوسری آیات اسی فریضے کا تقاضا کرتی ہیں۔ شریعت کے علما نے اس تصور کو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی دی ہے، اور اس بارے میں مفصل اصول وضع کئے ہیں کہ اُن ساتھی مسلمانوں پر جو خُدا پرستی میں خاصے ناکام رہ جائیں، خُدا پرستی کو کس طرح لاگو کیا جائے۔

دُنیا نے اس سب کے بارے میں مزید اُس وقت جانا، ایک صدمے نہ کہ حیرت کے ساتھ، جب افغانستان طالبان کی حکومت کے تحت آ گیا، جنہوں نے ۱۹۹۶ میں، کابل پر قبضہ کرنے کے فوری بعد، نیکی کی تبلیغ اور بُرائی سے ممانعت کیلئے ایک محکمہ قائم کیا۔ اس کے نیم فوجی دستوں نے ہر اُس چیز کو روکنا اور تباہ کرنا شروع کر دیا جسے وہ مذہب کے خلاف سمجھتے تھے...... بشمول شراب اور الکوحل کے، وی سی آروں اور کیسٹ پلیئروں کے، بلکہ پتنگوں اور شطرنج کے تختوں کے۔ عورتوں پر سارے جسم کو لپیٹ لینے والے بُرقعے پہنا دیئے گئے، اور مردوں کیلئے لمبی داڑھیاں فرض قرار دے دی گئیں۔ بلا شبہ طالبان ایک انتہائی صورتِ حال کی نمائندگی کرتے ہیں، بہت سی چیزیں جنہیں وہ حرام سمجھتے ہیں، دوسرے بہت سے مسلمانوں کیلئے بالکل ٹھیک ہوں گی۔ یہاں تک کہ ترکی میں بہت سے قدامت پسند مسلمان، خواتین کیلئے ایک حجاب اور ایک لمبے سکرٹ کو کافی طور پر حیادار پائیں گے، اور یقیناً، پتنگ اُڑانے اور شطرنج کھیلنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں، طالبان کی اوامر و نواہی کی فہرست دوسرے بہت سے مسلمانوں کیلئے ضرورت سے زیادہ طویل ہے۔

لیکن مذہبی احکام کی فہرست کی طوالت ہی صرف واحد مسئلہ نہیں ہے۔ کیا ان احکامات کو

MashalBooks.org

ایک ساتھی مسلمان پر لاگو کرنا کبھی صحیح ہے؟ اگر ایک مسلمان کسی دوسرے کو شراب پیتے، یا نماز کو چھوڑتے ہوئے دیکھتا ہے، جیسا کہ پارک والے آدمی نے کیا، تو کیا اُسے مداخلت کا حق حاصل ہے؟ کیا ''صحیح کا حکم دینے اور غلط سے روکنے'' کے قرآنی فریضے کے تحت ایسا رویہ جائز یا بلکہ مطلوب ہے؟

روایتی طور پر دیکھا جائے تو جواب ''ہاں'' ہے، قرآن کی تعبیر اس انداز سے کی گئی تھی۔ لیکن قرآن اس بارے میں کہ کس چیز کا حکم دیا جائے اور کس چیز سے روکا جائے مخصص ہے۔ اور اس کی ابتدائی تعبیرات اپنے اُس دائرے میں، جو وہ فرض کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ بہت زیادہ معتدل اور محدود ہیں۔ (۶)

مثال کے طور پر قرآن کے ایک ابتدائی دور کے شاح ابوالعالیہ نے یہ استدلال کیا کہ یہ آیت جو ''صحیح کا حکم دینے'' کو مخصوص کرتی ہے، محض ''لوگوں کو شرک سے اسلام کی طرف بُلا رہی ہے۔'' اُس کا یقین تھا کہ اس کے متوازی ''غلط سے روکنے'' کا متوازی فریضہ سارے کا سارا، ''بتوں اور شیطانوں کی پرستش کو روکنے'' کے بارے میں تھا۔ (۷)

بلاشبہ لوگوں کو ایک مذہب کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرنے کیلئے دعوت دینے اور اُس مذہب کو اپنے تمام تفصیلی ضوابط کے ساتھ اُن پر عائد کرنے میں بہت بڑا فرق ہے اور اس فرض کی ابتدائی تعبیر...... جسے ہم محفوظ طور پر زیادہ مستند تعبیر خیال کر سکتے ہیں...... نے واضح طور پر عائد کرنے کی بجائے دعوت دینے پر توجہ مرکوز کرتی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور جوں جوں سُنی کٹڑ پن حتمی شکل اختیار کر گیا، تو ''صحیح کا حکم دینے'' اور ''غلط سے روکنے'' کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ ابوالعالیہ سے دو صدیاں بعد لکھتے ہوئے، مشہور عالم طبری نے استدلال کیا ''کہ صحیح کا حکم دینا'' اُس سب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا خُدا اور اُس کے پیغمبرؐ نے حکم دیا، اور ''غلط سے روکنا'' اُس سب کی طرف اشارہ کرتا ہے، جن سے اُنہوں نے منع کیا ہے۔'' (۸) طبری نے واضح طور پر سمجھ لیا تھا کہ اگر اس فرض کا دائرہ ''خدا اور اُس کے پیغمبرؐ پر ایمان لانے کا حکم دینے تک محدود ہو گیا، تو پھر اس کا مسلمانوں کو شراب نوشی، رنڈی بازی اور موسیقی بجانے پر لعنت ملامت کرنے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔'' (۹)

دوسرے لفظوں میں، یہ قرآن کا واضح حکم نہیں تھا، بلکہ طبری جیسے شارحین کی اپنی ترجیح تھی،

کہ شراب نوشی، رنڈی بازی اور موسیقی سازی، جیسی سرگرمیوں پر دوسرے مسلمانوں کو لعن طعن کی جائے۔ (برسبیلِ تذکرہ، آخری سرگرمی کو قرآن کی طرف سے نہیں، بلکہ اُن علما کی طرف سے جو مسلسل پابندیوں کی فہرست کو توسیع دیتے جاتے تھے۔ ناجائز قرار دیا گیا)۔ مبینہ طور پر ناجائز طرزِ عمل کیلئے سزاؤں کی قانون سازی کرنے کی خواہش بتدریج بڑھتی چلی گئی، اور عظیم امام الغزالی جیسے روایت پرست علما نے ادراک شدہ گناہ کے طرزِ عمل کی تقریباً تمام شکلوں کیلئے پابندیوں کی فہرست بنائی۔ (۱۰)

ظُلم کے تحت خیر؟

پابندیوں کی یہ افراط سختی اور کٹڑ پن کے اُس عمومی رُجحان کا ایک حصہ تھی، جو اسلام کی تیسری صدی میں اُبھرا، جیسا کہ ہم نے باب چہارم میں دیکھا۔ یہ اُس دور کا ہی نتیجہ تھا، جس میں فرد کی آزادی کے تصوّر پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی، اور یہ ایک پارسا معاشرہ کی تخلیق کو لاگو کرنے کی خواہش کے سائے ہیں دب جاتی تھی۔

درحقیقت، قرآن کی دوسری آیات بھی ہیں، جو قرونِ وسطیٰ کے علما کو ''صحیح کا حکم دینے'' اور ''غلط سے روکنے'' کی آیات کو وسعت دے کر جبر کے ایک نظام میں تبدیل کرنے سے روک سکتی ہیں۔ ایک ایسی آیت، اکثر حوالہ دی جانے والی آیت ہے ''دین میں کوئی جبر نہیں'' ہے۔ (۱۱) دلیل پرست گروہ کی کچھ علما نے یقیناً اس آیت پر توجہ مرکوز کی، یہ استدلال کرتے ہوئے کہ اس دُنیا میں...... جسے وہ آزمائش کے ایسے گھر کے طور پر بیان کرتے تھے، جس میں خُدا انسانوں کی آزمائش کرتا ہے...... لوگوں کو اپنے مذہبی انتخابات کرنے کیلئے آزاد ہونا چاہیے۔ لیکن یہ آزادی پسندانہ رویہ کمزور رہا، اور ''کوئی جبر نہیں'' والی آیت نے کلاسیکی علما کی بہت کم توجہ حاصل کی۔ (۱۲)

آزادی پر، قرونِ وسطیٰ میں، توجہ کا یہ فقدان، بدقسمتی تھی، لیکن بہرحال یہ قابلِ فہم تھا۔ انفرادی آزادی کے تصور پر قبل جدیدیت معاشرے میں شاذ ہی زور دیا گیا۔ لہٰذا یہ تصور کہ پارسا معاشرہ جبر کے ذریعے وجود میں لایا گیا اور محفوظ کیا جا سکتا ہے، بہت سے ایمان رکھنے والوں، بشمول اُن کے جو مغرب میں رہتے تھے اتنا شدید غلط نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وسط اُنیسویں صدی تک تاخیر سے بھی، پوپ ابھی تک مذہبی آزادی کی مذمت ایک ایسے ''الحاد کے طور پر [کر رہے تھے]

MashalBooks.org

جسے کوئی کیتھولک تسلیم نہیں کرسکتا‘‘ (۱۳) ۱۹۲۷ میں، پنسلوانیا کی سُپریم کورٹ نے، اتوار کے دن پیشہ ورانہ باسکٹ بال کے خلاف ایک قانون کو برقرار رکھا، یہ حکم دیتے ہوئے کہ یہ ’’ایک شیطانی سرگرمی ہے جو عیسائی سبت کی بے حُرمتی کرتی ہے۔‘‘ (۱۴) اُسی دور میں، امریکا ایک ’’مقدس تجربہ‘‘ کررہا تھا (الکوحل کی ممانعت کا)، جس نے یہ ثابت کیا نیکی کو ریاست کی جبریہ طاقت کے ذریعے نافذ کرنا، نہ صرف ناکام ہوتا ہے، بلکہ دوسرے مسائل بھی پیدا کرتا ہے، جیسا کہ چور بازاری اور منظّم جُرم۔

مُسلم دُنیا کو بھی، جدید دور میں اسی طرح کے نتیجے پر پہنچنے کی ضرورتھی، لیکن اسلام پسند تحریک نے اس کے بالکل اُلٹ کیا ...... نہ صرف ’’صحیح کا حکم دینے‘‘ اور ’’غلط سے روکنے‘‘ کی کلاسیکی تعبیر کو تحفظ دیا، بلکہ اس کو نئی انتہاؤں کی طرف دھکیلا۔ کلاسیکی علما نے، گھروں کی خلوت کو تسلیم کیا، ایک ایسے حق کو جسے قرآن میں شدّت سے تحفظ دیا گیا ہے (۱۵) اسلام پسندوں نے خلوت کی کم طرف بہت کم توجہ دی اور حکم دینے اور منع کرنے کیلئے ایک مشترکہ اور منظّم کوشش کی بہت زیادہ وکالت کی۔ ’’کچھ ایسی چیز جو صنعتی منصوبہ بندی کے مانند تھی۔‘‘ (۱۶)

اگرچہ اس دوران، جدید دُنیا میں مسلمان معاشرے بالکل مخالف سمت میں چلے گئے ہیں۔ جوں جوں مسلمان زیادہ انفرادیت پسند ہوگئے، تو جبر کے خلاف اُن کا ردِّعمل قبولیت کا نہیں بلکہ مزاحمت کا ہوگیا۔ ایک مقبولِ عام کتاب، جو ’’صحیح کا حکم دینے اور غلط سے روکنے‘‘ کے فرض کی وکالت کرتی ہے، کے ایرانی مصنف، اس وسیع پیمانے کی مزاحمت کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس فریضہ کا مطلب لازمی طور پر دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت کرنا ہے، لیکن ’’وہ لوگ جن کے دماغ مغربی تصوّرات سے بھرے ہوئے ہیں، اسے پسند نہیں کرتے۔‘‘ (۱۷)

یہ ’’مغربی تصوّرات‘‘ کُلیۃً مغربی نہیں ہین، بلکہ آفاقی طور پر جدید ہیں ...... وہ انفرادیت پسندی کے قوّت بخش احساس سے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ وسیع تر خواندگی، تعلیم ٹیکنالوجی، اور دوسری ثقافتوں کے ساتھ میل ملاپ کا نتیجہ ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں، مسلم طبقۂ بالا کے، معتزلہ کے ایک چھوٹے سے گروپ کی طرح کے لوگوں کو، غیر ملکی فلاسفہ کو پڑھنے کیلئے لائبریری سے استفادہ کا موقع حاصل تھا۔ اب تقریباً ہر شخص ایسا کرسکتا ہے۔ یہ صرف ایک انٹرنیٹ کے کنکشن کا تقاضا کرتا ہے۔ اب دُنیا میں بہت سے ایسے افراد ہیں، جن کے پاس، آزادانہ طور پر سوچنے کیلئے ذہنی

ساخت اور اُس کے مطابق عمل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔

ایسے افراد نہ صرف جبر کو ناپسند کرتے ہیں، بلکہ اس کا ردِّعمل باغیانہ انداز سے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ اونچے طبقے کے ایرانیوں اور سعودیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عیش پرستی کی راتیں گزارنے کیلئے پرواز کرکے یوروپی دارالخلافوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ جب وہ گھر لوٹتے ہیں، تو وہ پارسا لگتے ہیں، اور اُس چیز کی مذمت کرنا جاری رکھتے ہیں جسے حکومت گناہ سمجھتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ خفیہ طور پر گناہ کرنا جاری رکھتے ہیں۔ چھپ چھپا کر پینا اور فحش ادب اس کی عام مثالیں ہیں۔ رپورٹوں کے مطابق، سعودی عرب میں عورتوں کی جنون کی حد تک علیحدگی، نسوانی ہم جنسی کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ (۱۸)

دوسرے لفظوں میں، جو کچھ جبر پیدا کرتا ہے، وہ حقیقی پارسائی نہیں ہوتی بلکہ منافقت ہوتی ہے ...... ایک ایسی چیز جسے قرآن کفر سے بھی زیادہ بُرا سمجھتا ہے ...... غالباً یہ اُن حکومتوں کیلئے جن کا میں نے ذکر کیا ہے، کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، کیونکہ اُن کی دلچسپی صرف اس چیز سے ہے کہ لوگ بظاہر کیسے ہیں۔ خاص طور پر سعودی حکومت، اپنی سرزمین پر کسی ’’غیر اسلامی‘‘ عمل کی اجازت نہ دینے میں بہت فخر محسوس کرتی ہے اور اس اپنے آپ کو جائز ثابت کرتی ہے۔ اس سیاسی تناظر سے، ایک پاکبازی کا دکھاوا، خاصا اچھا ہوسکتا ہے، لیکن مذہبی تناظر سے، جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں کیا ہے۔

اور یہ چیز ہے، جس پر ہمیں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم آج کی دُنیا میں ’’امر بالمعروف‘‘ اور ’’نہی عنِ المنکر‘‘ کی تشریح کس طرح کرتے ہیں۔

گناہ بمقابلہ جُرم

آیئے پارک والے آدمی کی کہانی کی طرف واپس چلتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اُسے نماز نہ پڑھنے کے اپنے انتخاب کے ساتھ، اکیلا چھوڑ دینا چاہیئے، باوجود یہ سمجھنے کے کہ، روزمرہ عبادت سے غیر حاضر رہ کر، بطور مسلمان کے وہ ایک گناہ کررہا ہوگا۔ لیکن اگر وہ ایک بچے کو ماررہا ہوتا، یا پارک میں گولی چلانے کی کوشش کا آغاز کررہا ہوتا؟ ہم اسے روکنے کی کوشش کرنے میں حد سے زیادہ حق بجانب ہوتے، کیونکہ وہ ایک

MashalBooks.org

جُرم کا ارتکاب کر رہا ہوتا۔

تو لہٰذا، ہم جبلی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ اور جُرم دو مختلف چیزیں ہیں۔ اوّل الذکر فرد کی خُدا کے سامنے ذمہ داری کی خلاف ورزی کے بارے میں ہے۔ موخر الذکر افراد کے بارے میں اُس کی ذمہ داری کی خلاف ورزی کے بارے میں ہے زیادہ تر جرائم، جیسا کہ قتل، چوری اور فراڈ، اسلام سمیت بہت سے مذاہب کے مطابق گناہ بھی ہیں، لیکن اس تقاطع کو دونوں اقسام کے درمیان بنیادی فرق کو دُھندلانا نہیں چاہیے۔

روایتی طور پر اسلامی علما نے ''خُدا کے حقوق'' کو ''انسانوں کے حقوق'' سے جُدا کر کے، یہ امتیاز کیا ہے۔ بطور مسلمان، مثال کے طور پر، اگر میں رمضان کے دوران روزے نہیں رکھتا، تو میں خُدا کی نافرمانی کر رہا ہوں، اور اپنے اوپر اُس کے ''حقوق'' کی پامالی کر رہا ہوں۔ اگر میں اپنے ہمسائے کے مجھ پر قرض کی ادائیگی سے انکار کر رہا ہوں، تو اگرچہ یہ محض گناہ نہیں ہے، بلکہ اُس کے جائیداد کے حقوق کی خلاف ورزی بھی ہے۔

اگرچہ کلاسیکی اسلام میں یہ امتیاز کر دیا گیا تھا، لیکن شریعت کے علما نے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے فریضے کے مطابق ان دونوں خلاف ورزیوں کیلئے سزاؤں کو منضبط کیا تھا۔ لیکن اسلام کا مغز، قرآن، اس کے بارے میں کیا کہتا ہے (یا کم از کم اشارہ ہی کرتا ہے)؟

اس کا جواب، بہت دلچسپ ہے۔ قرآن جُوا کھیلنے، سود خوری اور منشیات پر پابندی لگاتا ہے، اور مردار کے گوشت، خون، سور کے گوشت اور بتوں کے نام پر قربانی کئے گئے جانوروں کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں پر کچھ خاص فرائض ادا کرنے کا حکم بھی دیتا ہے، جیسا کہ روزانہ کی نماز، رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے، زندگی میں ایک مرتبہ مکہ کا حج کرنے، اور غریبوں کو زکوٰۃ دینے کا۔

ان ممنوعات میں سے کسی کی خلاف ورزی کرنا، یا ان فرائض میں سے، بغیر کسی معقول وجہ کے، کوئی فرض ادا کرنے میں ناکام رہنا، ایک گُناہ ہوگا...... جو کہ بڑی سنگین بات ہے، کیونکہ یہ آنے والی دُنیا میں سزا کا موجب بن سکتی ہے، لیکن اس دُنیا میں، مندرجہ بالا گناہوں کیلئے قرآن کسی سزا کا ذکر نہیں کرتا۔

تاہم، یہ چار مخصوص گناہوں کیلئے سزاؤں (حدود) کی تخصیص کرتا ہے: چوری، ڈاکہ زنی، زنا کی تہمت۔ اور زنا کیلئے۔ (۱۹) یہ سزائیں تمام کی تمام جسمانی ہیں، جو اُس ماحول کو مدِّ نظر رکھتے

ہوئے جس میں قرآن نازل ہوا یعنی ایک صحرا میں رہنے والا اسلامی معاشرہ، جس میں اصلاح کی کوئی سہولتیں نہیں تھیں...... بالکل قابلِ فہم ہیں، اگرچہ، آج ہم اِن سزاؤں کی تعبیر کم لفظی طور پر کر سکتے ہیں، جیسا کہ کچھ جدّت پسند مذہبی علما پہلے ہی سے استدلال کر رہے ہیں۔

لیکن اس موقع پر جو چیز ہمارے لئے بنیادی نوعیت کی ہے، وہ سزاؤں کی نوعیت نہیں ہے، بلکہ اُن گناہوں کی نوعیت کی ہے جن کیلئے وہ سزائین مقرر ہیں۔ یہاں ایک عجیب وغریب نکتہ ہے۔ یہ چار قابلِ تعزیر گناہ واضح طور پر اُن دوسرے گناہوں سے مختلف ہیں، جنہیں قرآن نے بغیر تعزیر کے چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان چار صورتوں میں، نہ صرف حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے، بلکہ حقوق العباد کی بھی۔ دوسرے لفظوں میں کسی نہ کسی کو تکلیف پہنچتی ہے،

یہ بات پہلی تینوں صورتوں میں بالکل واضح ہے...... چوری، ڈاکہ زنی، اور زنا کی تہمت میں...... لہٰذا ہمیں زنا پر ذرا باریکی سے نگاہ ڈالنی پڑے گی۔ روایتی طور پر، مسلمان علما کا رُجحان، غیر شادی شدہ افراد کے درمیان جنسی تعلقات کی کسی بھی شکل کو زنا تصور کرنے کا رہا ہے۔ لیکن قرآن کی دوبارہ قرآت یہ اشارہ کرتی ہے، کہ اس اصطلاح کو ماورائے ازدواج جنس تک محدود ہونا چاہیے۔ جو اپنے زوج کو دھوکہ دینا ہے، اور اس طرح دوسرے شخص کیلئے نقصان دہ ہے۔ (۲۰) بہر حال عمومی طور پر جنسی بے حیائی کیلئے ایک اور قرآنی اصطلاح (فحشا) موجود ہے، اور اگرچہ قرآن اس کی بھی بطور گناہ مذمت کرتا ہے، لیکن یہ اس کیلئے کوئی خصوصی سزا تجویز نہیں کرتا۔

اگر یہ تعبیر صحیح ہے...... کہ قرآن ماورائے ازدواج جنسی تعلق کو سزا دیتا ہے، لیکن قبل از دواج کی قسم کی نہیں...... (۲۱) تو پھر ہم محفوظ طریقے سے ایک واضح فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں: قرآن صرف اُنہی جرائم کی سزا تجویز کرتا ہے، جو انسانوں کے حقوق کی خلاف ورزیاں ہیں۔ اُن گناہوں کے نتائج، جو حقوق اللہ کی خلاف ورزیاں ہیں، خُدا پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، جن کے ساتھ اُخروی زندگی میں نمٹا جائے گا۔ (۲۲)

اور یہ چیز ''گناہ کرنے کی آزادی'' کیلئے اسلامی جواز کے ساتھ استدلال کرنے کو ممکن بناتی ہے۔

آزادی کے تحت نیکی

''گناہ کرنے کی آزادی'' کا تصوّر، کچھ مسلمانوں کیلئے دہشت ناک ہوسکتا ہے، لیکن یہ

MashalBooks.org

ترکی میں قبولیت حاصل کررہا ہے، ترکی کے ڈائریکٹوریٹ آف ریلیجیس افیئرز کے سربراہ کی حیثیت سے چوٹی کے مذہبی عالم، ڈاکٹر علی باردا کوگلونے، ۲۰۰۸، میں ٹی وی پر کہا: ''ہم بطور ڈائریکٹوریٹ، اسلام کے معروف اصولوں کا ابلاغ کرتے ہیں......ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہے۔ کسی شخص کو ان میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' (۲۳) دوسری ترکی شخصیات نے، جن میں ثقافت کے وزیر، ایک مقبولِ عام مذہبی عالم، اور ایک مسلم خاتون عالم نے بھی، گناہ کرنے کی آزادی کا سرِ عام دفاع کیا ہے۔ (۲۴)

اُن کے اس آزادی کو تسلیم کرنے کے پیچھے استدلال خالصتاً مذہبی ہے۔ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ، اُخروی زندگی میں، خُدا تعالیٰ، ہر شخص کی اس دُنیا میں بسر کی گئی زندگی کا فیصلہ کرے گا۔ فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ خُدا تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرے اور اُن اعمال سے باز رہے جن سے اُس نے منع کیا ہے۔ لیکن تمام افراد اکثر اوقات اس آزمائش میں ناکام ہوں گے، لہٰذا قرآن اُن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ افسوس کا اظہار کریں اور معافی کیلئے خُدا سے درخواست کریں۔ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ آزمائش زندگی بھر چلتی ہے، بعد کا کوئی بھی گناہ، خواہ وہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، اسے ختم نہیں کرسکتا۔ ایک آیت کہتی ہے کہ ''اگر خُدا تعالیٰ انسانوں کو اُن کی ناانصافیوں کی وجہ سے اُنہیں تباہ کرتا رہتا تو وہ زمین پر کسی بھی ذی روح کو باقی نہ چھوڑتا''۔ لیکن وہ اُنہیں ایک مقرر وقت تک مہلت دیتا [ملتوی کرتا] ہے۔ (۲۵) کیونکہ یہ ''مقرّرہ وقت'' ہر شخص کو خُدا کی طرف سے تفویض کیا جاتا ہے، لہٰذا کسی بھی فرد کی زندگی میں دخل دینا اور اُس کی آزمائش کو مختصر یا ختم کرنا کسی شخص کیلئے غلط ہوگا۔

بلاشبہ، مسلمانوں کو اپنے ساتھی مسلمانوں کو تبلیغ اور زیادہ پارسا بننے کیلئے ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے......اور وہ ایسا کرسکتے ہیں۔ قرآن یقیناً اُن لوگوں کی تعریف کرتا ہے، جو ''ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کو سچائی کی اور صبر کی تلقین کرتے ہیں'' (۲۶) لیکن سچائی کی تلقین کرنا ایک بات ہے اور اسے نافذ کرنا ایک دوسری بات۔ موخرالذکر بے فائدہ، مقصد فوت کرانے والا اور جابرانہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں، مذہبی نیکی کو آزادی کی چھتری تلے تلاش کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کا کام لوگوں کو گناہ سے زبردستی روکنا، نہیں ہونا چاہیے......ایسے طریقوں سے جیسا کہ الکوحل پر

پابندی لگانا، شراب کی دُکانوں کو بند کرنا، یا لباس کا خصوصی ضابطہ نافذ کرنا......ان کا کام لوگوں کو گناہ سے باز رہنے کی دعوت دینا، اور پھر اُنہیں اپنے فیصلے کرنے دینا ہونا چاہیے۔

آدمی، یہ بھی استدلال کرسکتا ہے، کہ گناہ کرنے کے ذرائع دستیاب ہونے چاہیں، تاکہ دُنیا آزمائش کا گھر رہے، جہاں لوگوں کی خُدا کی طرف سے آزمائش ہو۔ مثال کے طور پر، ایک ایسے ملک میں جہاں الکوحل منع ہو، وہاں مسلمانوں کیلئے یہ ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں ہوگا، کہ وہ اس سے اپنی آزادانہ مرضی سے باز رہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایک خاص آیت اس سلسلے میں روشنی مہیا کرسکتی ہے۔ یہ آیت یہ تخصیص کرتی ہے، کہ مسلمانوں کو حج کے دوران کسی جانور کا شکار نہیں کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہتی ہے ''خُدا شکار کے جانوروں کے ذریعے تمہاری آزمائش کرے گا، جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی پہنچ میں آئیں گے'' تاکہ خُدا اُن کو جان سکے جو غیب میں اُس کا خوف کھاتے ہیں'' (۲۷) آدمی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے، کہ گناہ کرنے کے ذرائع کی موجودگی، ''تمہارے ہاتھوں کی پہنچ میں'' ہی وہ ذریعہ ہے، جس سے خُدا کے خوف کو آزمایا جائے گا......اور ثابت کیا جائے گا۔

ریاست یا معاشرے کے خوف کو خُدا کے خوف کی جگہ پر رکھنا، دل سے محسوس کی جانے والی پارسائی، کے راستے میں ایک رُکاوٹ ہی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں، ہر شخص کو ''صحیح مذہب پرستی حاصل کرنے کیلئے، ریاست اور معاشرے، دونوں سے آزادی ہونی چاہیے۔

MashalBooks.org

باب 11

اسلام سے آزادی

اگر آپ کا رب چاہتا، تو یقیناً کرۂ ارض پر موجود سب لوگ ایمان لے آتے، سب کے سب: تو کیا لوگوں کو مجبور کریں گے، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟

......قرآن ۱۰:۹۹

مارچ ۲۰۰۶ میں، ایک سادہ افغان شہری نے جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، ایک ناخوشگوار کہانی کے ساتھ عالمی سُرخی بنائی۔ یہ غریب آدمی، اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرنے کے جُرم میں موت کے کنارے پر تھا۔ اُس کے مستغیثوں نے جو اسے جرثومہ کہہ کر پکارتے تھے اور اپنی فردجُرم میں خاصے صاف گو تھے کہا: ''اسے باقی ماندہ مسلمان معاشرے سے کاٹ کر الگ کر دینا چاہیے اور قتل کر دینا چاہیے۔'' (۱) اُس عدالت جس نے اس سے اتفاق کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، نے عبدالرحمٰن کو دوبارہ سوچنے اور اپنی رائے بدلنے کیلئے تین دن دیئے۔ اگر اُس نے پھر بھی ارتداد پر اصرار کیا، تو اسے سرِ عام پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

عبدالرحمٰن معجزانہ طور پر بچ گیا۔ غیر ملکی حکومتوں کے زبردست دباؤ کے تحت، عدالت نے اُس کے مقدمے کو ''مستغیثوں کو لوٹا دیا، ''تحقیقاتی خلا'' کا حوالہ دیتے ہوئے۔ اسی دوران میں وہ جیل سے رہا ہو گیا اور بچ بچا کر اٹلی چلا گیا، جہاں اُسے پناہ دے دی گئی۔

تاہم یہ قابلِ مذمت کہانی، برف کے تودے کا محض ایک سِرا تھی جیسا کہ ایک عیسائی، انسانی حقوق کی تنظیم کی ایک رپورٹ میں ۲۰۰۸ میں بیان کیا گیا: ''اسلام سے کسی دوسرے مذہب میں تبدیل ہونے والے، اپنے خاندانوں کے ہاتھوں بے شمار سنگین زیادتیوں کا نشانہ بنتے ہیں'' (۲) یہ مُرتد مسلمان، سعودی عرب، ایران اور سوڈان جیسے ممالک میں موت کی سزا کا سامنا کر سکتے ہیں، اور دوسرے، بہت سے مسلمان معاشروں میں جبر کی دوسری بہت سی شکلوں کا۔ (۳)

بدقسمتی سے، مذہبی آزادی کی اس منظّم پامالی کی وجہ مذہبی ہے۔ شریعت کے زیادہ تر کلاسیکی مکاتبِ فکر، اسلام سے ارتداد کو ایک ایسا جُرم سمجھتے ہیں، جس کی سزا موت ہے۔ ایک حدیث، جس کی نسبت پیغمبر محمدؐ کی طرف کی جاتی ہے، اس موضوع پر بڑی واضح ہے: ''اگر [مسلمانوں میں سے] کوئی شخص اپنے مذہب کو ترک کرتا ہے، تو اسے قتل کر دو'' (۴) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں داخل ہونے کی تو آزادی ہے، لیکن باہر نکلنے کی آزادی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے، کچھ مسلمان ممالک کو انسانی حقوق کے عالمی اعلامیئے (Universal (UDHR) Declaration of Human Rights) کو، جو ۱۹۴۸ میں یو این کی جنرل اسمبلی کی طرف سے اختیار کیا گیا، قبول کرنے میں شکل پیش آئی۔ اس کی شقوں میں ایک شق ''[کسی شخص کے] اپنے مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی'' تھی۔ سعودی عرب کے ترجمانوں نے، خصوصی طور پر، اس شِق کی مسلسل مخالفت کی ہے، اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ ''اس کی ''تعبیر، مبلغین اور مذہب تبدیل کرانے والوں کو ایک کھلی چھٹی دینے کے طور پر کی جا سکتی ہے'' (۵)

اس ''کھلی چھٹی'' کے متبادل کے طور پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم (Organization Of Islamic Conference) او۔آئی۔سی، جس کی تمام مسلم اکثریتی ریاستیں رُکن ہیں، نے ۱۹۹۰ میں اسلام میں انسانی حقوق کا آفاقی اعلامیہ (Universal Declaration of Human Rights in Islam) اختیار کیا۔ اس نے ''[کسی شخص کی] غربت یا جہالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے ایک دوسرا مذہب اختیار کرانے، یا الحاد کی طرف سے جانے'' کی کوششوں کی مذمت کی۔ اسلام کو ترک کرنے یا اس کے ترک کی دعوت دینے کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

یُو ڈی ایچ آر اور ''اسلامی'' متن کے درمیان عدم مساوات ابھی تک باقی ہے، اور ارتداد کا یہ خاردار موضوع، حل کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ اس نے بعض قدامت پسند

مسلمانوں کی رہنمائی یوڈی ایچ آر کی بطور ایک بُرائی کے مذمت کرنے کی طرف کی ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی جمہوریہ ایران کے رہنمائے اعلیٰ عظیم آیت اللہ خمینی، نے ''شیطان کے چیلوں کی طرف سے ایک ڈھونگ'' کے طور پر اس کی مذمت کی۔ اُنہوں نے اپنے استدلال کو واضح طور پر بیان کیا: ''جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہم اقوام متحدہ کے پاس نہیں جاتے، ہم قرآن کریم کی طرف جاتے ہیں'' (۶)

مجھے بطور مسلمان کے، یہ تسلیم کرنا ہے کہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ عظیم آیت اللہ نے خُدا کے فرمان کو انسانوں کے ایک اعلامیے سے برتر کیوں رکھا۔ میں صرف یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اُنہوں نے اس امکان کو کیوں ردّ کر دیا کہ دونوں کے درمیان تضاد نہیں ہو سکتا۔

ارتداد کا دوبارہ جائزہ

جی ہاں، مذہبی آزادی کے جدید تصوّر اور قرآن کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہو سکتا، کیونکہ موخر الذکر میں ارتداد کی کوئی سزا شامل نہیں۔ یہ مرتدین اور دوسرے کُفار، کو اُخروی زندگی میں خُدا کی طرف سے سزا کی وعید، بلا شبہ سناتا ہے، لیکن یہ کسی دُنیاوی سزا کا حکم نہیں دیتا۔

درحقیقت، معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ ایسی قرآنی آیات موجود ہیں جو یہ اشارہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، کہ اسلام کو مسترد کرنا ایک آزادانہ مرضی کا معاملہ ہے۔ ایک آیت یہ کہتی ہے ''حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے، پس، جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے'' (۷) ایک اور آیت اُن کے بارے میں بات کرتی ہے، ''جو ایمان لاتے ہیں اور پھر کفر اختیار کرتے ہیں، پھر ایمان لاتے ہیں اور پھر کفر اختیار کرتے ہیں، اور پھر کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں'' اس بات پر دلالت کرتے ہوئے کہ وحی کے دور میں ایسے لوگ تھے، جو اسلام اور کفر کے درمیان آگے پیچھے آ جا سکتے تھے۔ (۸)

اُن دلچسپ شخصیات میں سے ایک شخصیت، جس نے اس معاملے میں قرآن کی نرمی پر زور دیا، سٹریٹفورڈ کیننگ تھا، جو کہ اُنیسویں صدی کے وسط میں سلطنتِ عثمانیہ میں برطانوی سفیر تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سیاست دانوں کو، ارتداد پر شرعی قوانین کو کالعدم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے، کیننگ نے مسلم مقدس کتاب کا حوالہ دیا اُس نے سلطان عبدالمجید سے کہا: ''ہم نے اس

معاملے میں تحقیق کی ہے۔سزائے موت کیلئے کوئی واضح قرآنی بنیاد نہیں ہے۔'' (۹)

تاہم، جیسا کہ ہم نے گزشتہ ابواب میں دیکھا ہے، قرآن نے اسلامی روایت کے بڑے دھارے کے صرف ایک چھوٹے سے حصے کو بیان کیا ہے اور ارتداد کی دنیوی سزا، بعد قرآن لٹریچر، یعنی احادیث کے ایک حصے کے طور پر سامنے آئی۔(۱۰)

بعض علما یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بعد کی ایجاد، ابتدائی مسلم معاشرے کی سیاسی ضروریات کے باعث وجود میں آئی۔ پیغمبرؐ کی وفات کے فوراً بعد، جب ابوبکرؓ پہلے خلیفہ بنے، تو پہلا مسئلہ جس کا اُنہیں سامنا ہوا، چند عرب قبائل کی بغاوت (رِدّا) کا تھا، جنہوں نے قبل ازیں مدینہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا۔ درحقیقت، باغی قبائل نے اسلام کے ساتھ اپنی وفاداری کو ترک نہیں کیا تھا۔انہوں نے صرف یہ اعلان کیا کہ پیغمبرؐ کی وفات کے ساتھ، مدینہ کے ساتھ بطور شہر کے اُن کی وفاداری ختم ہوگئی تھی۔ خصوصی طور پر وہ زکوٰۃ ادا کرنے کیلئے مزید تیار نہیں تھے، جو وہ فوجی مہمات کی مالی مدد کرنے کے بعد ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کئے جانے کیلئے محمدؐ کے قاصدوں کو ادا کرتے رہے تھے۔(۱۱)

اس بغاوت کے ہوتے ہوئے، مختلف آرا سطح پر اُبھریں، اور کچھ لوگ، بشمول عمرؓ کے، جو جلد ہی دوسرے خلیفہ بننے والے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ بغاوت کو برداشت کرنا چاہئے۔ تاہم ابوبکرؓ نے باغی قبائل پر زکوٰۃ عائد کرنے پر اصرار کیا، اور پھر اُن کو زیر کرنے کرنے کیلئے فوجی مہمات روانہ کیں۔(۱۲) بعد کے فقہانے، جنہوں نے ان واقعات کی تشریح کی، رِدّا کو نہ صرف ریاست کے خلاف سیاسی بغاوت سمجھا، بلکہ اسلام کے خلاف بطور مذہب بھی بغاوت خیال کیا، یہ یہی تعبیر تھی ''جس نے ارتداد کی سزا کو اُخروی زندگی سے اس دُنیا میں منتقل کیا۔'' (۱۰)

یہ تصور سیاسی طور پر بھی مفید ثابت ہوا، کیونکہ اُمویوں اور بعد میں عباسی خاندانوں کے جابر خلفا محض ارتداد کا الزام لگا کر اپنے ناقدین سے چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے۔ وہ احادیث جو مرتدین کے قتل کا حکم دیتی ہیں، غالباً اسی وقت گردش میں لائی گئیں، پیغمبرؐ کی وفات کے ایک صدی سے زیادہ عرصے بعد۔ دوسرے لفظوں میں یہ موضوعی بیانات تھے، جو بعد میں اُس چیز کا جواز پیدا کرنے کیلئے گھڑے گئے، جو کچھ سیاسی حاکمیت کر رہی تھی۔(۱۴)

دوسری طرف، دوسری احادیث تھیں، جو یہ اشارہ کرتی تھیں، کہ پیغمبرؐ درحقیقت ارتداد

کو جُرم خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک بیان ہے، ایک حسین نامی مسلمان کے بارے میں، جس کے دو بیٹیوں کو اُن بازنطینی تاجروں کی طرف سے، جو مدینہ اپنا مال فروخت کرنے کیلئے آئے تھے، مذہب تبدیل کروا کے عیسائیت قبول کروائی گئی۔ اپنی تبدیلی مذہب کے بعد دونوں بیٹے، تاجروں کے ساتھ شام روانہ ہوگئے۔ جب یہ واقعہ ہوا تو، اُن کے باپ نے پیغمبرؐ سے درخواست کی کہ اُن کا تعاقب کیا جائے اور واپس لایا جائے، واضح طور پر اُن سے دوبارہ اسلام قبول کروانے کی خاطر روایت کا موقف یہ ہے کہ، اس موقع پر مشہور قرآنی آیت ''دین میں کوئی جبر نہیں، نازل ہوئی۔ نتیجتاً پیغمبرؐ نے ان دو مذہب تبدیل کرنے والوں کا پیچھا کرنے کیلئے کسی کو نہ بھیجا۔(۱۵)

حدیث کے لٹریچر میں ان پیچیدگیوں کی وجہ سے، اور قرآن میں ارتداد کی دُنیوی سزا کی مکمل عدم موجودگی کی وجہ سے، مسلمان علمانے، اس موضوع پر بڑے دھارے کے نقطۂ نظر سے کئی صدیوں تک اختلاف کیا ہے۔ آٹھویں صدی میں ایک ممتاز فقیہہ ابراہیم النخعی، اور ایک حدیث کے ماہر سفیان الثوریؒ نے لکھا کہ مرتد کو اسلام کی طرف دوبارہ دعوت دی جانی چاہیے، لیکن موت کی سزا کبھی نہیں دینی چاہیے۔(۱۶) فاضل حنفی فقیہہ شمس الدین السرخسی نے بھی ارتداد کیلئے کسی جسمانی سزا کو نظر انداز کر دیا۔(۱۷) ان علمانے توجہ دلائی کہ، موت کی سزا، مرتد کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے محروم کر دیتی ہے، جو اس کی زندگی کے کسی بھی لمحے میں واقع ہو سکتا تھا(۱۸) انہی مبصرین نے یہ واضح کیا کہ، پیغمبرؐ نے کبھی کسی شخص کو صرف ارتداد کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم نہیں دیا۔(۱۹)

یہاں تک کہ ابنِ تیمیہ، جو کہ تیرھویں صدی کے عالم تھے، جو دوسرے مسائل پر بڑے سخت اور جنگجو سمجھے جاتے تھے، نے بھی یہ استدلال کیا کہ اُس حدیث سے جو یہ بیان کرتی ہے ''جو شخص بھی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے، اُسے قتل کر دو'، مراد سیاسی برادری کے خلاف غدّاری سے نمٹنا تھی ......یعنی کسی شدید دشمن کی مدد کرنا......نہ کہ اس طرح ارتداد کے ساتھ۔(۲۰)

اُنیسویں صدی میں، جیسا کہ پچھلے ابواب میں بیان کیا گیا، سلطنتِ عثمانیہ نے اپنے شہریوں کیلئے اسلام کو ترک کرنے اور کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کو غیر پیچیدہ بنا دیا۔ جدید مفکرین، جیسا کہ راشد رضا نے سرِ عام استدلال کیا کہ ارتداد کیلئے موت کی سزا کو ترک کر دینا

MashalBooks.org

چاہیے۔(۲۱) ایک آزادی پسند مذہبی عالم، جو انسانی حقوق کے دفاع میں اپنی حکومت کے ساتھ برسرِ پیکار ہو گیا، عظیم آیت اللہ حسین المنتظری نے، اسلامی جمہوریہ ایران میں اپنی وفات سے پیشتر، بی بی سی پر ایک انٹرویو میں یہ استدلال کیا کہ یقین کی بنیاد پر ارتداد، "مسلم قومیت کے ساتھ بُغض اور دشمنی کی وجہ سے ترکِ اسلام" سے مختلف ہے......اور یہ کہ اوّل الذکر کسی سزا کی مستحق نہیں۔(۲۲)

اُن مسلمان علما، مذہبی پیشواؤں، اور مفکروں، جنہوں نے ارتداد کے کلاسیکی تصور کو چیلنج کیا، بحث مزید طویل سے طویل تر ہو سکتی ہے۔(۲۳) لیکن مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اسلام سے ارتداد کرنے والے، یا وہ غیر قدامت مسلمان، جنہوں نے دقیانوسی تعبیرات سے، ارتداد کیا، ابھی تک بعض ممالک میں موت کی سزا، اور دوسرے ممالک میں تذلیل کا سامنا کرتے ہیں۔ قرآنی حکم "دین میں کوئی جبر نہیں" کے باوجود، اب بھی بہت زیادہ جبر واقع ہوتا ہے۔

اس بات کا ادراک کرنا بہت اہم ہے کہ ارتداد کیلئے دُنیوی سزا، قرآنی نہیں بلکہ بعد قرآنی ہے۔ موخر الذکر ایک تاریخی تناظر کی عکاسی کرتا ہے، جس میں، ایک شخص کی مذہبی وابستگی، اس کی سیاسی وفاداری کا بھی تعین کرتی ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس وقت کی دوسری تہذیبیں، جیسا کہ ساسانی اور بازنطینی تہذیبیں، بھی ارتداد کیلئے موت کی سزا دیتی تھیں۔(۲۴) اوائل دور کے مسلمانوں نے محض اپنے وقت کے معیارات کو اپنایا۔

اب، بلاشبہ، ہم ایک بہت مختلف دُنیا میں رہتے ہیں۔ مذہبی وابستگی اور سیاسی وفاداری کو بالکل ایک دوسرے سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے ارتداد کے تصور کو قائم رکھنے پر اصرار بے معنی ہے۔ نیز یہ نقصان دہ بھی ہے۔ کیونکہ یہ بے گناہ لوگوں کی ایذا رسانی پر (جیسا کہ عبدالرحمٰن جیسا نومذہب کی) اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کی تصویر کشی بطور ایک ظالمانہ مذہب کے، پر منتج ہوتا ہے۔

یہاں، مسلمانوں کو اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، کہ وہ کیا ردِ عمل دیں گے، اگر فرض کیا، عیسائی اپنے اُن مرتدین کو جنہوں نے اسلام کو قبول کرنے کا انتخاب کیا، موت کی سزائیں دینے کا حکم دے دیں۔ وہ کیا سوچیں گے، مثال کے طور پر، اگر کوئی یوسف اسلام جیسا شخص......جو کہ سابقہ کیٹ سٹیونز تھا، جو ۱۹۷۷ میں مسلمان ہو گیا...... برطانوی عدالت کی طرف سے مقدّمے میں ڈال دیا جاتا، اور اُسے سزائے موت پانے سے پہلے، اپنے عقیدے سے

دستبردار ہونے کیلئے تین دن دیئے جاتے؟

مذہب تبدیل کر کے اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کو مغربی دُنیا میں ایسے سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ مغرب نے مذہب کی آزادی کو قبول کر لیا ہے، جس میں اُن کے اپنے مذہب سے باہر نکلنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کو بھی یہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

مذہب کی بے حُرمتی کا دوبارہ جائزہ لینا

اگر اسلام سے آزادی کا ایک پہلو، اس سے ارتداد کرنے کا حق ہے، تو دوسرا اس پر تنقید کرنے کا حق ہے، اور یہ تنقید افسوس سے کہنا پڑتا ہے، بعض اوقات طنز، مذاق اور بلکہ توہین کی شکل میں بھی سامنے آتی ہے۔

بلاشبہ، توہین، کبھی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ جب کوئی غیر مسلم خُدا، قرآن، پیغمبرؐ، اسلام کی کسی اور قدر کی توہین کرتا ہے، تو وہ کم سے کم الفاظ میں بھی بے ادب ہو رہا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو بھی بے ادب سمجھا جائے گا، اگر وہ دوسرے لوگوں کے مذاہب کی توہین کریں۔ قرآن اُنہیں تنبیہہ کرتا ہے، "اُن لوگوں کو جنہیں وہ خُدا کے علاوہ پکارتے ہیں، برا مت کہو، اس صورت میں وہ دشمنی میں خُدا کو بُرا بھلا کہیں گے، بغیر علم کے۔" (۲۵)

اگر ہم ایک مثالی دُنیا میں رہ رہے ہوتے، تو ہر شخص اس جائز نصیحت کو سُنتا، اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتا۔ تاہم حقیقی زندگی میں، لوگ ایک دوسرے کے مذہب، بشمول ہمارے مذہب کے، پر طنز کرتے ہیں، مذاق اُڑاتے ہیں، اور اُس کی توہین کرتے ہیں، مزید برآں، جو کچھ دوسرے لوگ ایک منصفیانہ تنقید کے طور پر پیش کرتے ہیں، بعض اوقات ناگوار لگتا ہے، محض تناظرات، اور ثقافتوں کے درمیان اختلافات کی وجہ سے، تو پھر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

پچھلی چند دہائیوں میں یہ معاملہ حساس ہو گیا ہے۔ کیونکہ اسلام کی حقیقی یا خیالی توہینوں نے عالمی سُرخیاں بنائی ہیں۔ ۱۹۸۹ میں آیت اللہ خمینی نے، مصنف سلمان رُشدی کیلئے، اُس کے متنازعہ ناول، شیطانی آیات کی بنا پر، موت کا فتویٰ جاری کیا۔ ۲۰۰۴ میں، ولندیزی فلمساز وان گوہ (Van Gogh) سے اُس کی فلم سب میشن (Submission) سے مشتعل ہو کر ایک عسکریت پسند

MashalBooks.org

مسلمان نے اُسے قتل کر دیا۔ ایک سال بعد جی لینڈز پوسٹن (Jyllands Poston) ایک ڈینش اخبار نے، کارٹون کا ایک سلسلہ شائع کیا، جن میں پیغمبر محمدؐ کی تصویر بطور ایک دہشت گرد کے پیش کی، جس نے ڈینش سفارت خانوں پر حملوں اور مذکورہ اخبار اور اس کے کارٹونسٹ کیلئے موت کے خطرات کی چنگاری سُلگا دی۔

ان تمام معاملات میں، وہ مسلمان جنہوں نے غصے اور تشدد کے ساتھ ردِعمل کا اظہار کیا، غالبًا اپنے مذہب کا دفاع کرنے کے اپنے جذبے میں مخلص تھے۔ لیکن، افسوس کہ اُن کے اقدامات کا عملی نتیجہ، اُسی الزام کا دفاع تھا، جو اُن کے خلاف وہ لگا رہے تھے...... کہ اسلام ایک تنگ نظر اور جارح مذہب ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنے مذہب کے بارے میں اس منفی تاثر کو ختم کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کرنے سے آغاز کرنا چاہیے۔

لیکن، عام فہم کو ایک طرف رکھتے ہوئے، آدمی کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ مسلمان جو خیالی حملوں کے خلاف پُر تشدد طریقے سے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں، مذہبی جواز سے محروم نہیں ہیں۔ شریعت کے روایتی مکاتب فکر کے ہاں ایک تصور ہے جسے کفر سازی کہا جاتا ہے، جسے موت کی سزا کے قابل ایک جُرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ناراض مسلمان جو اُن لوگوں کا ''سر قلم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کی توہین کرتے ہیں'' اسی تصوّر کا حوالہ دیتے ہیں۔ (۲۶)

معاملات کو تناظر میں رکھتے ہوئے، ایک شخص کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دوسری ابراہیمی روایات بھی اس تصور کی پیروی کرتی تھیں۔ تورات واضح طور پر بیان کرتی ہے، کہ وہ اُن لوگوں کو جو توہینِ مذہب کرتے ہیں، ''لازمی طور پر موت کے حوالے کیا جائے گا'' (۲۷) سینٹ اکویناس نے لکھا کہ توہین مذہب ''ایک ایسا گناہ، جو براہِ راست خُدا کے خلاف کیا جاتا ہے، قتل سے بھی زیادہ شدید ہے۔'' (۲۸) لیکن جدید دور میں، یہودیت اور عیسائیت، نے توہین مذہب کی دُنیوی سزا کو ترک کر دیا ہے، جبکہ اسلام جیسا کہ ہم نے دیکھا، جیسا کہ شریعت کے بعض دوسرے پہلوؤں کے ساتھ، بڑی حد تک غیر تبدیلی شدہ رہا ہے۔

بلاشبہ، جدید دُنیا کے ساتھ مطابقت اختیار کرنا، محض اس لئے کہ یہ جدید ہے، ایک مسلمان کیلئے کوئی معنی نہیں رکھے گا...... یا کسی بھی اور شخص کیلئے جو ایک ایسے اخلاقی قانون پر یقین رکھتا ہو۔ جو وقت کے اُتار چڑھاؤ کا پابند نہ ہو۔ لیکن اُسی مسلمان کو، اپنی روایت کے اُن عناصر کو محفوظ

کرنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے جو کہ خُدائی حکم رکھنے کی بجائے صرف تاریخی ہیں۔

اسلام کی صورت میں، یہ دونوں زُمرے، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، تقریباً قرآن اور بعد قرآنی روایت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ موخرالذکر کے تمام عناصر بہرحال انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور خاصی حد تک معنی خیز انداز سے، توہینِ مذہب کے مسئلے پر، جیسا کہ ارتداد کے معاملے میں مذہب کے مرتکبین کو اُخروی زندگی میں خُدا کی سزا سے ڈراتی ہیں، لیکن اُن پر کسی قسم کی کوئی دُنیوی سزا عائد نہیں کرتیں۔

جیسا کہ ارتداد کا معاملہ ہے، توہینِ مذہب کی سزا حدیث کے لٹریچر کے بعض بیانات سے اور اُس انداز سے آئی ہے، جس میں کلاسیکی علما نے اس کی تعبیر کی ہے۔ یہ بیانات بعض افراد کے بارے میں ہیں، زیادہ تر ہجوگو شعرا کے بارے میں، جنہوں نے پیغمبر محمدؐ کا، آپ کے نصب العین کے دوران مذاق اُڑایا اور یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ایک فراڈ تھا۔ یہ بیانات یہ کہتے ہیں کہ اُن میں سے کچھ لوگوں کو اس نوزائیدہ مسلم معاشرے کی طرف سے ''خُدا اور رسول کے دشمن'' ہونے کی وجہ سے موت کی سزا دی گئی۔ لیکن اس امر کے علاوہ کہ ان تاریخی احوال کی صحت کو چیلنج کیا جا سکتا ہے، اُنہیں اُن کے مخصوص تناظر کی وجہ سے محدود بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مسلمان عالم محمد کمالی یہ ثابت کرتا ہے، کہ ہجوگویوں کی موت کی سزائیں مذہبی کی بجائے سیاسی واقعات تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب ابتدائی مسلمان معاشرہ مخالف کفار کے ساتھ بقا کی جنگ لڑ رہا تھا، تمسخر ایک جنگی پروپیگنڈا بن چکا تھا۔ (۲۹) لیکن ''آج توہین مذہب کسی طرح بھی، اسلام کے بطور ایک عظیم مذہب ایک قانونی نظام اور ایک بڑی تہذیب کے تسلسل کے خطرہ نہیں بن سکتی۔'' (۳۰)

محض ''اُن کے ساتھ مت بیٹھو......''

حدیث کے لٹریچر سے آگے، توہینِ مذہب کا ایک ایسا ردِعمل جو جدید دُنیا کے آزادی پسندانہ معیارات سے مطابقت رکھتا ہے'' درحقیقت قرآن سے آتا ہے۔

قرآنِ کریم میں، صرف یہی نہیں کہ توہین مذہب کیلئے کسی دنیوی سزا کا ذکر یا اشارہ مفقود ہے، بلکہ یہ ایک عدم تشدد والے ردِعمل کی تلقین کرتا ہے: ''جب تم سُنو کہ خُدا کی آیات سے کفر کیا جا رہا ہے اور اُن کا تمسخر اُڑایا جا رہا ہے، تو اُن کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بحث

MashalBooks.org

میں مشغول ہوجائیں۔یقیناً(ورنہ)تم بھی اُن کی طرح ہوجاؤ گے۔''(۳۱)

جوکچھ یہاں بیان کیا گیا ہے، وہ واضح طور پر ناپسندیدگی کی پُرامن شکل ہے: مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ کسی ایسی گفتگو کا حصہ بنیں، جو اسلام کا تمسخر اُڑاتی ہو، لیکن جو کچھ انہیں کرنا ہے، وہ اس سے دور رہنا ہے۔ اُس صورت میں بھی، علیحدگی صرف اُس وقت تک رہے گی جب تک گفتگو، کسی غیر تکلیف دہ چیز میں تبدیل نہیں ہوجاتی۔ جب ایک دفعہ تمسخر ختم ہوجائے تو بات چیت دوبارہ شروع ہوسکتی ہے۔ (ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن کی اس سورت میں سے ہے جو ''مدنی'' دور میں نازل ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں، یہ اُس وقت کی عکاسی کرتی ہیں، جب مسلمانوں کے پاس سیاسی اور فوجی قوت تھی۔ لہٰذا اس کے عدم تشدّد کے کردار کی تشریح یا رفت گزشت کرنے کیلئے تشریح ایسے نہیں کی جاسکتی کہ ایسا کرنا کسی ضرورت کا نتیجہ تھا۔)

چند دوسری قرآنی آیات بھی، توہین مذہب کی گفتگو کی موجودگی میں اسی طرح کے عدم تشدّد کی حامل ناپسندیدگی کے اقدامات کا حکم دیتی ہیں۔ اُن میں سے ایک آیت میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے ''جب آپ اُن لوگوں سے ملو، جو ہماری آیات کے بارے میں غلط گفتگوؤں میں ملوث ہوں، تو اُن سے پیچھے ہٹ جاؤ تا آنکہ وہ کسی اور گفتگو میں مصروف ہوجائیں۔'' (۳۲) ایک اور آیت مسلمانوں کو بالکل غیر جھگڑالو ہونے کے طور پر بیان کرتی ہے: ''جب وہ کوئی فضول گفتگو سُنتے ہیں تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ: تم پر سلامتی ہو ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔'' (۳۳)

میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ جدید دُنیا میں توہینِ مذہب کے بارے میں مسلمانوں کا ردِّعمل، ان آیات کی روح پر مبنی ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر مسلمان مسلمان گفتگوؤں میں شریک ہونے، کتب خریدنے، یا وہ فلمیں اور ڈرامے دیکھنے سے، جو اُن کے مذہب کی اقدار کا تمسخر اُڑاتے ہیں، انکار کرکے، اسلام مخالف بیانات کا بائیکاٹ کرسکتے ہیں، وہ پُرامن احتجاج بھی منظّم کرسکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن دھمکیوں اور حملوں سے اسلام مخالف بیانات کو خاموش کرنے کی کوشش کرنا، صحیح نہیں ہے۔

اسی اثنا میں، اُن مسلمانوں کو جو تمسخر کی موجودگی میں، تشدد کی طرف رُخ کرتے ہیں، اپنی ترغیب کے ذریعے پر غور کرنا چاہیے: آیا یہ ایک حقیقی مذہبی وفاداری ہے یا ایک قوم پرستانہ جذبہ

ہے؟ موخر الذکر انتخاب ایک عجیب وغریب نمونے کی وجہ سے ذہن میں آتا ہے۔ جدید دور میں، تمسخر کے بارے میں مسلمانوں کا ردِّعمل اُس وقت سب سے زیادہ جذباتی رہا ہے، جب اس کا موضوع پیغمبر محمدؐ کی ذات ہو، بہ نسبت دوسرے پیغمبروں اور سب سے زیادہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ خُدا کی ذات ہو۔ اگرچہ قرآن کے مطابق ''مسلمانوں کو خُدا اور اُس کے پیغمبر پر ایمان لانا چاہتے، اور ان پیغمبروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرنا چاہیئے۔'' (۳۴) لہٰذا اُنہیں ابراہیمؑ موسیٰؑ یا یسوع مسیحؑ کے حق میں بھی ایسے ہی جوش وجذبے سے کھڑا ہونا چاہیے، جیسے کہ پیغمبر محمدؐ کیلئے ہوتے ہیں۔ اور یقیناً، اُنہیں سب سے زیادہ جوش وجذبے سے، سب سے بلند اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کیلئے کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔

میرا گمان یہ ہے کہ پیغمبر محمدؐ کیلئے یہ منتخب توجہ، اس حقیقت سے پیدا ہوتی ہے، کہ آپ کا احترام صرف مسلمانوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، جو اسے مسلمان قومیت کی خصوصی علامت بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پیغمبر محمدؐ کی گستاخی مسلمانوں کی اپنی ذات کی گستاخی بن جاتی ہے۔ ایک ایسی ذاتی گستاخی کے خلاف ردِّعمل ایک قابلِ فہم انسانی مظہر لیکن یہ ایک سیکولر مظہر ہے، نہ کہ مذہبی ...... اور ایک ایسا مظہر ہے جس کا رُجحان انتہاؤں پر جانے کا ہے، خاص طور پر مشرق میں......مثال کے طور پر سیکولر جمہوریہ ترکی میں، ایسے قوانین ہوتے تھے، جو ''ترکی کی توہین'' پر پابندی لگاتے تھے، اور عدالتیں دانشوروں کو سزائیں دیتی تھیں......جیسا کہ......ناولسٹ اورحان پامک کو ......قوم کے وقار کو نقصان پہچانے کیلئے، محض اس کی تاریخ کے بارے میں تنقیدی آرا پر۔ (۳۵) ترکی میں، بعض ضرورت سے زیادہ قوم پرستوں نے، اسی ''جُرم'' کیلئے، آزادی پسند نقادوں کو قتل کردیا (۳۶) یہ تمام قوم پرستانہ جذبہ بالکل اُن مسلم عسکریت پسندوں سے مشابہہ ہے، جو اُن پر حملے کرتے ہیں جو پیغمبرؐ کی توہین کرتے ہیں، اُن کا جذبہ، آدمی کہہ سکتا ہے، قوم پرستی کی ایک اور شکل ہے......قوم کی جگہ اُمت کو لیئے ہوئے۔

دوسری طرف، زیادہ دینی ذہن والے مسلمانوں نے دوسری مقدّس شخصیات کی توہین کے خلاف بھی ردِّعمل ظاہر کیا ہے اور اُنہوں نے ایسا پُرامن طریقے سے کیا ہے۔ جب ۲۰۰۷ میں، اڈیلیڈ، آسٹریلیا میں، دوشیزہ مریم کی توہین آمیز تصویر بنائی گئی، تو مسلم قومیتوں کے ایک نمائندے نے احتجاج کی آواز بلند کی، برداشت اور مہذب طریقے سے، جس نے ترکی میں کسی اور سے نہیں

MashalBooks.org

بلکہ خود عالمی بطریق بارتھولومیواوّل سے دادوصول کی۔

اس سب کے علاوہ، اُن مسلمانوں کو، جو تنقید یا تمسخر کے خلاف اشتعال سے ردِعمل ظاہر کرنے پر مائل ہیں، بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ چیز صرف اُنہیں ناپختہ اور غیر محفوظ ظاہر کرنے میں مدد کرتی ہے۔ اگر تو وہ سب کچھ جو وہ کسی مخالفانہ کتاب، فلم، یا کارٹون کے مقابلے میں کر سکتے ہیں، صرف اس کو وحشیانہ طاقت سے تباہ کرنا ہے، تو پھر وہ جس چیز کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ خود اعتمادی کی کمی ہے۔ اگر اُن کا ردِعمل سنجیدہ اور عقلمندانہ ہو تو وہ اسلام کی بہتر خدمت کریں گے۔ بہر حال کسی مذہب کی قوت، ناقدین اور مخالفین پر جبر سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے ماننے والوں کی اخلاقی مضبوطی اور ذہنی طاقت سے حاصل ہوتی ہے۔

کیا اسلام دُنیا کو فتح کر لے گا؟

آخری بات، ہمیں اس بات پر دوبارہ غور کرنا چاہیے کہ اس دُنیا میں مسلم اُمہ کا حتمی نصب العین اور منزل کیا ہوگی۔ اسلام پسند تحریک کی طرف سے دیا جانے والا جواب اکثر اوقات فاتحانہ جشن والا ہوتا ہے۔ اسلام بالکل پوری دُنیا کو فتح کرے گا: جلد یا بدیر پوری دُنیا مسلمان ہوگی۔

لیکن یہ آرزومندانہ اندازِ بیان، اُن لوگوں کی آرزوؤں کی عکاسی تو کرتا ہوگا، جو اتفاق سے مسلمان واقع ہوئے ہیں، بجائے ارادۂ خداوندی ہونے کے۔ درحقیقت قرآن واضح طور پر یہ بیان کرتا ہے کہ پوری دُنیا مسلمان نہیں ہوگی...... ایک آیت پیغمبرؐ کو بتاتی ہے ''جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے وہ حق ہے، لیکن زیادہ تر لوگ یقین نہیں رکھتے'' (۳۸) ایک دوسری آیت یقین کے فقدان کا نہیں بلکہ مذاہب کے تنوع کا حوالہ دیتی ہے، یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ یہ تنوع ٹھیک وہ چیز ہے جو انسانیت کیلئے خُدا کی مشیت ہے:

''اور ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب [قرآن کریم] حق کے ساتھ نازل کی ہے، جو سابقہ کتب کی تصدیق کرتی اور اُن کی حفاظت کرتی ہے...... ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک قانون اور ایک عمل مقرر کیا ہے۔ اگر خُدا کی مشیت ہوتی تو وہ تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا، لیکن وہ، اُس چیز کے بارے میں جو تمہارے پاس آئی ہے، تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ لہٰذا نیکی کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرو۔ تم میں سے ہر شخص کو لوٹ کر خُدا کے ہاں جانا ہے، اور وہ تمہیں اُن

چیزوں کے بارے میں آگاہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔'' (۳۹)

یہ قرآنی اقتباس واضح طور پر ایک ایسی دُنیا کو بیان کرتا ہے، جس میں اسلام دوسرے مذاہب کے درمیان ایک مذہب ہے، نہ کہ واحد مذہب۔ (۴۰) ان کے درمیان اختلافات صرف اُخروی زندگی میں حل ہوں گے۔ اسی دوران مختلف مذاہب کے لوگوں ...... مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں ...... سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ''نیکی کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔''

اس تکثیری تصور کا ادراک حاصل کرنے کے قابل ہونے کیلئے۔ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے، وہ ایک ایسی دُنیا ہے۔ جس میں تمام مذاہب اپنا اظہار اور اپنا بڑھاؤ آزادی سے کر سکیں۔

تسلیم، کہ ایسی تکثیری دُنیا، قرونِ وسطیٰ کے مسلمان علما کے تصور...... اسلام کا گھر...... سے مختلف معلوم ہوگی...... جیسا کہ ہم نے باب چہارم میں دیکھا، یہ اصطلاح اُن سرزمینوں کا حوالہ دیتی تھی، جن پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور جہاں شریعت کے مطابق حکومت کی جاتی تھی۔ لہٰذا، صرف ایسی جگہیں ہی اسلام پر عمل کرنے کیلئے محفوظ نظر آتی تھیں۔ باقی تمام دُنیا یا تو مخالف تھی (دارالحرب...... یعنی غیر مسلموں کے زیر حکومت ممالک) یا صرف مشروط طور پر محفوظ (معاہدے کی سرزمین)...... یعنی ایسے ممالک جن پر ایسے غیر مسلموں کی حکومت تھی جنہوں نے مسلم ریاست کے ساتھ معاہدے کئے ہوئے تھے۔

تاہم، ان قدیم اقسام میں سے کوئی بھی جدید دُنیا کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ درحقیقت، آج، کچھ مسلمان، مغرب کے غیر مسلم ممالک میں اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کو آسان پاتے ہیں، جو، آمرانہ حکومتوں والے بعض مسلم اکثریتی ممالک کی نسبت زیادہ محفوظ اور آزادی دیتے ہیں۔

لہٰذا اب یہ وقت ہے کہ، دُنیا کو دارالاسلام بمقابلہ دارالحرب میں تقسیم شدہ دُنیا کے طور پر دیکھنا بند کر دیا جائے۔ بلکہ اب جو موجودہ صورتِ حال ہے اُس کے مطابق دُنیا ایک آزادی کا گھر اور ایک جبر کا گھر ہے، مسلمانوں کو اوّل الذکر کی طلب کرنا چاہیے۔

اس آزاد دُنیا میں، یقیناً ایسے خیالات ہوں گے، جنہیں مسلمان، بشمول میرے، پسند نہیں کریں گے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اُن کا جواب معقولیت اور عقلمندی سے

MashalBooks.org

دیں ...... جو کہ ایک ایسی کوشش ہوگی جو ہمیں ہماری اوّلین نسلوں کی ذہنی حرکیت کو دوبارہ زندہ کرنے میں مدد کرسکتی ہیں، اُسی انداز سے معتزلہ نے چیلنجوں اور یونانی فلسفے کی خدمات سے نمٹا۔

اس آزاد دُنیا میں، ایسے لوگ بھی ہوں گے، جن کے طرزِ زندگی کو ہم گمراہ اور قابلِ نفرت پائیں گے۔ ہمیں اُن لوگوں کے ساتھ اُن اقدار میں شریک ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، جن سے ہم وابستہ ہیں۔ وہ اس کے جواب میں کیا ردِعمل اختیار کریں گے، ہمارا کام نہیں ہے۔ ''اگر وہ مسلمان ہوجائیں تو وہ ہدایت پائیں گے'' اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو بتایا ''اگر وہ منہ موڑ لیں، تو آپ پر صرف پہنچانا فرض ہے۔'' (۴۱)

اور آخری بات یہ کہ، ہمیں اپنی ذات کیلئے اس آزاد دُنیا کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی ذاتی زندگی گزارتا ہے......ایک حیرت انگیز سفر جو ہماری پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور مسلسل منکشف ہوتا رہتا ہے، جب کہ ہم بڑے ہوکر ایک ذہن کو پریشان کردینے والے ناٹک کا تجربہ کرتے ہیں۔ ہم سیکھتے اور دریافت کرتے ہیں، ہم کامیابی حاصل کرنے اور لطف اندوز ہوتے ہیں، اور ہم ناکام ہوئے اور تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ ایک مسلمان کیلئے، زندگی کے ان نشیب وفراز میں سے کوئی بھی مفہوم سے عاری نہیں ہے'' ......ان تمام کا مقصد ہمارے لئے سبق بننا ہے، ہمیں زیادہ باشعور اور عقلمند بنانے کیلئے اور ''ہم اُمید کرتے ہیں، زیادہ خدا پرست بنانے کیلئے''۔

ثمر آور آزادی وہ چیز ہے، جس کی ہم میں سے ہر فرد کو، ایسی زندگی گزارنے کیلئے ضرورت ہے، جو اُس کے اپنے انتخابات اور فیصلوں پر، کامیابیوں اور ناکامیوں پر مبنی ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی وہ چیز ہے، جس کی ہر شخص کو خُدا کو پانے کیلئے ضرورت ہے۔

تتمّہ

عرب انقلابات، جمہوریت اور آزادی پسندی

یہ کتاب ''عرب بہار'' ...... وہ نام جو ۲۰۱۱ کے اوائل میں تیونس، مصر اور لبیا کے طویل عرصے کے آمروں کے خلاف انقلابات کے ایک سلسلے کو دیا گیا...... سے عین پہلے لکھی گئی۔ لیکن شرقِ اوسط میں اس بے مثال عہد نے نہ صرف اس کتاب کی پیش بینوں کی تصدیق کردی، بلکہ اس کے بنیادی مقدمے کو بھی نمایاں کردیا کہ مسلمان معاشروں کو نہ صرف جمہوریت کیلئے ایک مقدمے کی ضرورت ہے، جو بہت کثرت سے بنالیا گیا ہے، بلکہ آزادی پسندی کیلئے بھی، جس کی طرف بہت شاذ توجہ دی گئی ہے۔

ان دونوں تصورات کے درمیان فرق کو واضح کرنا ضروری ہے، کیونکہ اسے اکثر اوقات دُھندلا دیا جاتا ہے۔ مقبولِ عام ذرائع ابلاغ میں، آزادی پسندی (انفرادی آزادیوں پر مبنی ایک سیاسی فلسفہ) اور جمہوریت (نمائندگی پر مبنی ایک سیاسی نظام) کو آپس میں گڈمڈ کردیا جاتا ہے، کچھ متون تو ان اصطلاحات کو باہمی طور پر متبادل طریقے سے استعمال کرتے ہیں، یہ فرض کرتے ہوئے کہ جمہوریت اور آزادی پسندی اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

تاہم، انفرادی آزادیوں ......مثال کے طور پر آزادی اظہار، اجتماع، مذہب یا جائیداد کی ملکیت ......کو کلی طور پر تسلیم کئے بغیر' ایک جمہوری سیاسی نظام کا ہونا ممکن ہے...... ان سیاسی مفکرین نے، جنھوں نے اس خطرے والی صورتِ حال کی نشاندہی کی ہے، اس کیلئے ایک

MashalBooks.org

اصطلاح بھی ایجاد کی ہے: غیر آزادی پسند جمہوریت۔ یہ ایک ایسے نظام پر دلالت کرتی ہے، جس میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد ہوں گے، جو اکثریت کی حکومت پر منتج ہوں گے، لیکن اقلیتوں اور اختلاف کرنے والے افراد کو۔ بہرحال دبایا جائے گا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مغرب، بشمول امریکہ کی غیر آزادی پسندانہ جمہوریت کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس کی ایک خوفناک مثال جم کرو (Jin Crow) کی قانون سازی پرستی کو ادارتی بنادیا۔ جم کرو کے قوانین صرف اس مفہوم میں جمہوری تھے، کہ اُن کی حمایت مقامی آبادی کی اکثریت نے کی۔ لیکن وہ شدید طور پر غیر آزادی پسندانہ تھے، اور اُنہیں صرف آزادی پسندی کی بحالی نے ختم کیا، جس کو شہری آزادیوں کی تحریک نے پروان چڑھایا، اور یو ایس کی سُپریم کورٹ نے قائم کیا۔

اسی اثنا میں، اس شہری آزادیوں کی تحریک کا ایک اہم پہلو ایسا تھا، جو اس کتاب کے مرکزی خیال کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا: اس کی آزادی پسندی نے نہ صرف، انسانی حقوق کے جدید سیکولر اصولوں سے رہنمائی حاصل کی، بلکہ ''خُدا کے بچوں'' کے بارے میں عیسائی اعتقادات سے بھی، جن کا اظہار عزّت مآب مارٹن لوتھر کِنگ جونیئر جیسے کلیسا کے رہنماؤں کی طرف سے کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک مذہب سے متاثر آزادی پسندی تھی۔

میں نے اس باریک نکتے پر بہت سال پہلے، جب میں مغرب میں آزادی پسندی کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا تھا، غور کیا تھا۔ نتیجتاً میں نے سوچا کہ آیا یہی چیز...... مذہب سے متاثر آزادی پسندی ...... اسلام میں بھی لاگو ہوسکتی ہے...... یہ تجسس ایک جذبے میں تبدیل ہوگیا، اور مجھے ''بغیر انتہاؤں کے اسلام: آزادی کیلئے مسلمانوں کا مقدمہ'' لکھنے کی طرف لے گیا۔ اور پھر عرب بہار نے اس کتاب کے دلائل کو اور بھی زیادہ برمحل ......اور زیادہ ضروری بنادیا......جیسا کہ میں اس تتمہ میں وضاحت کروں گا۔

اسلام پسندی جمہوریت سے ملتی ہے

آیئے، عربِ بہار کے ایک مختصر سے پس منظر سے آغاز کریں جیسا کہ میں نے اس کتاب کے باب ہفتم میں وضاحت کی، مسلم شرق اوسط، بیسویں صدی کے بہت سارے حصے میں سیکولر آمروں کے ایک سلسلے کے سحر میں مبتلا تھا۔ اگرچہ ان آمروں میں سے کچھ کا مغرب میں بطور

''ترقی پسند'' یا ''اعتدال پسند'' کے خوش آمدید کہا گیا، لیکن وہ اپنے معاشروں کیلئے رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوئے۔ اُن کے بہت سے غیر ارادی نتائج میں سے ایک، اُن کے برے مخالفین کو انتہا پسند بنانا تھا: یعنی اسلام پسند۔ خاموش کئے جاتے، جیلوں میں بھیجے جانے، یا بلکہ سیکولر مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھوں تشدد کئے جانے سے، اسلام پسند جماعتیں زیادہ ناراض، انتقامی اور اطوبیائی بن گئیں۔ بعد میں اُن میں سے کچھ لوگوں نے ایک پُرتشدد، مذہب پر مبنی انقلاب کی اُمید باندھی، اور اس طرح مسلح جہاد کی طرف رجوع کرلیا۔

دوسرے لفظوں میں، اسلام پسندوں کی انتہا پسندی، جزوی طور پر اُن کے سیاسی تناظر کی پیداوار تھی۔ لیکن جزوی طور پر اصول کی بات بھی تھی، کیونکہ بہت سے اسلام پسند جمہوریت کو اصول کی بنیاد پر ردّ کرتے تھے۔ وہ سادہ طریقے سے ''لوگوں کے اقتدارِ اعلیٰ'' اور ''خُدا کے اقتدارِ اعلیٰ کے درمیان ایک ناقابلِ حل تصادم پاتے تھے۔ لہٰذا اُن میں سے بہت سے لوگ جمہوریت کی بطور ایک ''کافرانہ'' فلسفے کے مذمت کرتے تھے۔ جو فانی انسانوں کے خیالات کو قادرِ مطلق اللہ کے احکامات سے برتر سمجھتا ہے۔

تاہم، جہاں یہ جمہوریت کی مذمت، آج بھی کچھ متشدد اسلام پسندوں کے ہاں ابھی تک زندہ ہے، وہیں پر کچھ دوسروں نے اس تصور میں اواخر ۱۹۸۰ کی دہائی کے بعد سے سرگرم ہونا شروع کیا۔ اوّل کچھ اسلامی مفکرین نے اس بات پر غور کیا کہ ''لوگوں کا اقتدارِ اعلیٰ'' اور ''خُدا کا اقتدارِ اعلیٰ'' لازمی طور پر ایک دوسرے سے متصادم تصورات نہیں ہیں...... آخر، خُدا نے، انسان کو زمین پر کچھ ''اختیار'' دیا ہے، اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مشاورت کا حکم دیا ہے۔ دوم، شرقِ اوسط میں زیادہ تر جماعتوں نے یہ محسوس کیا کہ جمہوریت آخر کار ان کے اپنے فائدے کیلئے کام کرسکتی ہے: اُن کی پارسائی اور اُن کے خیراتی کام اُن کے شخصی تصور کو بڑھا رہے تھے اور عرب معاشروں میں اُن کی مقبولیت میں اضافہ کر رہے تھے، جو چیز آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کی صورت میں اُنہیں بڑا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

یہ مختصر کہانی بتاتی ہے کہ کیوں بڑے دھارے کی اسلام پسند جماعتوں، جیسا کہ مصر میں اخوان المسلمون، اور تیونس میں النہضہ نے، عرب بہار کے جلو میں جمہوریت سے صلح کرلی تھی، اس طرح، وہ رضاکارانہ طور پر اُس انقلابی لہر میں شامل ہوگئے، جب عوام نے اپنے آمروں کے

MashalBooks.org

خلاف ریلیاں نکالیں......زین العابدین بن علی کے خلاف تیونس میں اور حُسنی مبارک کے خلاف مصر میں، جب ان آمروں کا زوال ہوا تو انہی اسلام پسند جماعتوں نے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کی آواز اُٹھا کر جمہوریت کی مدد جاری رکھی۔ یہاں تک کہ زیادہ کٹر سلفی بھی......اُن دلیل مخالف اور حد سے زیادہ لفظ پرست حنبلوں کے، جن کا میں نے چوتھے باب میں ذکر کیا، مذہبی چشم و چراغ تھے......جمہوری عمل میں حصہ لینے پر رضامند ثابت ہوئے۔

اس سب نے اس بات کی نشاندہی کی، کہ جمہوریت بطور سیاسی نظام کی طرف اسلام پرستوں کا رویہ ڈرامائی طور پر مذمت سے وکالت کی طرف تبدیل ہو چکا تھا۔ جیسا کہ ایک مغربی عالم نے، عرب بہار پر ۲۰۱۱ میں لکھی جانے والی کتاب میں یہ رائے دی:

> ''جہاں'' کبھی اسلام پسند گروہ انقلاب کا خواب دیکھا کرتے تھے، خاموشی سے نیم عسکری سیل بنایا کرتے تھے، اور اپنے سیکولر مخالفین کو قتل کیا کرتے تھے، وہیں آج اسلام پسندوں کے بڑے دھارے کے گروپ، جن میں سے زیادہ تر مصر کی خوان المسلمون سے تعلق رکھتے ہیں، انتخابات کو معاشرے کیلئے اس کے اخلاق، یعنی اُن طور طریقوں کو جو اچھے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہیں، کو برقرار رکھنے کے ایک طریقے کے طور پر دیکھتے ہیں۔''(۱)

تاہم اس میں ایک چھپی ہوئی چال تھی، جمہوریت کی پذیرائی سے مراد لازمی طور پر آزادی پسندی کی پذیرائی نہ تھی۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس تھا، اسلام پسندوں کے سیاسی ادراک میں ابھی تک وہ غیر آزادی پسندی مختلف عناصر شامل تھے، جو اسلامی قانون کی اپنی کی تشریح یا شریعہ میں جزوی طور پر اپنی جڑیں رکھتے تھے۔ زیادہ تر خوف کھائی جانے والی مثالیں، الکوحل یا ''بے حیائی'' پر پابندیوں والی پارسائی کا نفاذ، عورتوں اور غیر مسلم اقلیتوں کی تذلیل، اور توہینِ مذہب اور ارتداد کی سزائیں تھیں۔

اس میں کوئی حیرت نہیں کہ، تمام بعد انقلابی عرب ریاستوں میں، جلد ہی اسلام پسندوں اور ''آزادی پسندوں'' کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مثال کے طور پر، مصر میں موخر الذکر گروہ نے پہلے پہل برتر از آئین اصول'' وضع کرنے پر زور دیا۔ اسلام پسندوں کے غلبے والی منتخب اسمبلی کے آئین کا مسودہ تیار کرنے سے پہلے۔ یہ اصول بنیادی آزادیوں، انسانی حقوق اور ''شہری

ریاست'' (مذہبی ریاست کی ضد کے طور پر) کو قائم رکھیں گے۔ دوسری طرف اسلام پسندوں نے ''لوگوں کی مرضی'' کے اوپر کسی قسم کے سیاسی اصول وضع کرنے کو مسترد کر دیا، جن لوگوں کی مرضی کی، اکثریتی مفہوم میں وہ نمائندگی کرنے پر خوش تھے۔

اسلام پسندوں، بشمول محمد مُرسی کے، جو کہ اخوان المسلمون کے ایک سابق رُکن تھے، جو جون ۲۰۱۲ میں بطور صدر منتخب ہوئے، منتخب ہو کر حکومت میں آنے کے ساتھ ہی مصر میں یہ سیاسی کشیدگی عروج کو پہنچنے لگی۔ تاہم، ایک سال میں مُرسی کی حکومت نے، نہ صرف قدیم آمرانہ حکومت کی باقیات کو، بلکہ آزادی پسندوں کو اور چند فریب سے آزادہ شدہ حامیوں کو بھی مایوس کر دیا، لہٰذا ۲۰۱۳ جون کے اواخر میں موخر الذکر نے، منتخب صدر کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج شروع کئے، جنہوں نے ۳ جولائی کی رات کو اس کے خلاف فوجی بغاوت کی راہ ہموار کر دی۔ مُرسی کے حامیوں کیلئے جن میں سے بہت سے اخوان المسلمون کے ارکان تھے، صدر ''منتخب'' تھا، لہٰذا اُس کے اقتدار کو ''جمہوری'' سمجھا جانا چاہیے۔ بہت سے آزادی پسندوں کیلئے، محض منتخب ہونا جواز کے مترادف نہیں ہے، کیونکہ اُنہیں فکر تھی، صحیح یا غلط طور پر کہ مُرسی کا اقتدار اُن کی بعض آزادیوں کیلئے خطرہ ہوگا۔

میں نے، مصر میں اس مخصوص کشیدگی پر، جو ابھی تک جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، مُرسی کے حامی احتجاج کاروں کے خلاف پریشان کُن پرتشدد فوجی اقدامات کے ساتھ بڑھ رہی ہے، آزادی پسندوں کی تشویشوں کو سمجھ لیا ہے، لیکن پھر بھی میں فوجی بغاوت کی مذمت کرتا ہوں۔ فوج کی طرف سے ایک منتخب رہنما کو باہر نکالنے، نے نہ صرف مصر کے جمہوری ارتقا کو درہم برہم کر دیا، بلکہ اخوان المسلمون کو ایک زیادہ رجعت پسندانہ موقف کی طرف دھکیل دیا (۳) درحقیقت اس بغاوت نے اُن کے اور دوسرے اسلام پسندوں کیلئے یہ نتیجہ نکالنا بہت آسان بنا دیا ہے: ''جمہوریت ہمارے لئے نہیں ہے'' (۴) لہٰذا، میں نے یہ استدلال کیا کہ صدر محمد مُرسی کو اُس چار سالہ مدّت کیلئے، جس کیلئے وہ منتخب ہوا تھا، مصر میں حکومت کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے تھی اور پھر اس کے مخالفین ووٹ کی صندوقچی پر اُس کے ساتھ نمٹتے۔ (۵)

تاہم آزادی پسندں کی تشاویش ...... کہ منتخب اسلام پسند آزادیوں کو دبا سکتے ہیں ...... غیر اہم نہ تھیں لہٰذا اُن پر قریبی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

MashalBooks.org

''جمہوری آمریت'' کا خطرہ

یہاں بحث کیا جانے والا مسئلہ، درحقیقت، عرب یا مسلم دُنیا کا منفرد مسئلہ نہیں ہے یہ زیادہ تر نئی جمہوریتوں کا مسئلہ ہے۔ جمہوری عمل آزادانہ اور منصفانہ انتخابات سے شروع ہوتا ہے، لیکن ان انتخابات کو جیتنے والے سیاسی طاقت کو آمرانہ طریقوں سے استعمال کرنے کا رُجحان رکھتے ہیں، جیسا کہ حزبِ اختلاف کو دبانا یا ناقدین کو خاموش کرانا، مشرقی یورپ میں بعداز کمیونسٹ ریاستوں میں سے بہت سی، غیر آزادی پسندانہ جمہوریت کے ایسے مراحل سے گزر چکی ہیں، روس، ولادی میر پیوٹن کی منتخب مطلق العنانیت کے تحت اس کی معراج کی مثال ہے۔

انتخابات جیتنے والے اسلام پسندوں کی طرف سے پیدا کردہ بعض پریشانیاں، سیاسی طاقت کی ایسی ہی سادہ اور مخصوص حرکیات سے اُبھرتی ہیں۔ سیاسی اسلام کے ایک ماہر اولیویر رائے (Olivier Roy) ہمیں یہ یاددہانی کرواکے کہ جب محمد مُرسی کی، نومبر ۲۰۱۲ میں تحریر چوک میں اپنے اختیارات کو ضرورت سے زیادہ توسیع دینے پر مذمت کی گئی، تو آزادی پسندوں کی طرف سے اُس کی مذّمت ''نیا حُسنی مبارک'' کہہ کر کی گئی نہ کہ ''نیا خمینی'' کہہ کر،......اس باریک نکتے کو نمایاں کرتے۔(٦) دوسرے لفظوں میں، مُرسی کسی مخصوص اسلام پسندی نظریے کی نہیں، بلکہ مصر کی طویل عرصے کی آمرانہ روایات کی عکاسی کررہا تھا۔

یہ بات ترکی کے معاملے میں بھی صحیح ہے، جہاں بعد اسلام پسندی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اے کے پی) کے ساتھ مصیبت ......جس کے منتخب لیکن بڑھتے ہوئے آمرانہ اقتدار نے، مئی کے اواخر اور جون ۲۰۱۳ میں بڑے پیمانے پر حکومت مخالف مظاہروں کی چنگاری بھڑکائی...... قدیم سیکولر انتظامیہ کی کچھ عادات کو اپنانے سے پیدا ہوئی......جیسا کہ اقربا پروری، تصادم، سیاسی خبط اور گھمنڈ(۷) جیسا کہ لارڈ ایکٹن نے عقلمندانہ طور پر رائے دی کہ ''طاقت گمراہ کرتی ہے'' اور یہ بلالحاظ نظریے اور مذہب کے گمراہ کرتی ہے۔

لیکن، ان آفاقی مسائل پر توجہ کرنے کے بعد بھی، اسلام پسندوں کے پاس، آزادی پسندوں کے اندر غیر آزادی پسندانہ جمہوریت کے بارے میں تشاویش اُبھارنے کی ایک مخصوص وجہ موجود ہے: معاشرے پر اسلامی معیارات کو نافذ کرنے کیلئے آمادگی۔ ترکی سیاسی سائنسدان احسان ڈاگی

(Ihsan Dagi) جو کہ اپنے اعلان کے مطابق کلاسیکی آزادی پسند ہیں، اس مسئلے کی تعریف ''جمہوری اسلام پسندوں کی پس جدیدیت آمریت'' کے طور پر کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ ہیں:

> ''یہ ایک ایسی اسلام پسندی ہے جس کا جواز ''متن'' کے حوالے سے نہیں، بلکہ لوگوں اور اُن کی خواہش کے حوالے سے ہے عرب بہار والے شرقِ اوسط کے نتیجے میں ایسی اسلام پسندی ''جمہوری اور نیا بتی ہے''، لیکن مواد اور نتیجے کے لحاظ سے آمرانہ ہے۔''(۸)

ڈاگی اس ''جمہوری'' اسلام پسندی کو اس لئے آمرانہ پاتے ہیں کیونکہ یہ ''اپنے اخلاقیات، طرزِ زندگی، اور نظام اقدار کے انتخاب کو نافذ کرنے کیلئے، ریاستی مشینری کو استعمال کرنے'' اور ''اسلام کے ضابطے کو زندگی کے واحد جائز طریقے کے طور پر'' روبہ عمل لانے کیلئے، آمادہ ہیں۔(۹)

اس خطرے کے پیشِ نظر، رجائیت پسند مشاہدے کا جمہوریت کے اعتدال پر پُراثر یقین رکھتے ہیں، اور وہ زیادہ تر ایسا کرنے میں صحیح ہیں، ووٹ حاصل کرنے کی خواہش آخرکار اسلام پسند جماعتوں کو، اُن معاشرتی گروہوں کی تشویشوں کے حق میں زیادہ ہمدرد بنادے گی۔ جو اُن کے نظریاتی دائرے سے باہر ہیں، ترکی میں اس حرکیت نے، جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کو مرکزی دائیں بازو کی طرف دھکیل کر عمدہ طریقے سے کام کیا ہے، اور یہ مصر میں بھی عمدہ طریقے سے کام کرسکتی ہے۔ مثال کے طور پر، اخوان المسلمون، نے اقتدار میں آنے کے بعد یہ محسوس کیا۔ الکوحل پر قومی سطح پر پابندی، اہم ترین سیاحت کی صنعت کو نقصان پہنچائے گی......ایک ایسا مسئلہ جس پر اُنہوں نے، اقتدار میں آنے سے پہلے، کبھی غور نہیں کیا تھا (یا غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی)(۱۰)

تاہم، تجربیت ہی، فطری طور پر دُنیا کے ایک غیر آزادی پسندانہ تصور میں سے آزادی پسندی کو پروان چڑھانے کیلئے کافی نہیں ہے۔ یہ بات خاص طور پر مسلمان شرقِ اوسط کے بارے میں صحیح ہے، جس میں، آبادی کی اکثریت ''اعتدال پسند لیکن غیر آزادی پسند'' ہے......وہ سیاسی تشدد کو ردّ کرتے ہیں، لیکن سیاسی، سماجی اور شہری آزادیوں کے بارے میں متشکک بھی ہیں۔(۱۱) لہٰذا اگر موجودہ رُجحانات جاری رہے، تو ممکن ہے کہ غیر آزادی پسندانہ جمہوریت، مسلم شرقِ اوسط

MashalBooks.org

میں ایک معیار بن جائے۔ آمریت پسند اسلام پسند، جمہوری طور پر غالب آسکتے ہیں، جبکہ آزادی پسند، انفرادی آزادی کے مدافعین، ایک شکست خوردہ اقلیت ثابت ہوسکتے ہیں۔

لیکن ''اسلامی آزادی پسندی'' کے عروج میں ...... ایک ایسا تصور، جو اسلامی عقیدے اور سیاسی آزادی پسندی میں امتزاج پیدا کردے گا، اور اس طرح موخرالذکر کو مسلمان معاشروں، بلکہ کچھ اسلام پسندوں میں بھی زیادہ قابلِ قبول بنادے گا ...... ایک خوش قسمت پیشرفت بھی ہوسکتی ہے۔

اسلامی آزادی پسندی کا مقدمہ

خوش قسمتی سے، شرقِ اوسط میں پہلے ہی ایسے رائے ساز رہنما موجود ہیں، جو اسلامی آزادی پسندی کو قبول کرنے کی طرف مائل محسوس ہوتے ہیں۔ غالباً اُن سب میں سے زیادہ نمایاں راشدالغنوشی ہیں، جو کہ تیونس میں الھندہ جماعت کے بانی اور ''فکری رہنما'' ہیں۔ غنوشی ''آزادی'' پر ''اسلام کی بنیاد'' کی حیثیت سے زور دینے کیلئے مشہور ہیں، جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام سے ارتداد کو جُرم نہیں سمجھا جاسکتا، اور یہ کہ عورتوں اور غیر مسلموں کو مسلمان مردوں کے برابر حقوق حاصل ہونے چاہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان نظریات کا دفاع، عرب بہار کے آغاز سے ایک دہائی سے بھی زیادہ پہلے سے، ۱۹۹۰ کی دہائی کے اواخر میں، کررہے تھے۔ (۱۲) یہ اُن اسباب میں سے ایک ہے کہ کیوں النہد ہ، تمام عرب اسلام پسند جماعتوں میں سے سب سے زیادہ آزادی پسندی کی طرف رُجحان رکھنے والی ثابت ہوئی ہے......اور تیونس پوری عرب بہار میں سے سب سے زیادہ اُبھرتا ہوا معاملہ محسوس ہوتا ہے۔ (سب سے زیادہ ہیجان خیز معاملہ، شام، ابھی بشارالاسد کے بے رحمانہ جبر اور اُس کے متنوع مخالفین کے درمیان خونی خانہ جنگی کے عین وسط میں تھا، جب میں یہ الفاظ تحریر کررہا تھا)۔

دوسری طرف، مسلم معاشروں میں سماجی تبدیلی آزادی پسندانہ خیالات کے نشوونما پانے کیلئے زمین ہموار کررہی ہے، جیسا کہ میں نے باب ہشتم میں، ترکی کو ایک مطالعے کی مثال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، وضاحت کی تھی۔ یہاں تک کہ سعودی عرب میں، جو کہ اسلام کی سب سے زیادہ جابرانہ تعبیر کا مرکز ہے، ''انٹرنیٹ تک آسان رسائی اور سمندر پار تعلیم حاصل کرنے کے

دوران دوسری ثقافتوں سے میل جول'' کی مہربانی سے، ایک آزادی پسندی کی طرف رُجحان رکھنے والی نسل اُبھر رہی ہے۔ (۱۳) اس کی ایک مثال ''آزادیوں اور تنوع کی اخلاقیات کی ضمانت کے بارے میں سعودی نوجوانوں کا بیان'' ہے، جو کہ ایک ایسا منشور ہے جو مارچ ۲۰۱۱ میں آن لائن لگایا گیا اور جس کی تائید ہزاروں دستخط کنندگان نے کی، ملک میں ''مذہبی پولیس'' کی جرأت مندانہ مخالفت میں، دستخط کنندگان نے اعلان کیا:

> ''اسلامی قانون کے نام پر سچائی یا پارسائی پر اجارہ کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا......ہم اس پدری سرپرستی کو، جو ہمیں سوچنے اور اپنے لئے خود تحقیق کرنے کے خدا کی طرف سے عطا کردہ حق کو استعمال کرنے سے روکتی ہے مسترد کرتے ہیں، کیونکہ ہم سُن سکتے اور فیصلہ کرسکتے ہیں۔'' (۱۴)

جیسا کہ ایک مغربی صحافی نے رائے دی، یہ نوجوان سعودی سیکولر نہیں تھے، لیکن وہ ''ایک ایسے مذہبی معمول کے حق میں تھے جو زیادہ رضاکارانہ ہو، ریاست کی طرف سے کم لاگو کیا گیا ہو، اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنے والا ہو۔'' بہرحال، اُنھوں نے ''آزادی اور انسانی حقوق'' کو تسلیم کرلیا تھا اور ''وہ چاہتے تھے کہ یہ تصورات اسلامی فکر سے منسلک ہوں'' (۱۵)

یہ منسلک کرنا ہی وہ چیز ہے، جس کیلئے ''انتہا پسندی کے بغیر اسلام'' (Islam Without Extremes) کا کلی مقصد ہے......اور اس کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہوئے، یہ ہیں اسلامی آزادی پسندی کے وہ تین ستون، جو یہ پیشِ کرتی ہے۔

ا۔ عقلیت پسندی

جیسا کہ ابتدائی ابواب میں خلاصہ پیش کیا گیا، کہ اوائلِ اسلام میں دلیل کے وابستگان اور اندھی اطاعت کے حامیوں کے درمیان ایک عظیم ''نظریاتی جنگ تھی۔ موخرالذکر گروہ، جس کی بہترین نمائندگی آج سلفی کرتے ہیں، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مذہبی متون کی، بغیر کسی اعتراض یا نظرثانی کے لفظی اطاعت کی جانی چاہیے۔ دوسری طرف دلیل پرست گروہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے، کہ مذہبی متون ایک مخصوص تاریخی اور زمینی سیاسی تناظر میں ظہور میں آئے، اور اس

MashalBooks.org

بات پر نگاہ رکھتا ہے کہ جدید دُنیا کا انقلابی نیا تناظر، بڑی حد تک تعبیرِ نو کا تقاضا کرتا ہے۔

مثال کے طور پر، بلا سوچے سمجھے الفاظ کی پیروی کرنے والے اسلام سے مرتد ہونے والوں کو قتل کر دیں گے، اس حدیث کی بنیاد پر جو کہتی ہے، ''اگر کوئی شخص اپنے مذہب کو ترک کرتا ہے، تو اسے قتل کر دو''۔ تاہم، دلیل پرست، سب سے پہلے پیغمبر محمدؐ کی طرف منسوب کئے جانے والے اس قول کی سند پر سوال اُٹھائیں گے۔ پھر وہ یہ دلیل بھی دیں گے کہ، زیادہ غالب امکان یہ ہے، کہ یہ حکم جنگ کے تناظر سے مربوط ہوا ابتدائی مسلم معاشرے میں ''آدمی کا اپنے مذہب کو ترک کرنا'' جنگ میں دشمن کے ساتھ شامل ہوتے ہوئے، وفاداریاں تبدیل کرنے پر بھی دلالت کرتا تھا، ایک ایسا عمل جسے ہم آج ''غداری'' کہتے ہیں۔ تاہم آج کل کی دنیا میں مذہب کی تبدیلی محض ایک ترغیب کا معاملہ ہے، اور اسی طرح اس کا احترام کیا جانا چاہیے۔

اگر اسلامی قانون کو آزادی اور حقوق انسانی کے آفاقی تصورات سے ہم آہنگ ہونا ہے، تو ایسی نئی تعبیرات ایک لازمہ ہیں۔ اور اس نئی تعبیر کا راستہ صرف اُس وقت کھلے گا، جب عقل کو، ایک خُدا کی عطا کردہ صلاحیت کے طور پر، ابتدائی اسلامی فقہہ میں اس کا زیادہ نمایاں مقام بحال کیا جائے گا۔

۲۔ تکثیریت

تاہم، تمام مسلمان، دلیل پرست نہیں بنیں گے۔ نہ ہی وہ اُن تمام متنوع تعبیرات پر متفق ہوں گے جنہیں عقل مہیا کر سکتی ہے۔ لہٰذا، اُنہیں جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ تمام ساتھی مسلمانوں کو ''صحیح اسلام'' پر متفق ہونے پر مجبور کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مذہب کے مختلف متون کے مطابق، زندگی بسر کرنے، اور زندگی بسر کرنے دینے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ابتدائی اسلام کے ''مُرجیئن'' کی طرح، جن کا ذکر باب سوم میں کیا گیا ہے، جس چیز کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ وہ حتمی فیصلوں کو اُخروی زندگی پر ''ملتوی'' کرنا ہے، تا کہ اُن کا فیصلہ خُدا کی طرف سے کیا جائے، جبکہ اس زندگی میں اسلام کی اُن تعبیرات کی پیروی کرنا ہے، جو انہیں سب سے بہتر مطمئن کریں۔

الغرض، مسلمانوں کو اپنے مذہب کے اندر زیادہ تکثیریت کی ضرورت ہے۔ یہ چیز نہ صرف مختلف فرقوں، جیسا کہ سُنی بمقابلہ شیعہ، کشیدگیوں کو ختم کرے گی، بلکہ یہ مذہبی آمریت کی بنیاد کو بھی

کمزور کرے گی۔ بہر حال، اگر کوئی شخص غیر متنازعہ طور پر یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ''صحیح اسلام کیا ہے''، تو پھر کوئی بھی اپنے ساتھی مسلمانوں پر اپنا حکم نہیں چلا سکتا۔ کوئی بھی ''مذہبی پولیس'' مجھ پر وہ کچھ لاگو نہیں کر سکتی جسے وہ اسلامی سمجھتی ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے میرا ''اسلام کیا ہے'' کا نظریہ بالکل مختلف ہو،

اس تکثیریت کو تسلیم کرنا، نا صرف تمام ''اسلامی ریاستوں'' کو غیر مقدس بنا دے گا، کیونکہ یہ یہ ثابت کر دے گا کہ ایسی ریاستیں صرف اسلام کے اُس متن کو قائم کرتی ہیں، جنہیں وہ ترجیح دیتی ہیں......اور اکثر اوقات ایسا اُن کے اپنی ذاتی رائے کو احترام دینے کیلئے ہوتا ہے بجائے اسلام کے۔ اور کیونکہ کوئی ریاست بھی حق کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی، لہٰذا بہترین سیاسی نمونہ، ایک سکولر (یا ''شہری'') حکومت ہوگا، جس کے تحت اسلام کی مختلف تعبیرات، اور دوسرے مذاہب کی تعبیرات، ساتھ ساتھ زندہ رہ سکیں۔

۳۔ خُدا پرستی

اسلامی آزادی پسندی کا تیسرا ستون، عام فہم، منطق اور سادہ مشاہدے سے وجود میں آتا ہے: مذہب کا زبردستی نفاذ لوگوں کو مذہبی نہیں بناتا۔ بلکہ، یہ اُنہیں یا تو منافق بنا دیتا ہے، یا بالکل ہی مذہب مخالف بنا دیتا ہے۔ لہٰذا حقیقی مذہب پرستی، جو کسی شخص کی خدا پر یقین ہے اور اُس کی عبادت کرنے پر آمادگی سے پیدا ہوتی ہے۔ صرف غیر جابرانہ ذرائع سے پروان چڑھ سکتی ہے اور پروان چڑھنی چاہیے، جیسا کہ تبلیغ سے شراکت سے، اور مثال پیش کرنے سے۔ ایسے طریقوں سے اسلام کو موثر طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے کبھی جبری طور پر نافذ نہیں کیا جانا چاہیے۔

جدید اسلام پسندانہ تحریک نے اکثر اوقات اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کیا، کیونکہ اس نے ''اسلامی نظام قائم کرنے'' پر اپنی توجہ مرکوز کی ...... جو کہ ایک خالصتاً سیاسی نصب العین ہے...... بجائے مسلمانوں کی روحوں کو بچانے کے۔ بلاشبہ ایسی اسلامی تحاریک، جنہوں نے اپنی توجہ موخر الذکر پر توجہ مرکوز کی ...... جیسا کہ صوفی سلسلوں یا ترکی میں سید نورسی اور فتح گولن جیسی تحریکوں ...... نے اکثر اوقات اپنے آپ کو اسلام پسندوں سے دور رکھا۔ آج، تاریخی تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سیاست پر مرتکز اسلام پسند غلط تھے، اور عقیدے پر مرتکز مسلمان درست تھے۔ اوّل الذکر نے

MashalBooks.org

صرف تشدد، کشیدگی، آمریت، اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا کی۔ موخرالذکر نے جدید مدارس، خیراتی ادارے، کھانے کے لنگر، اور اسلام کیلئے ہمدردی پیدا کی۔

وہ مسلمان جو خُدا پرستی کو تحفظ دینے کیلئے آمرانہ اقدامات کو استعمال کرنے پر اصرار کرتے ہیں...... جیسا کہ الکوحل کے مشروبات پر اور ملحدانہ کتب پر پابندی کو یہ بھی ادراک کرنا چاہیے کہ اگرچہ ایسے اقدامات نے مسلمان معاشروں کو صدیوں پاک رکھا، لیکن اب دور ڈرامائی طور پر تبدیلی ہو چکا ہے۔ دُنیا ناگزیر طور پر زیادہ وسیع الذہن، شفاف، انفرادیت پسند اور واضح طور پر عالمی بن گئی ہے۔ جس چیز پر پابندی لگائی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح مہیا ہو جائے گی، صرف یہ کہ وہ زیادہ دلکش اور زیادہ دلفریب ہو جائے گی...... اسی دوران میں غیر متبدل احکامات، صرف آمر کو کُھردرا، کمزور اور ظالم ثابت کریں گے، اس طرح مذہب کے اُسی تصور پر ہی دھبہ بن جائیں گے مفروضہ طور پر جس پُشت پناہی کی جا رہی تھی۔

اسلامی آزادی پسندی ایک ایسا تصور ہے، کہ اگر وہ ایسے قضیوں پر مبنی ہو، تو وہ مسلم معاشروں میں انفرادی آزادی کا دفاع کرے گا اسلام کی قیمت پر نہیں، جیسا کہ شرقِ اوسط میں سیکولر پسندوں نے اکثر کیا ہے، بلکہ اسلام کی خاطر (ساتھ ہی ساتھ دوسری ترغیبات کی خاطر) اس کی جڑیں قرآن میں، اسلام کے کچھ ابتدائی مکاتبِ فکر میں، سلطنتِ عثمانیہ کے آواخر میں، اُنیسویں صدی کے عرب اصلاح پسندوں میں، اور آج کل کی اسلامی دُنیا میں مختلف آزادی پسندی کی تحریکوں میں ہیں۔

یقیناً یہ ابھی ایک نادر اور کمزور تصور ہے۔ لیکن یہ اُمید افزا ہے، اور اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے...... کیونکہ جیسا کہ لیونارڈ بائنڈر (Leonard Binder) جو کہ ایک بہت عالم و فاضل شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر توجہ مرکوز کی ہے، نے ۱۹۸۸ میں لکھا، ''ایک توانا اسلامی آزادی پسندی کے بغیر، سیاسی آزادی پسندی شرقِ اوسط میں کامیاب نہیں ہوگی'' (۱۶) اور سیاسی آزادی پسندی کی ایک مضبوط لہر کے بغیر، محض جمہوریت سازی، اس علاقے کے آزادی کی شدید کمی پر قابو پانے میں مدد نہیں کر سکتی۔

استنبول

جولائی ۲۰۱۳

اظہارِ تشکر

بہت سے افراد ہیں، جن کا مجھے، اس کتاب کو ممکن بنانے کیلئے شکریہ ادا کرنا ہے...... اور اُن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

پہلے پہل، میں فلپ ای جانسن (Philip E. Johnson) کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے کئی سال پہلے، امریکہ میں اسلام کے بارے میں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی، باوجود خود کئی ہزار میل دور رہنے کے۔ میں جے رچرڈ (Jay Richards) اور کلیئر برلنسکی (Claire Berlinski) کا بھی، پہلے قدم اُٹھانے میں مدد کرنے پر شکریہ ادا کرتا ہوں، اور والٹر رسل میڈ (Walter Russell Mead) کا کچھ نئے قدموں کا راستے کھولنے کیلئے۔ میں ساتھی مصنف مارک سکیل کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کی مہربان دوستی نے نہ صرف میری تحریر کو بہتر بنایا بلکہ میرے جذبے کو بھی زرخیز بنایا۔

میں اپنے ایجنٹ جیف گرک (Jeff Gerecke) کا بھی اس کی مدد کیلئے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ میلینی ٹورٹورولی (Melanie Tortoroli) اور کیتھی برینڈیز (Kathy Brandes) کا، ڈبلیو ڈبلیو نورٹن (W. W. Norton) میں میرے ایڈیٹروں کے طور پر زبردست نام کرنے کیلئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُنہوں نے نہ صرف میری زبان کو جو اتنی زیادہ اہلِ زبان والی نہ تھی، کی تصحیح کی، بلکہ بہت سی تجاویز دیں اور تنقیدیں کیں، جنہوں نے میری کتاب کو بہت زیادہ دلکش اور واضح بنایا۔ میں نوری طناکا، استنبول میں ایسا لائبریری (Isam) میں میری تحقیق میں مدد کیلئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

MashalBooks.org

میں، بروس چیپ مین (Bruce Chapman)، اسکندر اوکسوز (Iskender Oksuz)، فواد اینڈک (Fuat Andic) لینڈا ویکٹ سٹون (Linda Whetstone) مورگن سنکلیئر (Morgan Sinclair) ایلپر بلگیلی (Alper Bilgili) احمد کورو (Ahmad Kuru) اور بلال سامبور (Bilal Sambur) کا بھی شکرگزار ہوں، جنہوں نے پروف کو پڑھنے کا وقت نکالا اور بہت مفید آرا دیں بعض خیالات اُبھارے بلکہ اُن کا اظہار کرنے میں بھی میری مدد کی، خاص طور پر انمول تھی۔ ایسے ہی میری مہربان ماں ٹولین اکیول کی جذباتی مدد تھی، میرے نوجوان بھائی، ارٹوگرول Ertugrul اور انتہائی اہم میری پیاری بیوی ریاضہ (Riada) کی جو کہ میری زندگی کی روشنی ہے۔

آخری بات کہ، بلند ترین تعریفِ خدائے مطلق کی ہونی چاہیے، جس سے، میرا عقیدہ ہے، کہ ہماری تمام صلاحیتیں آتی ہیں، جیسا کہ ہم اسلامی روایت میں کہتے ہیں: یہ ہم ہیں جو اپنی کوشش دکھاتے ہیں، اور یہ وہ ہے جو کامیابی عطا کرتا ہے۔

مصطفیٰ اکیول

استنبول، جون ۲۰۱۳

MashalBooks.org